

# فاطمہ، فاطمہ

مصنف

ڈاکٹر علی شریعتی

مترجم

پروفیسر سردار نقوی



## فہرست مضامین

۱۲۸	ستم گرد و ستم پذیر	۴	پیش لفظ
۱۲۲	فریادِ استعمار	۷	آغازِ سخن
	حصہ دوم	۳۰	تقصیر کس کی ہے؟
۱۵۱	فاطمہؑ	۲۰۹	مسائل کا تجزیہ، اصل خامی کہاں ہے؟
۱۷۳	شعب ابی طالبؑ کا کردار	۵۴	مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟
۱۸۹	ہجرت	۶۹	مثالیّت / حقیقت پسندی
۱۹۱	عقدِ فاطمہؑ	۹۰	تعمیرِ شخصیت کے دو قالب
۲۰۲	شفاعت	۹۲	مغربی عورت حقیقت اور غلط فہمی
۲۲۹	رہلتِ پیغمبرؐ	۱۱۲	تنہائی
۲۴۷	اسلامی رہلتِ پیغمبرؐ	۱۱۵	خاندان کی تشکیل
۲۶۱	مگر فاطمہؑ		سرمایہ دارانہ معاشرہ میں عورت کی
۲۶۶	سنگین صورتِ حال	۱۱۹	حقیقتِ جنسیت بجائے عشق
۲۸۰	رہلتِ فاطمہؑ	۱۲۲	مشرق کا معاشرہ اور عورت
			مشرقی معاشروں میں عورت کی
	☆☆☆	۱۲۶	تبدیلی کا کردار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## پیشہ لفظ

”فاطمہ فاطمہ است“ ڈاکٹر علی شریعتی کی تصنیف ہے اور ان کی تمام تخلیقات میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہے ڈاکٹر شریعتی وہ عظیم دانشور ہیں جنہیں ایک انقلابی اور عہد ساز مفکر کے طور پر جانا جاتا ہے انہوں نے عہد ہدید میں اسی عہد کے لب و لہجہ میں اسلام کی فکری بنیادوں کی تشریح کی ہے اور اس انداز سے تشریح کی ہے کہ اسلام کی عمل انگیزی کی صلاحیت اور انقلابی قوت کو ایک زندہ اور متحرک حقیقت بنا دیا ہے ایک ایسی حقیقت جو عوام کے مکر و شعور کو زندہ و بیدار کر کے انہیں جوش جہاد و جذبہ عشق اور تمنائے شہادت سے سرشار کر دیتی ہے۔

اور ڈاکٹر شریعتی نے اس کتاب میں جناب فاطمہ کے بارے میں پروفیسر لونی ماسیون (LOUIS MASSIGNON) کے اس عظیم تحقیقی کام سے استفادہ کیا ہے جس سے تعلق اور استفادہ پر خود ڈاکٹر شریعتی کو فخر ہے پروفیسر ماسیون ایک عظیم مستشرق تھے اور جناب سیدہ پران کا تحقیقی کام منفرد تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

اس تناظر میں اس کتاب کے ترجمہ کا کام کس قدر دشوار اور آزمائشی کام ہے اس کا اندازہ اہل فکر و نظر خود کر سکتے ہیں جو اہل علم اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے وہ اس کے مضامین کی ندرت، وسعت، تنوع، گیرائی، گہرائی اور نزاکت کے



پیش نظر اس کے ترجمہ کی دشواریوں کا احساس کر سکیں گے کوشش یہ کی گئی ہے کہ کتاب کا ترجمہ اصل فارسی متن سے اس طرح ہم آہنگ ہو کہ اس میں مصنف کا مخصوص و منفرد اسلوب اور آہنگ بھی منعکس ہو سکے اور اردو کے انشاء کے تقاضے بھی مجروح نہ ہوں۔ مترجم نے مصنف کے مضامین اور افکار و خیالات کو بغیر کسی رد و بدل کے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے اس لیے کہ ترجمہ کی دیانت کا یہی تقاضہ تھا۔ البتہ مصنف کے پیش کردہ تاریخی مواد، اسکی تربیت، تجربہ اور نتائج سے مترجم کا سو فیصد متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے موضوع اور مضامین کا تعلق ہے۔ خود کتاب کا نام اس کے مضامین کا اشاریہ ہے، ڈاکٹر شریعتی نے اس کتاب کا نام ”فاطمہ“ فاطمہ است“ رکھا ہے اور یہ نام ان کے تخلیقی اور اختراعی ذہن اور ان کے انقلابی انداز فکر کا آئینہ دار ہے ڈاکٹر شریعتی کا کہنا ہے ”جیسا کہ اس کتاب کے آخری صفحات میں آپ ملاحظہ کریں گے کہ جناب فاطمہ دختر پیغمبر ہیں، ہمسر علی ہیں، مادرِ حسین و زینب ہیں اور بے شک یہ نسبتیں بڑی اہم، مؤثر اور مقدس ہیں لیکن ان کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں جو بڑی روشن اور تابناک ہیں۔ مگر یہ جہتیں ان کی شخصیت کا مکمل احاطہ نہیں کرتیں ان کی تاریخی اور علامتی شخصیت ان نسبتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے مگر ان سے زیادہ ہمہ گیر اور بامعنی ہے بے شک فاطمہ دختر پیغمبر ہیں، ہمسر علی ہیں۔ مادرِ حسین و زینب ہیں۔ فاطمہ یہ سب کچھ ہیں مگر فاطمہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک جملہ میں فاطمہ کا تعارف کرایا جاسکتا ہے تو وہ تعارف یہی ہے کہ ”فاطمہ فاطمہ است“

اسلام نے عورت کا جو تصور پیش کیا ہے۔ جناب فاطمہ کی شخصیت اس تصور کی تجسیم ہے۔ وہ ایک مثالی خاتون ہیں۔ اس مثالہ کی شان یہ ہے کہ دنیا کی کوئی اور عورت اس کی بلندی اور عظمت تک نہیں پہنچ سکتی لیکن دنیا کی ہر

عورت کے لیے یہ مثالیہ ایک قابل تقلید نمونہ ہے، یہ وہ اسوۂ حسنہ ہے جسکی پیروی کے ذریعہ عورت خود اپنی حقیقت کو دریافت کر سکتی ہے۔ اپنی حیثیت مرتبہ اور مقام کا شعور حاصل کر سکتی ہے اور رزم گاہ حیات میں اپنے لئے صحیح راستہ منتخب کر سکتی ہے۔

بے شک جناب فاطمہؑ مثالی بیٹی، مثالی بیوی، اور مثالی ماں ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ 'زن مبارز و مسئول' ہیں۔ وہ اپنی معارف شرقی اجتماعی اور تاریخی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر تھیں اور انہوں نے تاریخ اسلام کے ایک انتہائی نازک اور حساس دور میں اپنی ان عظیم ذمہ داریوں کو اس احتیاط اور اہتمام کے ساتھ پورا کیا کہ ان کا نام تاریخ کے ہر دور میں ظلم سے ترک تعاون اور باطل کے خلاف احتجاج کی علامت بن گیا ہے۔ اس کتاب میں جناب فاطمہؑ کی شخصیت اور سیرت کا مطالعہ اسی وسیع تناظر میں کیا گیا ہے اور مصنف کا مدعا یہ ہے کہ ہم اس عظیم اور تاریخ ساز شخصیت کی معرفت کے ذریعہ اس لازوال اور لامحدود عقیدت کو جو جناب فاطمہؑ کے لیے ہمارے دلوں میں پائی جاتی ہے ایک تعمیری اور انقلابی قوت میں تبدیل کر سکیں کہ یہی اس ہستی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بامعنی طریقہ ہے۔

سردار نقوی

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۶ء



## آغاز سخن

اس مقدس شب میں مجھ جیسے نامقدس شخص کی تقریر پہلے سے طے نہیں تھی بہر حال سب سے پہلے مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ مجھے جناب فاطمہؑ کی زندگی اور آپؑ کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر لونی ماسینوں کے عظیم علمی کام سے ایک گونہ تعلق رہا ہے۔ پروفیسر لونی ماسینوں ایک عظیم انسان اور ایک عظیم اسلام شناس تھے اور جناب فاطمہؑ کی زندگی اور شخصیت پر آپؑ کا تحقیقی کام ایک گراں قدر علمی کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے خصوصاً پروفیسر موصوف نے جناب فاطمہؑ کی عظیم اور متبرک ہستی کے اس رخ کو اجاگر کیا ہے جو آپؑ کی وفات کے بعد تاریخ اسلام پر آپؑ کے زندگی بخش اثرات سے متعلق ہے۔ اس متبرک ہستی کی یاد تاریخ کے ہر دور میں مسلم معاشروں میں عدل کے قیام اور تعصب اور ظلم کے خلاف جدوجہد کی روح کو زندہ رکھنے کی ضمانت ہے اس لحاظ سے جناب فاطمہؑ کی شخصیت اسلام کی حقیقی روح کی علامت ہے اور تاریخ کے طویل ادوار میں جب داخلی اور خارجی عوامل اسلام کی تصویر کو مسخ کرنے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں تو آپؑ کی شخصیت اسلام کی اصلی اور حقیقی تصویر کی نشانی اور علامت کے طور پر ابھرتی ہے میں نے پروفیسر لونی ماسینوں کے اس تحقیقی کام سے بہت

استفادہ کیا ہے اور ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے اس کارِ عظیم میں ایک گونہ حصہ بھی لیا ہے۔ (یا بالخصوص اس تحقیقی کام کے ابتدائی مرحلہ میں جو اسناد اور معلومات کی جمع آوری سے متعلق ہے) اس کام کے لئے جناب فاطمہ کی بابت ان تمام تاریخی حوالوں اور اسناد کو جمع کیا گیا ہے جو چودہ صدیوں کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور جو مسلم ممالک میں بولی جانے والی مختلف زبانوں اور مقامی بولیوں میں تحریر شدہ ہیں۔ تاریخی اسناد اور دستاویزات کے علاوہ لوگ کہاں نہوں اور گیتوں کا بھی مطالعہ کیا گیا تاکہ زیر تحقیق موضوع کے متعلق تمام ممکنہ معلومات و اطلاعات کو جمع کیا جاسکے۔

میں نے یہ سوچا تھا کہ آج کی شب اپنی گفتگو میں پروفیسر لونی ماسینوں کے اس عظیم علمی کام کا تعارف پیش کروں میں نے اس بات کو اس لئے بھی ضروری سمجھا کہ یہ کام ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ جبکہ پروفیسر موصوف اس دارِ فانی سے رحلت کر چکے ہیں اور چونکہ یہ کام ابھی تک شائع نہیں ہو سکا اس لئے یوٹوپ کے وہ صاحبانِ علم جو اسلام اور اس سے متعلق لٹریچر کے مطالعہ سے شغف رکھتے ہیں اس کام سے بے خبر ہیں اور اس کے نتیجہ میں خود ہمارے وہ اہل دانش جو یورپ کے مصنفین کی تحریروں کی وساطت سے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں پروفیسر لونی ماسینوں کے اس تحقیقی کارنامہ سے بہت متعارف نہیں ہو سکے اس پس منظر میں میں نے سوچا کہ میں آج کی شب دعوتِ تقریر کو قبول کر لوں اور حضورؐ اپنے ان طلبہ کے لیے جو حسینہ ارشاد میں ”تاریخ و شناخت ادیان“ ”جامعہ شناسی مذہبی“ اور ”اسلام شناسی“ کے موضوعات پر میرے لیکچرز میں باقاعدہ شریک ہوتے ہیں پروفیسر ماسینوں جیسے عظیم استاد کی تحقیق کے بنیادی نکات اور خطوط اور اس تحقیق کے علمی اور تاریخی مضمرات پر روشنی ڈالوں۔

لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے سامنے جو مجمع ہے اس کی نوعیت کا اس  
 روم کے اجتماع سے مختلف ہے اسی طرح میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ مجمع  
 کسی رسمی وعظ و خطاب میں شریک ہونے والا مجمع بھی نہیں ہے بلکہ وہ محترم  
 خواتین و حضرات جو اس وقت یہاں موجود ہیں وہ علم و دانش کے لحاظ سے ہماری  
 موجودہ نسل کے نمائندہ افراد ہیں یہ سامعین اس لیے جمع نہیں ہوئے کہ وہ جتنا  
 فاطمہ کے ذکر پر گریہ و بکا کریں اور اس کے ذریعے اپنے لیے روحانی ثواب  
 حاصل کریں (ایسا ثواب جو بعد مرگ ان کے کام آئے) اور نہ یہ مجمع کسی تحقیقی موضوع  
 پر خشک علمی اور تادیبی مباحث کو سننے کا خواہش مند ہے اس لیے کہ اس اجتماع  
 کے سامنے ایک اور مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ زندہ اور جدید، فوری اور شدید ہے۔ یہ  
 ایک ایسا سوال ہے کہ جو بہت حساس اور نازک ہے اس لیے اس کا جواب دینا بڑا  
 مشکل ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ مسلمان عورت کو کیسا ہونا چاہیئے

## میں کون ہوں

ہمارے معاشرے میں عورت کی حالت بہت تیزی سے بدل رہی ہے وقت  
 کا جبر اور سماجی اداروں کا جبر اسے اسکی حقیقت سے دور لئے جا رہا ہے اس  
 سے اس کی تمام فطری خصوصیات اور قدیمی اقدار کو چھین کر اسے ایک ایسی  
 ہستی بنائے جا رہا ہے جو ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہے گویا عورت جیسی  
 کردہ ہے، کی بجائے اب ایسی مخلوق نظر آتی ہے، جیسا اسے وقت اور حالات  
 بنانا چاہتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ وقت اور سماجی اداروں کا جبر عورت کو ایک  
 مصنوعی قالب میں ڈھالنے میں بڑی حد تک کامیاب ہے

اس تناظر میں ہر زن آگاہ کے سامنے ہر ایسی عورت کے سامنے جو آگاہی  
 اور شعور رکھتی ہے سب سے اہم اور شدید سوال یہ ہے کہ میں کون ہوں؟ مجھے  
 کیا ہونا چاہیئے۔

ہر خود آگاہ عورت اس بات کا شعور رکھتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر جو اسے ماضی سے ورثے میں ملی ہے قائم نہیں رہ سکتی لیکن وہ محض نقالی کے طور پر اپنے چہرہ پر جدید مغربی عورت کا خول چڑھانے کے لیے بھی تیار نہیں ہے بلکہ اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو خود دریافت کرے اپنے وجود کی تعمیر نو خود کرے اپنے لیے چہرہ کا خود انتخاب کرے اور اس چہرے کو خود آگاہی اور ذمہ داری کے ساتھ اس طرح آراستہ کرے کہ اس میں انسانیت کا حقیقی اور فطری حسن نظر آ سکے لیکن یہ کام کیسے ہو؟ ہمارے دور میں خود آگاہ

عورت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ اس کا حقیقی چہرہ کیسا ہے؟ وہ اسے کیسے دریافت کرے۔ قدیم عورت کا روایتی چہرہ یا جدید عورت کا مصنوعی چہرہ انسانیت کے اس جوہر سے عاری ہے جو عورت کی اصل اور مستقل حیثیت اور فطرت کو نمایاں کرتا ہے پھر خود آگاہ عورت اپنی انسانیت کو کس چہرے میں تلاش کرے اس مسئلہ سے ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ہم (بجملہ المسلم

مسلمان ہیں۔ ہمارے معاشرے کی عورت جو اپنے لیے آزادی اور انتخاب کا حق، چاہتی ہے ایک تاریخ اور تہذیب سے وابستہ ہے اور اس کا تعلق ایک ایسے معاشرے سے ہے جس کی زندگی اور توانائی کا اصل سرچشمہ اسلام ہے ہمارے معاشرے کی عورت جو اپنی خودی کا خود اثبات کرنا چاہتی ہے جو اپنے وجود کو خود تعمیر کرنا چاہتی ہے جو ایک نشاۃ ثانیہ کے لیے بے چین ہے اور جو اس خلقت جبرید میں ہر خارجی اثر کو رد کر کے اپنی مدد آپ کرنے کی خواہش رکھتی ہے جو نہ صرف ذاتی ساخت کو پسند کرتی ہے اور نہ مغربی تقلید پر راضی ہے اس کے لئے اسلام سے بے نیازی اور بیگانگی ممکن ہی نہیں ہے۔

ایسی صورت میں یہ ایک بالکل فطری بات ہے کہ مسلمان عورتوں کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ ہم جناب فاطمہؑ کی زندگی اور شخصیت کے متعلق کیا جانتے ہیں اور کس قدر جانتے ہیں ہمارے عوام اس پاکیزہ اور بزرگ

ہستی سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں ہر سال لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس عظیم ہستی کی یاد میں گریہ و بکا کرتی ہے ہر سال ہزاروں بلکہ لاکھوں محفلیں اور مجلسیں ان کی یاد میں منعقد کی جاتی ہیں بے شمار تقریبات ہوتی ہیں جن میں ان کی مدح و ثنا کی جاتی ہے ان کی عظمت اور جلالت کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے ان کی کرامت اور معجزوں کا ذکر ہوتا ہے ان کی مصیبت پر گریہ اور ان کے دشمنوں سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہمیں اس عظیم اور ہم گیر شخصیت کی معرفت حاصل نہیں ہے اور اس بزرگ اور مقدس شخصیت کے بارے میں ہماری معلومات بہت سطحی اور محض ان چند اطلاعات پر مشتمل ہیں کہ:-

جناب فاطمہؓ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چہیتی بیٹی تھیں جناب رسالت مآبؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ کی زندگی آرام و مصائب میں گھر گئی۔ آپؐ کو فدک کی جاگیر سے محروم کر دیا گیا آپؐ کے گھر پر حملہ کیا گیا جس کے نتیجے میں گھر کا دروازہ آپؐ کے پہلو پر گرا اور جناب محسنؐ شکم مادر میں شہید ہو گئے ان حالات میں آپؐ کی شخصیت حزن و ملال کا مرتع بن کر رہ گئی آپؐ کا یہ معمول بن گیا کہ آپؐ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر شہر سے باہر چلی جاتی تھیں اور اس دور افتادہ مقام پر تمام دن گریہ و بکا میں مصروف رہتی تھیں اس طرح ان کی مختصر عمر محض گریہ و بکا کرنے اور اپنے دشمنوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرنے میں بیت گئی یہاں تک کہ انہوں نے اس دار فانی سے رحلت کی اپنے انتقال کے وقت آپؐ نے وصیت کی کہ جنازہ رات کو اٹھایا جائے تاکہ وہ لوگ جن سے آپؐ ناراض تھیں آپؐ کے جنازے میں شریک نہ ہو سکیں اور دہنیں آپؐ کی قبر کا نشان معلوم ہو سکے۔

جناب فاطمہؓ کی عظیم شخصیت کے متعلق ہماری معلومات کا دائرہ محض ان چند اطلاعات تک محدود ہے ہم جو دل و جان سے ان کی عظمت اور جلالت کے

معترف ہیں اور ہم جو اپنے روح اور ایمان کی تمام گہرائیوں اور توانائیوں کے ساتھ ان سے عقیدت رکھتے ہیں ایسی بے پایاں اور لازوال عقیدت جس سے زیادہ عقیدت رکھنا کسی انسانی کردہ کے لیے ممکن نہیں ہے لیکن اس ہستی کے بارے میں جو ہماری عقیدتوں کا مرکز ہے ہماری معلومات افسوس ناک حد تک محدود اور سطحی ہیں۔

## عقل حقیقت نگر

میرے خیال میں ملت ایران کو تاریخ میں جو سب سے بڑا افتخار اور اعزاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس ملت نے اپنا رہبر، اپنا پیشوا اور اپنا امام حضرت علی کو چنا ہے

یہ انتخاب اس بات کی علامت ہے کہ اس ملت کی عقل عام سطح سے بلند اس کی فکر عینی اور اس کا تلاش حقیقت کا جذبہ دیگر تمام باتوں پر جاوی اور غالب ہے۔

یہ انتخاب اس بات کا مظہر ہے کہ یہ ملت ظلم سے مقابلہ کا حوصلہ رکھتی ہے جمعوں اور فریب کا پردہ چاک کر سکتی ہے اور غاصب اور طاقتور حکمرانوں سے پیچھے آگامی کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔

یہ انتخاب اس بات کی علامت ہے کہ یہ ملت کسی بھی حال میں سلطانِ جاہل کو خلیفہ برحق ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور جاہل حکمرانوں سے مربوط تمام مصنوعی علماء کے روحانی اثرات اور ہر طرح کے پرفریب پروپیگنڈا سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی اہل ہے

یہ انتخاب اس بات کی علامت ہے کہ یہ ملت تاریخ میں باطل کے نیاہ دبیز اور ضخیم پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی گمنام اور غیر معروف حقیقت کو تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے



یہ ملت تاریخ میں باطل کی تمام ضرب کالیوں، طاقت کی تمام حشر سامانیوں اور حکومت نواز علماء کی تمام فتویٰ طرازیوں کے باوجود حق کو پہچاننے کی اہل ہے یہ اپنے رہبر و امام کے طور پر علیؑ کو منتخب کرتی ہے۔ ایک انتہائی مشکل، دشوار طلب اور صبر آزما انتخاب!

ملت ایران دورِ خلافت میں (ایران کی فتح کے نتیجے میں) دائرۂ اسلام میں داخل ہوئی لیکن اس دن سے آج تک تاریخ کے اس طویل دور میں ہم نے ہمیشہ حقیقی اسلام، اور حکومتی اسلام کے درمیان تمیز قائم رکھی خلفاء بنی امیہ و بنی عباس اور تمام خان و خاقان ترک و منگول و ایرانی جو مرکز اقتدار سے اسلام، حکومت قرآن، سنت پیغمبرؐ کے نام پر قابض رہے ہماری نظر کو دھوکہ دے سکے۔ مگر خدا کی حکومت کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ اسلام اور اس کے تمام عقائد اور معارف کو حکومت کی مرضی کے مطابق ڈھالا جا رہا تھا منبر و محراب، کتاب و تفسیر و حدیث و عظیم تبلیغ، مسجد و مدرسہ، امام و قاضی، حتیٰ کہ صحابی اور تابعی حکومت کے زیر اثر تھے لیکن اس کے باوجود ہماری نگاہ حقیقت شناس دھوکہ نہ کھاسکی اور آج بھی جب لاؤڈ اسپیکر، ٹرانسمریڈر، فلم، ٹیلیویژن، اخبارات، رسائل اور دیگر نشریاتی وسائل حکومت کے کنٹرول میں ہیں۔ اور بے عمل علماء حکمران طبقہ کی حمایت میں اپنا زور علم صرف کر رہے ہیں اور اس حکومت کو جانشینی پیغمبرؐ، وراثت امامت اور حکومت الہی قرآن و سنت جیسی اصطلاحوں سے تعبیر کر رہے ہیں۔ ہماری ملت حقیقت حال کو اچھی طرح سمجھ رہی ہے واقعہ یہ ہے کہ حکومتوں اور حکمرانوں کے زبردست پروپیگنڈہ اور ان دیں از تاریخ حجابات کے باوجود جو معارف و الہیات، علم و حکمت، تاریخ و ثقافت، تفسیر و حدیث کے نام پر اسلام کی حقیقت کو حکومتی مفاد کے سانچوں میں ڈھالتے رہے تاکہ ”وضع موجود“ کی تائید اور ”نظام حاکم“ کی تقدیس کی جاسکے۔ یہ ایک اجنبی اور دور افتادہ ملت (ملت ایران) رسمی اور حکومتی اسلام کو قبول کرنے کے لیے

کبھی آمادہ نہ ہو سکی اور ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے رہے کہ یہ تمام پروپیگنڈہ جھوٹے حکومتوں کا شور و غوغا اور طاقت کے خیرہ کن مظاہر حق کے آئینہ دار نہیں ہیں بلکہ حق کی علامت وہ مرد بزرگ ہے جو تنہائی کا شکار ہے جس کا گھر مسجد نبوی کے ایک گوشے میں واقع ہے اور جو اپنی قوم کے جہل اور ناشناسی کا اسیر اور اپنے دور کی روشنی سیاست کا شکار ہو کر گوشہ نشینی پر مجبور ہو گیا۔

دمشق کے قمر حنفرہ کی چمک دمک اور بغداد کے الف لیلوی شہر کے سحر کو رد کر کے ملت ایران کی نظر ایک مٹی کے چھوٹے سے گھر پر ٹھہرتی ہے۔ یہ علی اور فاطمہ کا گھر ہے، ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ اسلام اسی اداس اور خاموش گھر میں میکین ہے۔

وہ حقیقت جسے اہل مدینہ، معاصر عرب، اصحاب پنجرہ دیکھ کے یا انہوں نے نہ دیکھنا چاہا ہے اور وہ حقیقت جسے دمشق و بغداد کے بڑے بڑے در سے اور دانش گاہیں نہ تلاش کر سکیں یا انہوں نے تلاش کرنا مناسب نہ سمجھا اس قوم بیگانہ نے اس حقیقت کو دیکھ لیا اور پہچان لیا حالانکہ یہ ملت عبد خلافت میں بزرگ شہید دائرہ اسلام میں داخل ہوئی اور اس کا اسلام سے ابتدائی تعلق ان لوگوں کے ذریعہ ہوا جو حکومتی اسلام کی تبلیغ و اشاعت پر مامور تھے۔

یہ انتخاب تنہا اور واحد انتخاب، نہایت دشوار اور نہایت بامعنی انتخاب ہے یہ نشانی ہے اس ملت کی غیر معمولی ذہانت اور معجزانہ عقلی بصیرت کی اور یہ علامت ہے اس ملت کی روحانی عظمت اور استقلال حقیقت پسندی اور اس فکری استقامت کی جو تاریخ کے مروجہ دھاکے کو رد کرنے اور خلافت کے مضبوط اور طاقت ور ادارے کی نفی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے خلافت کا ادارہ تاریخ کے تمام حکومتی اداروں سے زیادہ طاقتور ہے اس لئے کہ اس کے پاس فوجی اور سیاسی طاقت کے ساتھ ساتھ مذہب و اعتقاد کی عظیم قوت اور تہذیب و ادب و دانش کی بیکراں دولت بھی ہوتی ہے لیکن ملت ایران کی نگرانی کوئی نہ

تاریخ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے خلافت کے مضبوط اور مستحکم ادارے کو رد کر دیا۔

اس ملت نے جو ایک اجنبی اور دور افتادہ اور بیگانہ ملت ہے حکومتی اسلام کے اس تمام شور و غوغا کے باوجود جو جنگ و جہاد، فتح و شکست، تعمیر و تخریب سے عبارت ہے اور اس ہنگامہ آرائی کے باوجود جو علم و فکر کی ترقی اور تہذیب و تمدن و انقلاب کے نام پر برپا کی جاتی ہے جس نے تاریخ کی سماعت کو مسح کر دیا ہے اور جس کی ہیبت سے زمین لرزہ بر اندام رہتی ہے ہمیشہ اس صدائے حق کو سنا ہے جو ایک ایسے مروت نہا کا نالہ دردمند ہے جو خود اپنے شہر میں اجنبی تھا جس کے اپنے ہم قریب اس کی صدائے حق کو سننے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ مدینہ کی آبادی سے دور بنی نجران کے نخلستان میں جا کر رات کی تاریکیوں میں نالہ و فریاد کرتا تھا کیونکہ اس کی صدائے پردہ پر کان دھرنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا اس لیے وہ اپنے دل کا درد خود اپنے آپ سے بیان کرتا تھا۔ وہ کنوئیں میں منہ ڈال کر نالہ جانکاہ بلند کرتا تھا اس کی یہ آہ و فریاد خود اس کے ذاتی مسائل کے متعلق نہ تھی بلکہ اس کا رنج و غم اور اس کا ترین و ملال اس انقلابی تحریک کے متعلق تھا جس کو بار آور بنانے میں خود اس نے ہر طرح کی قربانی پیش کی تھی وہ دیکھ رہا تھا کہ مکر و فریب و دروغ و انحراف سے کاغذ کا نظام جو پہلے قیصر و کسری کے روپ میں نمایاں اور ظاہر تھا اور جسے اسلام کی انقلابی تحریک کے ہاتھوں شکست ہو گئی تھی اب ایک نئے رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے اب اس نے تقویٰ اور مذہب کا لباس پہن لیا تھا اب وہ انسانوں کو نہ جلانے اور کئی صدیوں تک تقویٰ اور مذہب کے حوالے سے فریب دیتا رہے گا۔ آخر اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے گا اور اس راستہ میں کیسی قربانیوں کی ضرورت پیش آئے گی وہ صاحب بصیرت انسان اس بات کو دیکھ رہا تھا کہ اسلام میں اس ظالمانہ اور پرفریب حکومتی نظام کے ظلم کا اولین نشانہ

”عوام“ ہوں گے اور یہ نظام ”عوامی حقوق کی پامالی“ کے ذریعہ اپنی بنیادوں کو مستحکم کرے گا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ عوام کی قربانی کا پہلا مظہر خود اس کی ذات ہے اس سے بھی قبل اس کی شریک حیات ہے اور آنے والے زمانوں میں اس کا خاندان اس ظلم کا نشانہ بنے گا۔ اور اس کی اولاد کو نسل در نسل عوامی حقوق کے تحفظ کے لیے مسلسل قربانی دینی ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فیصلہ اور یہ انتخاب یعنی تاریخ کے نہایت دشوار، ہولناک اور تاریک ادوار میں علیؑ کو اپنا قائد اور رہبر تسلیم کرنے کا فیصلہ کوئی آسان اور معمولی فیصلہ نہیں تھا بلکہ یہ فیصلہ اور انتخاب ہماری عقل و سامان اور تلاش حقیقت کے نہایت کھرے اور پیچھے ذوق کی علامت ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہماری ملت عقلی اعتبار سے نابینہ (GENIUS) ہے وہ اخلاق کے حسن اور عشق کی فضیلت سے آشنا ہے وہ انسانیت کی عظمت اور اس کے حسن و شکوہ کا ادراک رکھتی ہے وہ اعلیٰ انسانی قدروں سے واقف ہے اور ان کی گہرائی اور ان کی بلندی کو سمجھنے کی استعداد رکھتی ہے یہ ملت ظلم اور تاریکی کے طوفانوں میں بھی حقیقت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رہتی ہے اور تاریخ کے مروجہ فیصلوں کے علی الرغم اپنے لیے حقیقت کا انتخاب خود کرتی ہے یہ وہ ملت ہے کہ جو منارہ و محراب و مہر کی آوازوں، مفتیوں، قاضیوں اور موقع پرست علمائے اثرات اور حکومت کی خون آشام تلواروں کی چمک دمک کے باوجود کبھی دھوکہ نہیں کھاتی اور اس تمام شور و غوغا کے جواب میں ہمیشہ ایک دل اور ایک جان ہو کر نہایت مستحکم لہجہ میں صرف ایک جواب دیتی ہے اور وہ جواب ہے ”نہیں“ (ہم ظلم و فریب سے دھوکہ نہیں کھائیں گے۔)

لیکن ہمیں کسی بھی حال میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ایمان کے لیے فکر و فراست کے ساتھ ساتھ خون کی حرارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے ایمان قربانی طلب کرتا ہے حق کی کامیابی کے لیے ایثار کی ضرورت

ہوتی ہے اور قربانی و ایثار کا دائرہ بہت وسیع ہے یہ بہت دشوار راستہ ہے یہاں انسان کی دلیری اس کے اخلاص اور اس کی مصائب کے مقابلہ میں قوت برداشت کا امتحان ہوتا ہے اس راہِ ایثار میں طوق و سلاسل کی سختیاں ہیں کوڑوں کی سزائیں ہیں الزام تراشی اور جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ قید تنہائی کی سختیاں ہیں آوارہ وطنی کا حزن و ملال ہے اس راہ میں انسانوں کو اپنی امانیت کو قربان کرنا ہوتا ہے اپنی اس مصلحت اندیشی کو جو ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں کا نمونہ ہے بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے اپنے پندار تقدس اپنے زعمِ دانشوری اور اس کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزوں کو نثار کرنا ہوتا ہے

یہی ایثار و قربانی کا بیکران اور مسلسل جذبہ تشیع کی اصل ہے۔ وہ تشیع جو تیشِ علوی ہے نہ کہ تیشِ صفوی یا ”شیعہ شاہ عباسی“ شیعیت وہ تحریک ہے جو تاریخ کے ہر دور میں ظلم و فریب کے دل کو دہلا دینے کا موجب رہی ہے۔ شیعیت کبھی ظلم و فریب کی پشت پناہ نہیں ہو سکتی۔ اصل شیعیت مذہبِ عدل ہے حکومتِ معصوم کا عقیدہ ہے شیعہ تاریخ مافی کے کچھ مردہ اور از کار رفتہ مسائل یا فرقہ وارانہ تعصبات کا نام نہیں ہے نہ شیعیت حب اور بغضِ محبت اور نفرت کے ان تصورات کا نام ہے جن کا تعلق محض ذہانی جمع خرچ سے ہے اور جن کی اساس عقلی اور علمی نہیں ہے جہاں ہدف تنقید اشخاص ہیں ادارہ نہیں ہے جس کا تعلق محض ماضی سے ہے حال سے نہیں ہے اور جس کا فائدہ صرف موت کے بعد ہے (شفاعت) زندگی میں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا جسے ہم ”ولایتِ علوی“ کہتے ہیں اس کا مقصد لوگوں کو حکومتِ ظلم و جور اور دامِ فریب و جیل سے آزاد کرانا تھا اس عظیم تصور ولایت کا ولایت کے اس تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ہر ہمہ و شہادتی بن بیٹھا ہے اس جھوٹی ولایت سے نہ خدا کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے۔ اور نہ بندگانِ خدا کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اصل تشیع اسلام کے علاوہ کچھ نہیں ہے تشیع وہ نہیں ہے جس کے

متعلق ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ "اسلام بہ اہنافہ چیز ہائے دیگر" ہے نہیں ایسا نہیں ہے۔ شیعیت اسلام میں کسی اہنافہ سے عبارت نہیں بلکہ شیعیت تو صرف اسلام ہے۔ اصلی اور خالص اسلام۔ وہ اسلام جو برکھوٹ اور ملاوٹ سے پاک ہے اور جس میں خلافت و عربیت و اشرافیت کی ملاوٹ شامل نہیں ہے۔

عدل و امامت کے شیعہ اصول اسلام میں کسی اہنافہ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ عدل و امامت کو اسلام سے خارج کرنا خود دین اسلام کو

اسلام سے منہا کرنے کے مترادف ہے اسلام کا پیغام عدل کا پیغام ہے اور یہی اس کا حقیقی امتیاز اور اختصاص ہے اسلام سے عدل و امامت کو خارج کرنا اور اس کی جگہ حکومت، نسل اور طبقہ واریت کو اسلام میں شامل کرنا قبل اسلام کے عہد جاہلیت کی اقدار کو اسلام میں شامل کرنا ہے یہ ایک لحاظ سے جاہلیت جدید ہے۔

ماضی میں بیشتر اور سنی کا اختلاف علمی اور اصولی اختلاف تھا (زمانہ حال میں اس اختلاف نے روح لفظی بحثوں اور فرقہ پرستی کی شکل اختیار کر لی ہے) یہ اختلاف امامت اور عدل کی ظلم و استبداد کے خلاف جنگ سے عبارت تھا یہی وہ اصل اختلاف تھا جس سے تمام اعتقادی، مذہبی تاریخی اور نفسیاتی اختلافات ظاہر ہوئے ہم نے محمدؐ کے ساتھ علیؑ کا اہنافہ نہیں کیا بلکہ ہم نے علیؑ کا دامن پکڑ لیا تاکہ ہم محمدؐ کو گم نہ کر دیں کیونکہ وہ تمام خلفاء اور حکمران جو درحقیقت تبصر و کسری اور فرعون کے جانشین اور ابوجہل و ابوسفیان کے وارث تھے اپنی حکومت کے حجاز کو قائم رکھنے کے لیے محمدؐ کی جانشینی کے دعویدار ہیں ہم نے خانوادہ علیؑ

(عزت) کو سنت پیغمبرؐ کی جگہ نہیں دی ہم نے سنت پیغمبرؐ کے ساتھ عزت کا اہنافہ کیلئے بلکہ نہایت سادہ اور سیدھی سی بات یہ ہے کہ ہم عزت کے ذریعے سنت پیغمبرؐ کو سمجھتے ہیں یہ خاندان خود پیغمبرؐ کا خاندان ہے اور ہم اس خاندان سے پوچھتے ہیں کہ حضورؐ نے کیا فرمایا کیا عمل کیا اور اس سے آپؐ کی خواہش اور نشار

کیا تھا۔

دوستوں اور دشمنوں دونوں کے تصور کے برعکس شیعیت اسلام میں سنت پر سب سے زیادہ کاربند رہنے والا مذہب ہے شیعہ اور سنی میں بنیادی اختلاف یہ ہے کہ علیؑ اور سچے اور با شعور شیعوں کی ابتدا ہی سے یہ کوشش رہی کہ سنت کو ہر طرح کی بدعت اور سلاوٹ سے پاک رکھا جائے اور سنت پر بغیر کی وضع کو نسخ نہ ہونے دیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح دین کی تمام تعلیمات کو دہم برہم کر دیا گیا ہے تاریخ کے ان سیاہ امدار میں جب دنیا میں ہر طرف اسلام جو روحانیت کی طاقت اور حکمت کا ڈنکا بج رہا تھا اسلام عدل و امامت، خون شہادت کے گرداب میں غرق تھا شیعوں نے شہادت کا انتخاب کر کے حکومت کی طاقت کی نفی کر دی۔ لیکن یہ انتخاب کوئی آسان بات نہ تھی یہ بڑا دشوار انتخاب تھا یہ بڑی آزمائش اور قربانی کا مرحلہ تھا۔

بنی امیہ و بنی عباس اور سلاطین ترک و منگول کے اذیت خانے اسی بات پر گواہ ہیں کہ ہر دور میں علمائے امت، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سکرانے والے مجاہدین اور حق پرست، عدل طلب اور آزادی پسند لوگوں نے اپنے آپ کو راہ ایثار اور قربانی پر ثابت قدم رکھا اور آگ اور خون قید و بند اور اتلاؤں اور آزمائش کی تمام دشواریوں کے باوجود دمشق اور بغداد کے حکومتی محلوں کو رو کر کے اپنا تعلق ایک چھوٹے سے گھر سے استوار رکھا وہ چھوٹا سا گھر جس کی عظمت تمام انسانی عظمتوں کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے

تاریخ اسلام میں علیؑ کا ذکر کرنا یا فاطمہؑ سے اظہار عقیدت کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی کبیت جس کی شاعری کا ممنوع اس عظیم خاندان کی فضیلت اور بزرگی ہے کہ "میں پچاس سال سے اپنی صلیب اپنے گاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں یہ ایک ذمہ دار شاعر کا رویہ ہے ایک ایسا شاعر جس نے اپنے شعروں

سے شمشیر جہاد کا کام کیا ہے۔

اور یہی ان تمام مردوں اور ان تمام عورتوں کی تقدیر رہی ہے جنہوں نے اس مذہب کی تاریخ کو مرتب کیا ہے یہ ایک ایسی تاریخ ہے جس کی ہر سطر پر ہر حرف شہیدوں کے خون کی سرخی سے لکھا گیا ہے یہ دور سابق کے وہ مہاجران عزم و ایثار تھے جنہوں نے اپنی قربانیوں سے تشیع کی روایت کو مستحکم کیا یہ وہ لوگ تھے کہ جو کسی مصلحت یا مفالطہ کا شکار نہ تھے ان کا انداز نظر یہ نہیں تھا کہ ”امام تشریف لائیں گے تو ہر چیز کی اصلاح ہو جائے گی وہ اپنے آپ کے دین کا اجاؤ خود فرمالیں گے ہمارا کام یہ ہے کہ ہم صبر کریں انتظار کریں“ آج صورت حال یہ ہے کہ ہم نے تقیہ اور تحمل کی غلط تعبیر کر کے اپنی تمام ذمہ داریوں سے منہ موٹ لیا ہے

ابن سکیت ایک بہت بڑے ادیب تھے ان کا تعلق طبعہ مجاہدین سے نہیں تھا بلکہ وہ لسانیات اور ادب کے ماہر تھے البتہ ان کا دل شیعہ تھا عباسی خلیفہ متوکل نے اپنے فرزندوں کی تعلیم کے لیے ان کا انتخاب کیا رفتہ رفتہ متوکل تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ اس کے بیٹے علی اور ان کے خاندان کی محبت میں گرفتار ہونے لگے ہیں خبروں نے اس کے ساتھ ہی متوکل کو اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ یہ کام اس معلم کا ہے جسے متوکل نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا ہے خلیفہ نے چاہا کہ اس خبر کی تصدیق خود کرے اس غرض سے وہ اچانک ایک دن کلاس روم میں پہنچ گیا پہلے تو اس نے ابن سکیت کی تعریف و توصیف کی اور اپنے فرزندوں کی تعلیمی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا پھر اس نے سرسری انداز میں ابن سکیت سے پوچھا کہ میرے فرزندوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے جواباً ابن سکیت نے خلیفہ کے بیٹوں کی بہت تعریف کی اچانک خلیفہ نے پوچھا۔ ابن سکیت کیا تمہارے نزدیک میرے بیٹے مومن اور مویہ علیؑ کے فرزند ان حسنؑ اور حسینؑ سے افضل ہیں؟



ابن سکیت کو بڑا اہم اور دشوار فیصلہ کرنا تھا اس مرحلہ پر تقیہ کا مطلب عقیدے کی کمزوری اور دین کے ساتھ خیانت ہوتا دراصل تشیع علوی میں تقیہ کمزوری اور مصلحت شناسی کا نام نہیں بلکہ تقیہ ایک ٹیکٹک (TACTIC) ہے۔ یہ ایک ایسا طریقہ کار ہے جس کا مقصد ایمان کا تحفظ ہے محض اپنی جان کا تحفظ نہیں ہے جیسا کہ آجکل خیال کیا جاتا ہے۔

ابن سکیت نے کسی ہچکچاہٹ کا اظہار کئے بغیر اسی فطری ہجو میں جن ہجو میں متوکل نے اس سے سوال کیا تھا دو ٹوک انداز میں کہا ”قیر علیؑ“ کا غلام تہم سے اور تہملے دونوں فرزندوں سے کہیں زیادہ افضل ہے۔ متوکل نے حکم دیا کہ ابن سکیت کی زبان گری سے باہر کھینچ لی جائے ایسی ہی زبانیں تھیں جو تاریخ کے جابر حکمرانوں کے خلاف تازیانہ کا کام کرتی رہیں اور اگر سیاسی استبداد طبقاتی استحصال اور مذہب کے نام پر قائم کئے گئے غیر مذہبی نظام کی بنیاد کو ڈھا نہیں سکیں تو کم از کم اسے رسوا کر کے چھوڑے اور یہی وہ زبانیں تھیں جنہوں نے تاریخ میں حق گوئی کی مشعل کو روشن اور لوگوں کے دلوں میں آزادی، انصاف اور حق طلبی کی لگن کو زندہ رکھا۔

## علماء اور عوام

ظلم و جبر کی طاقت کے خلاف اعلام کلمۃ الحق کی یہ سنگین ذمہ داری دو گروہوں نے پوری کی ہے یہ دونوں گروہ بندیوں سے اپنی مہلیب خود اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ علماء کا گروہ ہے۔ علماء حق جو شیعیت کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ ہمارے عقیدہ میں امامت، نبوت کا تسلسل اور اس کے دوام کی شکل ہے اور علم امامت کے دوام اور بقا کی ضمانت ہے۔

دوسرا گروہ ان مردانِ خوش اعتقاد کا ہے جن کے ہبر و سکوت کو دیکھ کر جابر حکومتوں کے قید خانہ فریاد کرتے ہیں جن کے خون آلود جیروں کی نازیگی

کو دیکھ کر جلا دشمر سے پانی پانی ہو جاتے ہیں اور جن کی پشتیں ان چٹانوں کی طرح مضبوط اور مستحکم ہیں جن پر تشدد کر کے خود ظالموں کے کورے درد مند ہو جاتے ہیں۔

## عقل اور عشق

ہر مذہب، ہر مکتب فکر ہر تحریک اور ہر انقلاب کے اجزاء ترکیبی دو عناصر ہیں عقل اور عشق ایک روشنی ہے اور دوسرا حرکت ایک لوگوں میں شور اور آگاہی پیدا کرتا ہے ان کو دانائی اور بینائی عطا کرتا ہے اور دوسرا این جوش اور جذبہ اور ذوق عمل کو ابھارتا ہے الیکس کارل ALEXIS ... CARREL کا کہنا ہے کہ عقل موٹر کارگی روشنی ہے جو اسے راستہ دکھاتی ہے اور عشق اس کا آئینہ ہے جو اسے حرکت میں لاتا ہے ان دونوں عناصر میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر بے کار اور بے معنی ہے عشق بغیر عقل ایک موٹر ہے جو روشنی سے محروم ہے عشق کو خطرہ کی علامت ہے حادثہ اور موت کو دعوت دیتا ہے۔

کسی بھی معاشرہ میں جب کوئی تحریک ابھرتی ہے یا کوئی فکری انقلاب رونما ہوتا ہے تو دانشور اور خود آگاہ اور روشنی فکر طبقہ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے لیے راہ عمل کی نشاندہی کرے اور اس تحریک کے فکری مقاصد لوگوں کو آگاہ کرے اور عوام اس آگاہی کے نتیجہ میں اپنے جوش و جذبہ اور ذوق عمل کے ذریعے اس تحریک میں روح پھونکتے ہیں اور اسے حرکت اور توانائی عطا کرتے ہیں کسی تحریک کی مثال ایک زندہ جسم کی سی ہے دانشور اور علماء اس جسم کا دماغ ہیں اور اس کا دل وہ عوام ہیں جن کے سینے عشق کی آگ سے لبریز ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اگر کسی معاشرہ میں ایمان اور اخلاص عشق اور فداکاری کا فقدان ہے تو اس کے ذمہ دار عوام ہیں لیکن اگر شعور ادا لگی کی کمی ہے راستہ اور مدد فی غیر واضح ہے فکر مبہم ہے سرچ میں گہرائی اور گیرائی نہیں

ہے تو اس میں قصور علماء اور دانشوروں کا ہے اسی لیے خصوصاً مذہب میں عقل اور عشق کا ساتھ بہت ضروری ہے مذہب ایک طرح سے "آگاہی عاشقانہ" یا "عشق آگاہانہ" ہے یعنی یہاں عشق اور عقل کا چرخی دامن کا ساتھ ہے عقل اور جذبہ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا

اسلام میں بھی یہی صورت ہے بلکہ اسلام میں عقل اور عشق کا تعلق دوسرے مذاہب سے زیادہ گہرا ہے دین اسلام کی دو بڑی بنیادیں ہیں کتاب اور جہاد، کتاب علم ہے اور جہاد عشق، قرآن میں یہ تلاش کرنا بہت مشکل ہے کہ عقل و عشق (ایمان) کے درمیان خط فاصل کہاں ہے۔ قرآن شہادت کو زندگی جاوید کہتے ہیں اور ساتھ ہی قلم اور جو کچھ لکھا جائے (دماغی سطروں) کی قسم کھاتا ہے پھر جہاں پیغمبرؐ کے رفیقوں کا ذکر ہے وہاں صدیقین اور صالحین کے ساتھ شہداء کا تذکرہ تو ہے مگر عابد، مجاہد اور مبلغ کا تذکرہ نہیں ہے۔

تشیع بالخصوص جیسا کہ اس کی تاریخ اور ثقافت سے ظاہر ہے عشق و جوش اور قربانی و شہادت کا مذہب ہے گرمی احساس اور شعلہ کردار کی تحریک ہے۔ اس کے باوجود تشیع کی اساس عقل و عرفان پر ہے یہ علم و عقل کا دین ہے یہ تاریخ انسانی میں ایک انوکھی انقلابی تحریک ہے جوشیلی قربانیوں کے خون سے رنگین مگر عقلی اور علمی تحریک جن کی علامت اور جس کا سرچشمہ وہ ذات ہے جس کا نام علیؑ ہے علیؑ جو علم اور عشق کے جامع اور متوازن امتزاج کا نام ہے

اور یہ حقیقت پرستی کا مذہب ہے اس لیے کہ حقیقت بے پرستش خصی فلسفہ و دانش ہے (بے عمل فلسفہ) اور پرستش، بے پرستش، ہوائے نفس کی غلامی ہے جن کا دوسرا نام بت پرستی ہے۔

## اشک: شہادت عشق

تاریخ میں شیعت کا نمود اور اس کی بقا دو عناصر پر منحصر ہے ایک تو وہ

علماء اور مجتہدین جو علم و تحقیق کا منظر ہیں جو اپنی فکر کی گہرائی کے ذریعہ اعتقادات کے باطنی مفہوم اور اس کے مکمل معنوں کا ادراک کر سکتے ہیں جو مذہب کی حقیقت اس کی روح اور اس کی صحیح سمت کی نگہبانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور فلسفہ و تصوف علم و ادب، زہد و ریاضت، یونانی اور مشرقی فلسفہ و فکر کے حوالے سے دین میں جو گمراہیاں سر اٹھاتی ہیں ان کا تدارک کرتے ہیں۔

اور دوسرے وہ عوام ہیں جو منظر ہیں وفاداری کا، جوش و جذبہ کا، عشق و اخلاص کا جن کی حقیقت سے وفاداری اس قدر گہری اور پر جوش ہے کہ وہ علیؑ کے نام پر اور علیؑ کے مسلک کے تحفظ و بقا کے لیے اپنی جائیں قربان کر دیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ظلم و تشدد کے ان تمام ادوار میں جب حکومت کے لیے علیؑ کے دوستوں کا قتل عام کرنا ہنسی کھیل تھا وہ لب جو علیؑ کی مدح میں کھلتے تھے سی دیے جاتے ہیں جب وہ خون جو علیؑ کی محبت میں جوش کھاتا تھا بہا دیا جاتا تھا۔ تمام آزمائشوں اور خطرات کے باوجود عسرت پیغمبرؐ کی محبت کا دم بھرا اس کی پاداش میں ان کے جسم سے ان کی گھالیں کھینچوا دی گئیں

اور آج بھی یہ گروہ عوام اس خاندان سے اسی طرح محبت رکھتا ہے اسی شد و مد سے دوستی کا دم بھرتا ہے خاندان پیغمبرؐ سے اس کی وفاداری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی آج بھی ظلم و تشدد سے پر صدیوں کے گزرنے کے باوجود یہ وفادار گروہ اس گھر کو چھوڑ کر کسی دوسرے قصر، مسجد یا محل کو اپنا قبلا بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ سب کے سب جناب فاطمہؑ کے سنگِ دل پر اپنے سر بائے عقیدت کو جھکائے ہوئے ہیں اس حالت میں کہ ان کے دل درد سے پر۔ ان کے لب مصروف نالہ و فریاد اور ان کی آنکھیں اشکیار ہیں۔ یہ آنسو محبت کی وہ زبان ہیں جس کے ذریعے پاک دل اور وفادار لوگ اس گھر کے میکانوں سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں اور اس زبان سے زیادہ سچی، پاکیزہ اور بے ریا اور کون سی زبان ہو سکتی ہے کہ جس کا کلمہ نہ لفظ ہیں نہ

خطوط بلکہ جس کا کلمہ صرف اشک ہیں جس کی عبارت نالہ و فریاد ہے وہ نالہ و فریاد جو گریے اور سچے عشق کی بے تابی اور شوق کی آئینہ دار ہے کیا آنکھ زبان سے زیادہ سچی نہیں ہے کیا آنسو صداقت کا شاہکار نہیں ہیں؟ شعر کا حسن، عشق کی بے تابی، ایمان کا سوز و گداز شوق کی بے کلی، احساس کی تب و تاب جب کسی دل میں باہم گھل مل جاتے ہیں تو ایک قطرہ گرم آنکھ سے ٹپک پڑتا ہے اس قطرہ گرم کا نام ہے آنسو، آنسو جو محبت کی سب سے خالص اور کھری زبان ہے اور جو اظہار جذبات کا لطیف ترین پیرایہ ہے ہمارے عوام محبت کی اسی زبان کو استعمال کرتے ہیں اور وہ اس زبان کے استعمال سے خوب واقف ہیں۔

آپ اس بات پر تعجب نہ کریں کہ میں اس وقت دگریہ، اے حق میں لول رہا ہوں جبکہ آپ نے بار بار مجھے اس گریہ پر تنقید کرتے ہوئے سنا ہے جس کا تعلق مجلسوں اور رمز خوانی سے ہے لیکن میری ان دونوں باتوں میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے منصوبہ بندی کر کے رونا اس گریہ سے بالکل مختلف ہے جو محبت کا ایک لازمی اور فطری تقاضا ہے۔ وہ لوگ جو رونے کو ایک سی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ ان کا رونا مصنوعی اور رسمی ہے اس کے برعکس میں اس وقت جس گریہ کے حق میں دلائل دے رہا ہوں وہ حقیقی اور فطری گریہ ہے جو جذبہ اور احساس کی روشنی اور عشق و اندوہ کا ایک لازمی اور فطری نتیجہ ہے

ریگی دی برے (REGI DEBRE) فرانس کے مشہور انقلابی ہیں جو آج کل لاطینی امریکہ میں سرگرم عمل ہیں انہوں نے کیا خوب کہلایا ہے کہ وہ انسان جو کبھی نہیں روتا اور جس کا دل ذوق گریہ سے عاری ہے اس میں درحقیقت انسانیت کی کمی ہے۔ وہ ایک پتھر ہے بے حس ایک روح ہے خشک اور وحشی آنکھیں روتی ہیں اور دل فریاد کرتے ہیں اور یہ آنسو یہ نالہ و فریاد عشق کی شہادت دیتے ہیں ہر انسان جس کے پہلو میں دل ہے پتھر نہیں ہے غم سے

متاثر ہوتا ہے رفتہ رفتہ غم کا اثر گریہ کی تحریک کرتا ہے یہاں تک کہ اچانک گریہ گلوگر ہو جاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے جیسے دم گھٹ جائے گا ایسی حالت میں انسان اس بات پر مجبور ہے کہ وہ روئے اس کی آنکھیں اشکبار ہوں اور اس کے لب نالہ و شیون بلند کریں یہ گریہ جذبہ عشق کی فطری اور سچی زبان ہے اس کے برعکس وہ مصنوعی رونا ہے جس کے لیے اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

جس کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی منصوبہ یا پروگرام بنایا جائے یہ گریہ ایک رسم ہے ایک طریقہ ہے ایک رسمی فریضہ ہے یہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے یہ حصول منفعت یا دفع مضرت کا وسیلہ ہے یہ اپنی خطاؤں کمزوریوں اور گناہوں کا کفارہ سمجھا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنی بد اعمالیوں کا جواز فراہم کیا جاتا ہے میں نے ہمیشہ اس گریہ پر تنقید کی ہے اور میں اس وقت بھی اپنے موقف پر قائم ہوں۔

اگر کوئی عاشق اپنے معشوق کے ہجر کا شکا ہے۔ اگر کسی چاہنے والے کا دل اپنے کسی عزیز کی موت کے صدمہ سے سلگ رہا ہے تو اس کا رنج و اندوہ اور گریہ دہکا ایک فطری امر ہے جب کبھی اس کے دل میں اپنے محبوب کی یاد آئے گی جب کبھی وہ زبان سے اس کا ذکر کرے گا اس کی روح عشق کی آگ میں تپنے لگے گی اور اس کا چہرہ محبت کے نور سے چمکنے لگے گا ایسی حالت میں آنکھیں بھی اس کے جذبات کی سچی ترجمانی کریں گی۔ یعنی آنکھوں سے آنسو بے ساختہ ٹپکیں گے یہ گریہ ایمان کی گہرائی اور عشق کی سچائی کی نہایت لطیف اور واضح نشانی ہے۔

اب ذرا اس شخص کے متعلق سوچئے جو حرص و ہوا کا اسیر ہے جو دولت شہرت اور عزت کے پیچھے دوڑ رہا ہے وہ اگر تاجر ہے تو صبح سے شام تک بازار میں سرکھپاتا ہے اور ہر جائز و ناجائز طریقہ سے منافع کماتا ہے اور اگر کسی ادارہ کا کارکن ہے تو اپنے انہر کی خوشامد کرتا ہے لیکن اپنے ماتحتوں اور اہل

مزدوریت کے ساتھ اس کا رویہ تبکر اور فرعونیت کا رویہ ہوتا ہے ایسا شخص شام کو اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا ہے ہنسی خوشی کھاتا پیتا ہے چین کرتا ہے آرام کرتا ہے پھر دن ڈھلے سیر و تفریح کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور ہر طرح کی جائز و ناجائز تفریحات سے لطف اندوز ہوتا ہے ایسے میں اگر سے خیال آتا ہے کہ آج کی تاریخ کی مناسبت سے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے کسی اجتماع میں شرکت کرنا ہے تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس اجتماع میں شرکت کے لیے چلا جاتا ہے (ایسے اجتماعات عموماً ہینے کی پہلی تاریخ کو ۶ سے ۹ بجے رات تک منعقد ہوتے ہیں) پھر وہ شخص اس اجتماع میں بیٹھ کر اپنے اوپر غم و غصہ کو طاری کرتا ہے قصداً نالہ و یکا کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں پھر جب گریہ کا یہ پروگرام اور اس کی تمام رعیں پوری ہو چکتی ہیں تو وہ آرام سے چائے اور قہوہ نوش کرتا ہے حق سے دل بہلاتا ہے اور ساتھ ہی اس خوش نہی میں مبتلا رہتا ہے کہ ان مراسیم و عزائم میں شرکت کے ذریعہ اس نے اپنے ایمان اور عقیدہ کی بڑی خدمت کی ہے اس خوش نہی کے نتیجہ میں وہ اپنے آپ کو روحانی طور پر ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے (جیسے اس کے تمام گناہ دھل گئے ہوں) بعد ازاں ایک بار پھر وہ اپنے معمولات پر لوٹ جاتا ہے پھر ہینہ بھر دولت کے پیچھے سرگرداں رہتا ہے یہاں تک کہ دوبارہ پروگرام کے مطابق پھر وہی تاریخ آ جاتی ہے جب اسے مجلس گریہ میں شرکت کرنی ہے پھر وہ اس پروگرام میں شرکت کرتا ہے اس طرح اس کی زندگی کا کاروبار اس کے تمام معمولات اور رونے کا پروگرام ساتھ ساتھ چلتے ہیں بلکہ گریہ کا پروگرام اس کے معمولات ہی کا حصہ بن جاتا ہے کیا آپ کسی ایسے شخص کو سچا عاشق مان سکتے ہیں؟ کیا آپ کسی ایسے انسان کی نالہ و شبیوں پر اعتبار کر سکتے ہیں کیا رسمی آنسوؤں کو حقیقی محبت کا مظہر سمجھا جاسکتا ہے؟

محبوب کی معرفت کے بغیر اس کے لیے رونا، اس کے ایمان اور جذبہ کی

حرارت کو اپنے دل میں محسوس کئے بغیر اس کے لیے نالہ فریاد کرنا محبوب سے ہمہ  
وفا کی علامت نہیں ہے یہ رونا ایسا ہی ہے جیسے خش و خاشاک سے پاک کرنے  
کے لیے آنکھیں دھوئی جائیں۔

مت بھولنے کہ امام حسینؑ کی عظیم مصیبت پر جس شخص نے سب سے پہلے  
گریہ کیا وہ عزرا بن سعد تھا۔

اور یہ بھی مت بھولیے کہ اس طرح کے جھوٹے رونے پر جس شخصیت نے  
سب سے پہلے ملامت کی وہ جناب زینبؑ تھیں۔

اور یہ بات بھی یاد رکھئے کہ امام حسینؑ کے لیے جو پہلی رسی اور دکھائے کی  
جلس برپا ہوئی اس کا محل وقوع دربارِ یزید تھا۔ لیکن ہمارے عوام کا گریہ گریہ  
عاشقانہ ہے یہ اس گہری اور سچی محبت کی زبان ہے جس سے ہمارے دل لبریز ہیں  
اس محبت اور عقیدت کا مرکز خانہ علیؑ و فاطمہؑ ہے یہ گھر ہمارے لیے یونانیوں کے  
پانیتھون (PANTHEON) اور ادولفیا کی طرح بلکہ اس سے زیادہ مقدس  
اور متبرک ہے یہ ہمارے ناخداؤں کا مسکن ہے جو خدا کی مختلف صفات کے مظہر  
اور اس کی نشانیاں ہیں۔ یہ نا خدا صرف اشکوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ آنسوؤں  
کے علاوہ کسی اور زبان سے واقف نہیں ہیں اور ہمارے عوام نہ فلسفی ہیں نہ عالم  
وہ صرف محبت کرنے والے ہیں۔ عاشقانِ ہمدرد جو اپنے محبوب کے لیے اپنی جائیں  
فدا کرنے کے لیے تیار ہیں وہ اشکوں کی زبان بولتے ہیں۔

تمام تاریخ میں کسی مذہب و ملت کا سرمایہ ایسا خاندان نہیں ہے۔ وہ  
خاندان جس میں باپ علیؑ ہے ماں فاطمہؑ ہے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ ہیں اور بیٹی  
زینبؑ ہے اور یہ سب لوگ، یہ سب یکگانہ روزگار افراد۔ ایک ہی وقت اور ایک  
ہی زمانے میں ایک ہی مکان کی چھت کے نیچے رہتے تھے یہ سب مل کر ایک اکائی  
تھے۔ ایک گھر، ایک خاندان کی اکائی۔

ہماری قوم نے اس گھر، (جناب فاطمہؑ کے گھر) کے خش و خاشاک سے ایک



تہذیب تعمیر کی ہے ایک ثقافت کو تراشا ہے۔ یہ گھر ایک تاریخ کا سرچشمہ ہے۔ وہ تاریخ جو نیکی اور پاکیزگی کی تاریخ ہے جو جوشِ عمل، جذبہٴ ایثار و استقامت، شجاعت اور فضیلت کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ وقت کے انق پر محیط ہے یہ پاک و صاف پانی کا وہ زندگی بخش دریا ہے جو صدیوں سے ہمارے عوام کی روح کو سیرا کر رہا ہے اور ہنوز ہمارے وجدان اور احساس میں جاری و ساری ہے

تمام انسانی تاریخ میں یہ وہ واحد ملت ہے جو مستقل اپنے محبوب خاندان کے غم کو سینے سے لگائے ہوئے ہے تمام روئے زمین پر یہ وہ واحد ملت ہے جو ان ہستیاں پر ڈھائے گئے مظالم کی یاد میں جو اس کے ایمان اور آزادی کی علامت تھیں دل گرفتہ اور غم زدہ ہے اور اس کا یہ غم و اندوہ تاریخ کے طویل عرصہ پر پھیلا ہوا ہے زمانہ کی گردش اس غم کو دبایا مٹا نہیں سکی اور حکومتوں کے جبر و استبداد نے اس گھرنے کی فضیلت کو گھٹانے اور اس کی حقیقت کو چھپانے کی جو کوششیں کیں ان کے باوجود یہ ملت اس گھر کی محبت اور عقیدت کو سرمایہٴ حیات بنائے سمجھتی ہے اور اس کے مکینوں کے آہام و مصائب کی یاد میں دل گرفتہ اور اشک خنک ہے نہ ہمارا غم گھٹ سکا ہے نہ ہماری محبت میں کمی آئی ہے اور نہ ہمارے آنسو تھکے ہیں۔

لیکن یہ عشق، عقیم ہے۔ باخجہ ہے، بے نتیجہ ہے، ان اشکوں کی مثال اس بارش کی سی ہے جو کسی شور زمین پر برستی ہے اس دشت میں نہ گھاس اگتی ہے نہ پھول کھلتے ہیں اور ہمارا تمام جذبہٴ فداکاری، ہماری عقیدت کا تمام سرمایہ، ہمارا تمام جوش و خروش، ہماری تمام توانائی اور ہماری تمام کوششیں بظاہر بے نتیجہ ہیں، بے ثمر ہیں۔ ان سے ہماری زندگی میں کوئی انقلاب بدلی رونما نہیں ہوتا۔ مگر کیوں؟

## باب دوم

### تقصیر کس کے ہے ؟

اگر ہم راجع تحقیق و عقیقہ، اور ہمارے اشک بے شمار ہیں تو قصور کس کا ہے ؟

قصور دار علماء ہیں کہ جو عوام کی رہنمائی کے فریضہ کو صحیح طور پر انجام دینے سے معذور نظر آتے ہیں۔ یہ ذمہ داری علماء کی ہے کہ وہ عوام کے شعور کی تربیت کریں انہیں خود آگاہی اور ذمہ داری کا احساس پیدا کریں اور ان کی جدوجہد کے لیے صحیح سمت متعین کریں۔

ہماری عقل و دانش کی اعلیٰ ترین صلاحیتیں، ہماری فہم و فراست کا بہترین سرمایہ، فلسفہ، کلام، تصوف، فقہ و اصول، ادبیات و معنی بیان و بدیع اور صرف و نحو جیسے کاموں کے لیے وقف ہیں اور سالہا سال کے تحقیق و تفکر اور علمی زیادت اور مشقت کا بعد اس کا نیتو محض ایک "رسالہ عملیہ" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس میں صرف آداب طہارت، نجاستوں کی اقسام عورتوں کی طہارت کے مسائل اور شکیات نماز جیسے موضوعات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

جہاں تک کہ عوام میں آگاہی پیدا کرنے کا تعلق ہے جہاں تک لوگوں کے شعور کی تربیت کا سوال ہے لوگوں کو مذہب کی حقیقت اور اس کے فلسفہ اور احکام سے روشناس کرانے کی ذمہ داری ہے ہمارے علماء اس ذمہ داری کی طرف توجہ نہیں کرتے یہ علماء لوگوں کو پیغمبر کی سنت اور امامت کی حقیقت

اور معنویت اہل بیت کی معرفت، انقلابِ کربلا کی معنویت اور تشیع کی تحریک کی نگری اور علمی بنیادوں سے آگاہی کا فرض پورا نہیں کرتے جیسے ان علماء اور مجتہدین کے خیال میں یہ سب باتیں ان کے شایانِ شان نہیں ہیں بلکہ یہ ان کم علم لوگوں کے فرائض ہیں جن میں اتنی عقلی استعداد نہیں تھی کہ وہ مجتہد کے بلند درجہ پر فائز ہو سکتے۔ نتیجہ یہ کہ ہم نے عوام میں ذمہ داری اور مسئولیت کو بیدار کرنے کا کام دوسرے درجہ کے علماء کے سپرد کر دیا ہے۔

یہی سبب ہے کہ ”عرفت اہل بیت“ اور حقائقِ اسلام کی تبلیغ کا کام مدارسِ قدیم کے ان طلبہ کے ہاتھ میں آ گیا ہے جو علمی اعتبار سے کوئی قابلِ ذکر حیثیت نہیں رکھتے ہمارے نوجوان جب علومِ اسلامی کی تحصیل کے لیے دینی مدارس میں داخل ہوتے ہیں تو ان میں جو اعلیٰ ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں وہ سالہا سال کی محنت اور مشقت کے بعد ”مجتہد“ یا ”فقیہ“ بن جاتے ہیں یہ وہ علماء ہیں جو حوزہ علمیہ میں محصور ہو کر عوام سے کٹ جاتے ہیں۔ وہ طلباء جو منصبِ اجتہاد کے اہل نہیں سمجھے جاتے جن کی ذہنی صلاحیت نسبتاً پست ہوتی ہیں لیکن جنہیں قدرت نے حین اور جویشی آواز دی ہے اور اور جو تقریر اور خطابت کے فن میں آگے بڑھ سکے ہیں انہیں مجبوراً معاشرہ میں دین کی تبلیغ و ترویج کا فرض سونپ دیا جاتا ہے ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو ہر دو قسم کی صلاحیتوں سے عاری ہے وہ نہ ذہنی استعداد میں بلند ہے اور نہ فنِ خطابت سے واقف یہ گروہ تیسرا ستم اختیار کر لیتا ہے یہ چپ سادھ لیتا ہے گنگ ہو جاتا ہے تقدس کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے یہ گروہ موقع اور مصلحت کے لحاظ سے کبھی مجتہدین کے حلقہ میں نظر آتا ہے اور کبھی مبلغین کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

ان حالات میں آپ خود انصاف کیجئے کہ عوام کی تقدیر کا کیا حال ہوگا مذہب اور اس کی حقیقت پر کیا گزرنے لگی؟ اس بات پر بہت زیادہ تفکر اور تردد کرنے

کی ضرورت نہیں ہے یہ تو سامنے کی بات ہے وہ یہ حقیقت ہے جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

کیا سچے کہ وہ ملت جو ایمان و عشق کی دولت سے مالا مال ہے جس کے پاس قرآن ہے۔ پنج البلاغۃ ہے۔ علیٰ اور فاطمہؑ جیسی شخصیتیں ہیں حسینؑ اور زینبؑ جیسے کردار ہیں جس کی تاریخ روشن ہے مگر جس کی تقدیر سیاہ ہے اس قوم کا مذہب اور ثقافت، شہادت ہے مگر یہ قوم پھر بھی مردہ ہے کیوں؟ جون آف آرک کا تعلق فرانس سے تھا وہ ایک حساس لڑکی تھی جو خواب و خیال کی دنیا میں رہتی تھی اس نے خواب دیکھا تھا وہ فرانس میں بادشاہت کے استحکام کے لیے قیام کرے۔ مدتوں فرانس کے دانشور اور چوٹی کے روشن فکر اس تخیلاتی لڑکی کے کردار سے آزادی، اپنا اور انقلابی خیالات کی حرارت حاصل کرتے رہے۔

اب آپ جناب زینبؑ کے متعلق عرض کیجئے کہ جنکی ذمہ داری ایک لحاظ سے امام حسینؑ کی ذمہ داری سے بھی زیادہ سنگین تھی انہوں نے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد پیغام حسینؑ کی اشاعت کی ذمہ داری کو پورا کیا ان کے عملی ہاتھوں میں کر بلا کا انقلابی پرچم ہے اور انہوں نے اس پرچم کو بلند رکھا ایسی حالت میں جب جھوٹ، انکار، فریب اور ظلم کا نظام اس پرچم کو سرنگوں کرنے کے درپے تھا جب انقلاب کے تمام ہر دم رکھنے والے اور گروہ سابقین سے تعلق رکھنے والے مسلمان تک حیرت کا شکار تھے ایسی حالت میں علیؑ کی بیٹی زینبؑ نے ان ہاتھوں میں جو علیؑ کی طرح مضبوط تھا انقلابی پرچم کو اٹھائے رکھا مگر ہم نے اس کردار کو کس طرح پیش کیا ہے۔ ہمارے نزدیک جناب زینبؑ کی حیثیت محض ایک ایسی بہن کی ہے جس کا واحد کام یہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کے علم میں نوحہ و فریاد کرتی رہے۔ !!

میں ایک ایسی مددائے فریاد سن رہا ہوں جو غم و غصہ کا آواز ہے اس آواز

کے مخاطب وہ علماء اور دانشور ہیں جو عوام کے شعور کی تربیت کے ذمہ دار ہیں جو اسلام محمدؐ اور تشیع علیؑ کی تشریح و تبلیغ کے ذمہ دار ہیں مجھے نہیں معلوم کہ یہ صمدائے خشمگین ”حلقہٴ علیؑ“ سے آرہی ہے یا محروم شعور عوام کے دانشور کی گہرائیوں سے بلند ہو رہی ہے۔

یہ آواز سوال کر رہی ہے کہ یہ تم کن کاموں میں مشغول ہو کن باتوں میں پڑے ہوئے ہو آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم اپنی ذمہ داری پوری کیوں نہیں کرتے تم حق بات کیوں نہیں کہتے اس تمام طویل عرصہ میں تم کوئی ایک ایسی کتاب نہیں لکھ سکے جو یہ بتا سکے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے اس کے بجائے تم عشقِ مولا کے نام پر مدح و ثناء قصیدہ و نوحہ کے انبار لگائے جا رہے ہو نہ مے عوام کے درمیان علیؑ کو لب بستر کر دیا ہے وہ لوگ جو فارسی جانتے ہیں اس بات کو کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ علیؑ کا پیغام کیا ہے (اس لیے کہ یہ عربی ہے اور فارسی دانوں کے لیے اس کا فارسی ترجمہ ضروری ہے) (LAMARTINE) لامارتین جو فرانس کا رومانت پسند مصنف ہے اس کی تمام کتابیں فارسی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یونان کی زنِ فاحشہ بلیتیس کے تمام اشعار کا فارسی میں نہایت خوبصورت ترجمہ موجود ہے لیکن علیؑ کا ایک خطبہ یا ان کا ایک قول بھی فارسی میں ترجمہ نہیں ہو سکا۔

آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ ان آئمہ اطہار کے بارے میں جن کی کرامات اور معجزات کا ہم ہر وقت ذکر کرتے رہتے ہیں ان کے یوم ولادت اور یوم وفات پر جشن یا مجلس عزا منعقد کرتے ہیں ہمارے پاس کوئی ایک محترم کتاب نہیں ہے کوئی ایک کتاب ایسی نہیں جو ان کی سیرت اور حالات کی شرح میں لکھی گئی ہو اس بات کا کیا حجاز ہے کہ وہ ملت جو علیؑ کی شیعہ اور ان سے محبت کرنے والی ہے اس کے پاس کوئی ایک رسالہ یا کتاب ایسی نہیں ہے جو یہ بتا سکے کہ علیؑ کون تھے، فاطمہؑ کون تھیں۔ ان دونوں کی سیرت و کردار کے ضد و غالب کیا تھے وہ اور ان کی اولاد کس طرح

رہتے تھے ان کی سوچ کیا تھی ان کا قول اور عمل کیا تھا ہمارے پاس ان،  
موصنوعات پر کوئی ایک تصنیف نہیں ہے۔

ہمارے عوام کہ جن کی تمام زندگی آئمہ کی محبت کے لیے وقف ہے جو ان کے  
مصائب پر رونے کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں جن کی زندگی کے ماہ و سال ان  
آئمہ کی محبت ان کی مدح و ثناء اور ان کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے وقف ہیں  
جو اس کام کے لیے اپنا وقت اور اپنی دولت دونوں خرچ کرتے ہیں جو ان امانوں  
سے ہر طرح خلوص و عقیدت رکھتے ہیں مگر ان کے متعلق کچھ جانتے نہیں یہ وہ  
ہستیاں ہیں جن کی زندگی کا ہر رخ ان کی ہر حرکت اور سکون ان کا تکلم ان کا سکوت  
ان کی آزادی ان کی گرفتاری غرض ان کی تمام زندگی لوگوں کے لیے نمونہ حیات ہے  
پیغام آگہ ہے، عزت آزادی اور احترام انسانیت کا سبق ہے مگر ہم ان زندگی  
بخش اور انسانیت طراز ہستیوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں بس اس قدر کہ  
ہرست امامت میں کس شخصیت کا نام کس شمار پر ہے

اگر ایک شخص روزِ عاشورہ اپنے سروتن پر تلوار کے زخم لگا رہا ہے امام  
حسینؑ کے نام پر زحموں کی تکلیف میں بھی راحت محسوس کرتا ہے لیکن اس کے  
باوجود وہ امام حسینؑ کی صحیح معرفت نہیں رکھتا یا کہ بلا کی مصنویت کو اچھی طرح  
نہیں سمجھتا تو قصور کس کا ہے۔

اگر ایک عورت اپنے وجود کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ جنابِ فاطمہؑ و  
جنابِ زینبؑ کے نام پر گرہ کرتی ہے۔ ان ہستیوں کی یاد اس کی رگ و پے میں  
رچی ہوئی ہے اور اس یاد سے اس کے خون میں حرارت کی ہر دوڑ جاتی ہے جیسے  
اگر اس بات کا اعتبار ہو کہ اس کی جان ان بزرگ ہستیوں کے کسی کام آ سکے گی تو  
وہ ان کے نام پر اپنی جان کا اندازہ بصد خلوص و عقیدت پیش کرنے کے لیے تیار  
ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ان عظیم ہستیوں کی حقیقت سے واقف  
نہیں ہے ان کے احوال سے بے خبر ہے اور ان کے اقوال کا علم نہیں رکھتی تو

ایسا کیوں ہے اگر جنابِ ناظم کے متعلق اس کی معلومات صرف اتنی ہیں کہ ان کے پہلو پر ان کے گھر کا دروازہ گرا یا گیا ہے اور اگر جنابِ زینب کے بارے میں اس کا علم عین صبحِ عاشور سے عصرِ عاشور تک محدود ہے وہ ان کے بارے میں صرف اس قدر جانتی ہے کہ وہ ایک مظلوم اور غمزدہ عورت تھیں جسے اپنے بھائی کی لاش کو تلاش کرنے کے لیے خیمہ سے نکلنا پڑا اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتی۔ وہ پیغامِ حسینؑ کی تبلیغ و اشاعت کے بارے میں ان کے کردار سے ناواقف ہے وہ عصرِ عاشور کے بعد انہیں کم کر دیتی ہے تو اس میں قصور کس کا ہے اور اگر اس مردِ عقیدت مند کا باشعور اور تعلیم یافتہ بیٹا اور اگر اس نین خوش عقیدہ کی پڑھی لکھی اور روشن فکر بیٹی یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر یہ مذہبِ گمراہ و عزاداری یہ دینِ نوح و بکا، ہمارے کس کام کا ہے؟ آخر فاطمہؑ حسینؑ اور زینبؑ کی محبت اور ان کی یاد میں گریہ و بکا ہماری قوم کے جو غلام اور پسائیدہ ہے اور جسے آگاہی اور آزادی دشمن قوتوں سے مقابلہ کرنے کی توانائی کی ضرورت ہے، کس کام آتی ہے۔ اگر ہماری نسل کے دماغ ان سوالوں کے بارے میں صاف نہیں ہیں تو قصور کس کا ہے۔

اور اگر وہ روشن فکر اور آزادی پسند طبقہ جو عوام کی محرومی اور پسماندگی پر رنجیدہ ہے۔ جو عوام میں بیداری اور جوشِ عمل کا خواب دیکھ رہے جو اپنے اجتماعی حالات کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں مگر جو اپنے مذہب اور تاریخ سے آگاہ نہیں ہے جو (اپنے ماحول سے متاثر ہو کر) اسلام کو مدینہ، خانہٴ فاطمہؑ شہادت گاہِ حسینؑ اور کاروانِ زینبؑ سے اخذ کرنے کی بجائے اسے اصفہان، تہران، مشہد اور قم میں تلاش کرتا ہے اور عزاداروں، تکیوں اور خانقاہوں کو دینِ کام کر سمجھتا ہے وہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ ہمارے طبقہٴ نسواں کے لیے جو محرومی، جہالت اور پسماندگی کا شکار ہے اور جسے آزادی آگاہی اور بصیرت کی ضرورت ہے آخر یہ مذہب جو بظاہر ماضی کا افسانہٴ غم ہے اور جو صرف تاریخ

کے گزرتے ہوئے واقعات پر نفرت اور ملامت کا اظہار ہے اور جو صرف جذبات  
محبت نفرت کے رسمی اظہار کا مجموعہ ہے کس مرض کی دوا ہے یہ ہمارے کس  
دکھ کا مداوا کرتا ہے یہ ہماری عملی زندگی پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے تو قصور  
کس کا ہے؟ بات یہ ہے کہ ہم نے دین کو محض قطعہ ماضی سمجھ لیا ہے اور حال  
سے اس کا رشتہ توڑ لیا ہے۔ ہم محض ماضی کے چند واقعات کی یاد منظرِ ماضی  
ہو جاتے ہیں اور ان واقعات میں جو درسِ عمل اور پیغامِ انقلاب ہے اس  
کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ہم نے مذہب کو واقعات و حوادث کا مجموعہ  
بنادیا ہے ایسے واقعات و حوادث جو صرف ماضی سے متعلق ہیں اور جو ہمارے  
موجودہ حالات کو بدلنے کے لیے کوئی تحریک فراہم نہیں کرتے اس سے بھی بڑھ  
کر سنگین اور اتنا سنگ بات یہ ہے کہ ہم نے ماضی کی یاد کو حال کو فراموش کرنے  
کا ذریعہ بنالیا ہے ہمارا مذہب ہمیں موجودہ حالات سے بیگانہ بنا کر ہماری تمام  
توجہ ماضی کی ان واقعات کی طرف منططف کر دیتا ہے جو صدیوں قبل ایک اجنبی  
اور بیگانہ سرزمین پر رونما ہوئے ہیں۔ ہم اپنے دور میں ہونے والے ظلم و ستم سے  
غافل ہیں۔ ہم اجتماعی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے۔ ہمارا معاشرہ غلامی  
کے طوق میں جکڑا ہوا ہے لیکن ہم اپنی گردن میں اس طوق کی سختی اور ایذا  
محسوس نہیں کرتے ہمارا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ ہم ماضی کے واقعات پر غم  
و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم جب بیٹھتے ہیں کہ خلیفہ نے ایک بیمار کی گردن  
کو طوق میں جکڑ دیا تھا تو ہمارا خون گھولنے لگتا ہے ہم اپنی تلوار کو بے نیام  
کرتے ہیں لیکن اس کا ہدف خود ہمارا سر ہوتا ہے ہم خود کو زخمی کرتے ہیں۔  
یہاں تک کہ ہم پر از خود رفتگی اور بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے پھر اس کے  
بعد ہمارا دل مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس طرح ہمارے تمام گناہ دھل گئے تمام  
خطائیں معاف ہو گئیں۔ ہمارے شانوں سے تمام ذمہ داریوں کا بوجھ اتر گیا۔  
ہم اس خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ اس مختصر عملِ اجر ہی کے ذریعہ ہم نے



عدل الہی کے قانون کو بدل دیا ہم نے مکافاتِ عمل کی میزان کو منقلب کر دیا اس خون کے ساتھ جو ہمارے سر سے بہا ہے ہمارے نامہ اعمال کی تمام سیاہی دھل گئی۔ اب ہمارے گناہ خواہ ان کا شمار آسمان کے ستاروں، دریا کی موجوں اور صحرا کے ریت کے ذروں سے بھی زیادہ ہو ویکسر معاف ہو گئے اب ہم ایسے ہو گئے جیسے کہ وہ طفل جو اپنی رحم مادر سے برآمد ہوا ہو۔ نہ صرف یہ کہ ہمارے گناہ معاف ہو گئے بلکہ شاید یہ بھی کباب اللہ اور رسولؐ پر ہمارا احسان بھی ہو گیا ہے وہ غلط اندازِ نظر ہے جس کی وجہ سے ہم نے اپنے مذہب کو جو لوگوں کو شعور آگئی کا پیغام دیتا ہے ان میں ذمہ داری اور مسئولیت کا احساس پیدا کرنا ہے جو امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد و شہادت، ایشاد و انفاق اور قیامِ عدل و تردیدِ ظلم سے عبارت ہے ایک ایسے محبوب و رسوم میں تبدیل کر لیا ہے جس کے معنی گریہ و بکا نا، وشون، توسل و تقیہ، بے معنی انتظار، بے اصولی شفاعت اور بے مقصد تملیف و تحمیل اور طعن و لفرین بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہمارے آئینہ کا کام فقط اتنا ہے کہ وہ دوسری دنیا میں ہماری دستیگری کریں یہیں عذابِ جہنم سے بچائیں ہمارے گناہوں کو بخشائیں اور ہماری شفاعت کریں ہم ان آئینہ ہدایت سے اپنی دنیا اور دنیاوی زندگی کی اصلاح کے لیے کوئی سبق نہیں لیتے نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے محام کمزوری، درماندگی اور بیچارگی کا شکار ہیں اور اسی کو اپنی تقدیر سمجھ کر مطمئن ہیں وہ غفلت کا شکار ہیں وہ ظلم و ستم کو سہتے ہیں اور اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی ضرورت سے غافل ہیں۔ وہ دلیل نہیں، پیمانہ نہیں، کمزور ہیں وہ اپنے حالات کو بد لنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتے وہ ہر عمل اور ہر اقدام سے مایوس اور بے نیاز ہیں۔ مگر اس صورتِ حال کی ذمہ داری کس پر ہے قصور کس کا ہے؟

اگر ہمارے عوام کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف ”حبِ علیؑ یا ولایت علیؑ“ کا ایسا اعتقاد جو معرفت اور عمل سے تہی ہے کوئی ایسی کیمیائی تاثیر رکھتا ہے کوئی

ایسا جادو ہے جو بانیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے اگر ان کے نزدیک آیت قرآنی ”ان کی برائیاں (سئیات) نیکیوں (حسنات) میں تبدیل کر دی جائیں گی“ کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ انسان اس دنیا میں کتنے ہی گناہ کرے قیامت میں اس کی یہ برائیاں اچھائیاں بن جائیں گی۔ بالفاظ دیگر اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خواہ انسان اس دنیا میں کتنے ہی گناہ کرتا ہے محض حبِ علی قیامت میں اس کے لیے ثواب اور بخشش کی ضمانت ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟

اگر ولایت و امامت علیؑ کا عقیدہ جو صدیوں سے ایک عظیم انقلابی تحریک کی علامت ہے ایک ایسی تحریک جو قیامِ عدل و آزادی اور ظلم و استبداد کے خلاف جنگ اور جہاد کی تحریک ہے جو درحقیقت لوگوں کے لیے آگاہی اور بیداری کا پیغام ہے آزادی مساوات، انصاف اور احترامِ انسانیت کا پیغام ہے جو ایک کامل فرد اور ایک صالح معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد کا پیغام ہے جو استبداد، استحصا اور طبقاتی تضاد کو رد کر کے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی دعوت دیتا ہے جس کی بنیاد عدل و احسان پر ہو۔ ولایت و امامت علیؑ کا عقیدہ جو نکر و عمل میں انقلاب برپا کر کے فرد اور معاشرے کی حالت بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ہم اس عقیدہ کے انقلابی ثمرات سے محروم ہیں اور اگر ہم نے علیؑ اور فاطمہؑ اور دیگر ائمہؑ کی پیروی کی قدر و قیمت اس کے اثرات و ثمرات کو اس دنیا کی بجائے صرف آخرت سے متعلق سمجھ رکھا ہے بالفاظ دیگر اگر ہم نے امامت کے دائرہ کار و اس کے اثرات کو اس دنیا کی بجائے اس دنیا میں مستقل کر دیا ہے اپنی زندگی سے اس کا تعلق ختم کر کے اسے صرف جہاد بعد الموت کے مسائل تک محدود کر دیا ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟

اگر ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی زندگی، اپنے حالات، اپنے طریقہ فکر اور اپنے معاشرے کو بدلنے میں اس خاندان کی محبت کے زندگی بخش اور انقلاب آفرین اثرات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور اگر ہماری جدید نسل اس بے عملی اور

بے اثری سے بد دل ہو کر مذہب سے مایوسی اور اس عظیم خانوادہ سے بے تعلقی کا شکار ہو رہی ہے تو قصور کس کا ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہمارے اہل فکر و نظر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اگرچہ کہ مسلم معاشرہ ہے ایک ایسا معاشرہ ہے جو ولایت علیؑ امامت ائمہ اطہار اور مودت خانوادہ رسولؐ پر اعتقاد رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے دیگر معاشروں سے خواہ وہ مسلم معاشرے ہوں یا غیر مسلم خواہ ولایت علیؑ پر اعتقاد رکھتے ہوں یا نہ کریں امامت و ولایت ہوں خواہ وہ مادی معاشرے ہوں یا غیر مذہبی معاشرے، تمدن، ثقافت مادی معیار زندگی ہر اعتبار سے پست تر ہے تو اس اعتراض کا جواب کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض دیگر معاشرے بھی، بیرونی استعمار، تاریخی استبداد اور دیگر عوامل انحطاط کی زد پر رہے اور بعض حالات میں یہ عوامل نسبتاً زیادہ گہرے اور زیادہ شدید تھے لیکن باوجود اس کے کہ وہ حب علیؑ عزاداری حسینؑ انظار امامؑ موجود اور فقہ جعفری کے اصولوں سے نا آشنا اور بے بہرہ تھے مگر انہوں نے ان منفی اور عوام دشمن طاقتوں کا مقابلہ زیادہ ہمت اور جرات سے کیا اور وہ عدل و انصاف اجتماعی اور عمومی اخلاق، انسانی آزادی اور احترام، تلاش حقیقت، اجتہاد علم، پاکیزگی فکر و نظر، غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ہر سطح پر ہم سے بہتر نظر آتے ہیں وہ جہاد زندگی میں کامیاب اور تعمیر و ترقی کی راہ میں ہم سے آگے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ہماری پستی اور درماندگی میں قصور کس کا ہے؟

## باب سوم

### مسائل کا تجزیہ

#### اصل خانی کہاں ہے؟

اگر ہماری ملت ولایت و امامت علیؑ کی معتقد اور خاندانِ رسالت سے محبت کی دعوت دہار ہونے کے باوجود ذلت اور مسکنت کا شکار ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اصل خانی کہاں ہے؟

— کیا یہ پاک اور بزرگ خاندان بے فیض و اثر ہے؟

— یا ہماری نئی نسل کے روشن فکر طبقہ نے معاملات کا غلط تجزیہ کیا ہے

— یا ہمارے مذہبی عوام نے اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کی ہے!

علیؑ حقیقت کا روشن ترین مظہر ہیں وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں۔ ایک مکتب فکر ہیں۔ وہ انسانیت کے تصور کمال اور ارتقاء کی تجسیم ہیں۔

وہ ایک اساطیری واقعیت ہیں ایک دیومالائی پیغمبر ہیں۔

وہ ایک ایسے انسان ہیں جیسا کہ ایک مثالی انسان کو ہونا چاہیئے مگر جیسے مثالی انسان واقعیت کی دنیا میں ہوا نہیں کرتے۔

اور ان کی زوجہ فاطمہؑ ایک آئیڈیل (مثالی) عورت کا نمونہ ہیں، کامل

اور پاکیزہ ترین نمونہ۔ یہ ارتقاء کی وہ آخری ممکنہ حد ہے جس تک ایک مثالی عورت پہنچ سکتی ہے مگر جس تک رسائی کسی دوسری عورت کے لئے ممکن نہیں ہے۔

اور حسینؑ اور زینبؑ ایسے مثالی بہن اور بھائی ہیں جو تاریخ میں ایک بے مثال انقلاب کی علامت ہیں ایک ایسا انقلاب جس نے ظلم و استبداد اور مکرو فریب کو رسوا اور ذلیل کر کے انسانیت کی حرمت اور آزادی کا پرچم سر بلند کیا یہ گھر یہ علیؑ اور فاطمہؑ کا گھر درحقیقت دُکعبہ ہے جہاں ابراہیمؑ کی،

اولاد اور ان کے وارث مقیم ہیں کعبہ ایک علامت ہے اور یہ گھر ایک حقیقت۔ وہ گھر پتھروں کی عمارت ہے یہ گھر انسانوں سے عبارت ہے اسی گھر کے گرد صرف مسلمان طواف کرتے ہیں لیکن یہ گھر ہر اس دل کا کعبہ ہے جو انسانیت کے حسن اور جمال سے محبت رکھتا ہے جو انسانیت کی نجات کے لیے آزادی، عدالت، عشق، اخلاص، تقویٰ اور جہاد کی قدروں پر یقین رکھتا ہے اور جو اصول شہادت کو انسانیت کی زندگی کی ضمانت سمجھتا ہے۔

آئیے اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں تاریخ کے اس تمام طویل عرصہ میں وقت کی اس دشوار اور آشفتمعافت میں جب تاریخ شہنشاہوں کا دم بھرتی نظر آتی ہے جب تمدن و ثقافت، ادب و ہنر، علم و دانش اور مذہب و سیاست بادشاہوں اور ان کے محلات کے گرد چکر نظر آتے ہیں ہمارے باشندے وفادار اور فضیلت شناس عوام ہمیشہ اس گھر کی حرمت اور عظمت کے معترف نظر آتے ہیں اور وہ اس خاندان سے جسے محروم و مظلوم بنا دیا گیا ہے اور جو مکرو فریب کا شکار رہا ہے ایک ایسی وابستگی اور عقیدت کا اظہار کرتے رہے ہیں جو ناقابل شکست ہے جو دائمی اور ابدی خیر و وفا ہے وہ اپنی تمام آرزوئیں اور خواہشات، ایمان اور جذبہ، فکر و نظر غرض اپنا تمام سرمایہٴ حیات ان ہستیوں پر بچھا دے رہے ہیں اور آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی زبانیں ان کی مدح و ثنا، میں مشغول، ان کے دل ان ہستیوں کی یاد میں بے تاب اور ان کی آنکھیں ان کے غم میں اشکبار ہیں اور وہ اپنے آئمہ کے نام پر جہان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔

درا دیکھئے تو ہسی کر یہ بھوکے اور غریب عوام اپنے محبوب خانوادہ کے ایک ایک فرد سے عقیدت اور محبت کے اظہار کی نشانی کے طور پر کیا کچھ نہیں کرتے رہے اور کیا کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہیں آخر اس راہ میں انہوں نے کون سا دقیقہ فرو گذاشت کیا ہے۔

کبھی کبھی 'حبیب' 'جبین' کے مقابلے میں ایمان اور اخلاص کی بہتر نشاندہی کرتی ہے بالفاظ دیگر ایمان اور اخلاص کی گہرائی کا اندازہ کرنا ہے تو دیگر عوامل کے مقابلہ میں مالی ایثار ایک بہتر پیمانہ کا کام دیتا ہے اس لحاظ سے درا ان تمام اوقات اور وسائل نذر و نیاز کا اندازہ لگائیے جو اس خاندان کے نام پر خرچ کئے جاتے ہیں آج کے دور میں جب مادیت کا رجحان قوی اور مذہبی جذبہ کمزور ہوتا جا رہا ہے جب اقتصادی جذبہ غالب جذبہ بن گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ ہمارے عوام افلاس اور تنگدستی کا شکار ہیں ان کے لیے خود اپنی غذا اپنے بچوں کے لیے دودھ کی فراہمی اور بیماروں کے لیے علاج کا مسئلہ زندگی کا سب سے بنیادی اور سنگین مسئلہ بن گیا ہے اس کے باوجود ان ایام میں جو ان ہستیوں کی یاد منانے کے لیے مخصوص ہیں دس لاکھ (ایک ملین) سے زیادہ مجالس ان کے نام پر منعقد کی جاتی ہیں مختلف درجات کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ مذہبی علماء اور ستر ہزار سے زیادہ روحانہ خواں مدارج، نوہ خواں وغیرہ جن کا کام ان بزرگ ہستیوں کی یاد تازہ کرنا ہے کی تمام معاش ان رقم پر منحصر ہیں جو مذہب کے نام پر عوام خرچ کرتے ہیں علاوہ ازیں امام بارگاہوں (حینیہ) اور خانقاہوں (بیکہ) کی تعمیر بھی انہی رقم سے کی جاتی ہے ماتمی دستوں اور انجمنوں کی تشکیل اور ان کے اخراجات بھی اسی رقم سے پورے ہوتے ہیں اس کے ساتھ ہی مجلسوں کے تبرک اور طعام پر بے اندازہ رقم خرچ ہوتی ہے پھر وہ رقم بھی ہے جو خمس، سہم، امام، صدقات اور خیرات کے نام پر نکالی جاتی ہے اور اس کثیر اور خطیر رقم کا حساب لگانا مشکل ہے، مذہب کے نام پر ہمارے عوام کے

مالی ایشار کی اہمیت اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری قوم اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ہے۔ ہم نہایت غریب لوگ ہیں ہماری فی کس آمدنی دنیا کے بیشتر ممالک کے مقابلہ میں بہت کم ہے اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری قوم معاشی اعتبار سے زبردست طبقاتی تضاد کا شکار ہے ہمارے قومی سرمائے کے نصف پر تقریباً چند ہزار افراد قابض ہیں ہماری کل آمدنی کا دو تہائی (۲/۳) حصہ ہماری مجموعی آبادی کے بڑے حصہ کے تصرف میں ہے۔

عاشی کے برعکس اب دولت پرانے جاگیرداروں اور تاجروں کے ہاتھ سے نکل کر جدید سرمایہ داروں، صنعت کاروں اور لبرل روائی طبقے کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے اور سرمایہ (روپیہ) جو پہلے دھات کے سکوں کی شکل میں ہوتا تھا اب کرنسی نوٹوں کی صورت میں تبدیل ہو گیا ہے پہلے اس سرمایہ کی جگہ دکانیں بازار دستکار، صراف، اہل حرفت اور اہل محنت کے ٹھکانے تھے اب اس کی جگہ بینک اسٹاک ایکسچینج، بیرونی کمپنیاں، تجارتی اور صنعتی ادارے اور شرائکتیں اور کارخانے ہو گئے ہیں یہ نو دہائی طبقہ مغرب زدگی کا شکار اور مذہب سے بے زار ہے اور اگر اس طبقے کے کچھ افراد مذہبی جذبات اور میلانات رکھتے بھی ہیں تو پھر صمدت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب کو مغربی رنگ میں رنگ لیا ہے ان کے تمام آداب و رسوم، طو طریقے، مذہبی شعائر اور معمولات مغرب کے سانچے میں ڈھل گئے ان کا اسلام، بقول سید قطب، امریکی اسلام ہے ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کو ہر قسم کی ذمہ داری، ایشار اور عمل کی رحمت سے بے نیاز کر دیتا ہے یہ بے مسئولیت بے رحمت اور بے خرچ اسلام ہے اس امریکی اسلام کے پیروکار مذہب پر بیشتر تکیہ چینی کرتے ہیں، نظریاتی بحثیں کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر بزم خود دانثوری فرماتے ہیں روشن فکر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کی نئی نسل، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، سوشلزم، لیننزم، پیورس، انگلستان، امریکہ اور آسٹریا جیسے مقامات پر ناٹ کلبوں، رقص گاہوں اور عشرت کردوں میں بے تحاشہ روپیہ خرچ کر کے داد

عیش دیتی ہے۔

یہ مغرب زدہ حضرات اپنی بیگمات کے ہمراہ سال میں ایک دو بار مغربی ملکوں کا چکر لگاتے ہیں۔ یہ اپنے ساتھ بے اندازہ دولت لے جاتے ہیں جو بازاروں اور تفریح گاہوں میں پانی کی طرح بہائی جاتی ہے اس طرح یہ دولت بڑی آسانی سے مغربی سرمایہ داروں کی جیبوں میں منتقل ہو جاتی ہے، یورپ کے عیار تاجر اور عیاشی کے اڈوں کے نگراں انہیں دودھ دینے والی گائیں سمجھتے ہیں انہیں پس ماندہ ملکوں سے آئے ہوئے ایسے گدھے تصور کرتے ہیں جن کی جیبیں دولت سے بھر ہیں اور جو اس دولت کو یورپی رقاصہ آؤں کے عشوہ واد پر بچھاؤں کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا تعلق ایک ایسے ملک سے ہے، جو پس ماندہ، غریب اور افلاس زدہ ہے اور جب ان کی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں تو پھر وہ اپنے وطن لوٹ آتے ہیں تاکہ وطن عزیز میں ایک بار پھر استحصال، مکر اور ریاکاری کے ذریعہ اپنے لیے دولت اکٹھا کریں اور پھر اس دولت کو لے جا کر مغربی سرمایہ کاروں کے حوالے کر دیں ایسے لوگ اپنی زندگی کو اسی بدش پر ڈھال لیتے ہیں اور اسے ترقی، تہذیب، اور شائستگی کا نام دے کر خود کو بڑا مہذب اور کچھڑ سمجھتے ہیں

دوسری طرف ایک ایسا شخص جو کسان یا دست کار یا متوسط درجہ کا تاجر ہے اپنی پوری زندگی میں صرف ایک بار حج یا زیارتِ کربلا کے معنی کی نیت کر سکتا ہے وہ تمام زندگی کی محنت اور کوشش کے نتیجہ میں صرف ایک بار سفر کرنے کی ہمت کر سکتا ہے اس کے لیے حج یا زیارت کے لیے سفر کرنا اس کی پوری زندگی کا حاصل ہے ہی سفر اس کے لیے تفریح بھی ہے، سیاحت بھی ہے، فریضہ کی ادائیگی بھی ہے یہی وہ واحد رابطہ ہے جو اس کے اور بیرونی دنیا کے درمیان ممکن ہو سکتا ہے یہ اس کے ایمان اور عقیدے کی تجدید اور جلا اور اپنی تاریخ اور ثقافت سے وابستگی کا ذریعہ ہے یہی وہ سفر ہے جس کے ذریعے وہ اپنی محبوب شخصیتوں کے مزارات کی زیارت کر کے اپنے عشق و ایمان کی تجدید کر سکتا ہے اپنی روح اور



قلب کو تازگی اور سکون بخشا ہے اور اسی سفر کے ذریعے وہ اپنے تمدنی اور فنی آثار کا مشاہدہ اور مطالعہ کر سکتا ہے عرفی یہ سفر اس کے لیے مذہبی فکری ثقافتی، تاریخی اور سماجی ہر لحاظ سے گوناگوں فوائد کا حامل ہے لیکن وہ اس سفر کے لیے تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ قصد کر سکتا ہے اس لیے کہ اس کی جیب میں اس سفر کا بار برداشت کرنے کی اہل نہیں ہے اس ایک سفر جج و زیارت کے لیے بھی اسے ایک طویل مدت تک رقم پس انداز کرنا پڑتی ہے کسی نہ کسی طرح وہ پانچ ہزار تومان پس انداز کرتا ہے اس میں سے تین ہزار تومان تو آمدورفت کے کرائے میں خرچ ہو جاتے ہیں، ہزار تومان سے وہ مختلف تبرکات و تحائف خرید کر اہل وطن کے لیے ہمراہ لے آتا ہے اور ہزار تومان زادہ راہ کے طور پر استعمال کر لیتا ہے ان سے مسافرانہ کارا یہ، لیسوں کا کارا یہ اور روزانہ کی خورد و نوش کی قیمت ادا کرتا ہے خیال ہے کہ یہ رقم اس رقم سے کہیں کم ہوتی ہے جو کوئی ایک مغرب زدہ جوڑا . . . . . کسی ایک سات میں فحیہ خانوں میں لٹا دیتا ہے کیا پھر اپنے ایک پر تکلف ناشتر پر خرچ کر دیتا ہے ایک طرف تو اس خورد و لے طبقے کے افراد مغرب زدہ جدیدیت اور ترقی یافتگی کے نام پر ملکی سرمایہ کو اپنی عیاشی پر خرچ کرتے ہیں اور دوسری طرف نام نہاد دانشوری اور روشن نمکری کے نام پر جب وہ غریب عوام کے مسائل پر اظہارِ خیال فرماتے ہیں تو پھر انسانی اقدار، اقتصادی اور طبقاتی مسائل، اجتماعی ہمدردی اور ملکی ترقی کے موضوعات پر ایسے ترقی پسند خیالات و افکار کا اظہار فرماتے ہیں جنہیں سن لے تو بچی گیارہ جیسا انقلابی بھی دم بخود ہو جاتے۔

اس وقت ہماری عام اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے عوام پریشانی اور بھوک کا شکار ہیں اور ان کی پریشانی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف ایک نو دہائی طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے چھوٹے جاگیردار ناجراور پرانے امراء کا طبقہ اس نئے ابھرنے والے طبقے کے مقابلہ میں پسماندہ اور کمزور ہوتا جا رہا ہے دولت کی تقسیم کا توازن بدل رہا ہے پرانا طبقہ امراء اب

نسبتاً کمزور ہو گیا ہے انہیں کے اکثر لوگ اپنی پرانی حالت پر برقرار ہیں جبکہ اس طبقہ کی اقلیت اپنی حالت بدل کر نو دولت طبقہ میں شامل ہو رہی ہے گویا دولت کی تقسیم کے لحاظ سے اس وقت معاشرے میں دو واضح طبقات ہیں طبقہ جدید اور طبقہ قدیم جس کے افراد مذہبی عقائد اور شعائر سے وفادار ہیں معاشرہ کی اس اقتصادی و معرطنی اور محسوس درجہ بندی کے مطابق وہ لوگ جو مذہب سے وفادار ہیں ان کا تعلق اس روایتی اور قدیم طبقہ سے ہے جو اقتصادِ اعتبار سے، پسماندہ ہے ارتیزی سے صنوف اور اغلاط کا شکار ہو رہا ہے اس کے باوجود مذہب کے نام پر مجالس و محافل کے انعقاد، دینی مدارس کے قیام اور روحانیوں کے اخراجات کی مد میں جو رقم خرچ کی جا رہی ہے دیگر مذہبی شعائر اور حوزہ علیہ کے لیے جو صرف کیا جا رہا ہے وہ اس بات کا روشن ترین ثبوت ہے کہ ہمارے عوام کا مذہب سے کس قدر گہرا تعلق ہے پیغمبر کے خاندان سے ان کی عقیدت کس قدر پائیدار عمیق، پرفلوس اور ناقابل شکست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندانہ پیغمبرؐ و علیؑ سے ہمارے عوام کی عقیدت اور محبت کی گہرائی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔

گفتگو کے اس مرحلہ پر پھر وہی سوال کہ اگر ہماری قوم دلت اور مسکنت کا شکار ہے تو اس میں قصور کس کا ہے پوری شدت اور سنگینی کے ساتھ ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا ہے ہر باشعور شخص جس نے اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے گہری فکر و نظر اور منطقی تجزیہ کے ذریعہ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے وہ رفتہ رفتہ چند بدیہی اور متعارف حقیقتوں تک پہنچتا ہے اور وہ حقیقتیں مختصراً درجہ الترتیب اس طرح بیان کی جاسکتی ہیں۔

سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دین یعنی اسلام تاریخ کا سب سے آخری مذہب اور سب سے زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ مکتب فکر ہے اور محمدؐ قرآنِ عترت اصحاب و تاریخ اسلام ایک باعزت، باشعور، مہتمم

ہند، متحرک، پرشکوہ اور ہر لحاظ سے ترقی پذیر زندگی کا سبق دیتے ہیں اس دین کا عقیدہ توحید انسان کی اجتماعی وحدت کی اساس ہے اور رسالت کا مقصد اجتماعی زندگی کو عدل کی بنیاد پر قائم کر کے ایک ایسی امت کی تشکیل کرنا ہے جس کا ہر فرد جذبہ شہادت سے سرشار ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا مذہب، مذہب تشیع، مذہب امامت و عدل، علیؑ اور اولاد علیؑ کی پیروی کا مذہب ہے اس مذہب کی تاریخ چار مسلسل کی تاریخ ہے ایک ایسی تاریخ ہے جو انیثار و قربانی کے جذب سے سرشار ہو یہ آزادی کے لیے جنگ کرنے اور آزادی اور انصاف کی دشمن قوتوں سے منہیات نہ کرنے کی تاریخ ہے یہ ایک ایسی تاریخ ہے جس کا طرہ امتیاز ظلم و استبداد و جور و ستم نفرت اور تعصب کے خلاف مسلسل جنگ ہے اس تاریخ کا امتیاز ان تمام قوتوں سے مسلسل اور پیہم لڑائی ہے۔ جو تعصب، حق، مسخ حقیقت، سیاسی جبر، اقتصادی استحصال اور روحانی استبداد کی علامت ہیں علیؑ اور حسینؑ اور زینبؑ پر ایمان عدل و برتری معصوم، اجتہاد و جہاد، فلسفہ شہادت اور فلسفہ انتظار عرض تشیع اور اس کے تمام اصول ہر لحاظ قیام عدل کے لیے جدوجہد کا پیغام ہیں۔

حقیقت کا ایک اور رخ یہ ہے کہ ہمارے عوام جن کو ایمان کی حرارت اور عشق کا سوز و گداز حاصل ہے خاوندانہ نبیؐ و علیؑ سے ایک ایسی والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے ہیں جو محض رسمی مذہبی اعتقاد سے کہیں زیادہ ہے ان بہتوں کا نام ان کی روح کو تازگی بخشتا ہے اور ان کی یاد ان کی رگوں میں لہو کو گرم کر دیتی ہے وہ ان کے قدموں پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں وہ اپنی محبوب بہتیوں کی خاطر قربانی پیش کرنے کے آرزو مند ہیں وہ اس علم میں کہ وہ عاشقوں کے خونین دن کیوں موجود نہ تھے نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ خون کے آنسو بہاتے ہیں اور غم سے بے حال ہو کر دیوانہ وار اپنے سراور چہرے کو تیغ و خنجر سے زخمی کر لیتے ہیں اور تمام سال ان کے غم میں غمگین اور ان کی یاد میں

سوگوار رہتے ہیں تمام سال ان کے حالات واقعات کی فکر و جستجو کرتے ہیں ان کی مدح و ثناء اور تعریف و توصیف میں اپنی زبانوں کو مصروف رکھتے ہیں ہم ایک ایسی قوم ہیں جو عشق کے جذبہ سے سرشار، سراپا سیاہ پوش، سراسر اشک و درد میں غرق اور اپنی روح کی تمام توانائیوں کے ساتھ جانا بازی اور قربانی کے لیے آمادہ اور شدت عشق سے بے حال، بے تاب اور آشفٹ ہے

اس ضمن میں ایک اور واضح حقیقت یہ ہے کہ ہمارا موجودہ دانشور طبقہ روشن فکر نسل، حساس، اور بیدار ہے وہ تاریح، عالم تقدیر جہاں اور اپنی ملت کی حالت سے بخوبی آگاہ ہے وہ زمانہ کی رفتار سے آشنا اور اس کے تقاضوں سے باخبر ہے اور ایک مثبت اور فعال سوچ رکھتی ہے اس کی فکر انقلابی اور اس کا ایمان پر جوش اور متحرک ہے یہ دانشور اپنے عوام کی بیداری کے نقیب ہیں لوگوں کو آزادی اور عمل کا پیغام دیتے ہیں۔ انہیں ذمہ داری اور مسئولیت کے شعور کو بیدار کرتے ہیں وہ ان ذمہ داریوں سے اچھی طرح باخبر ہیں جو کسی معاشرے میں دانشور طبقہ پر عائد ہوتی ہے اور نہ صرف یہ کہ اپنی ذمہ داریوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں بلکہ عملاً ان ذمہ داریوں کو بطریق احسن پورا کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر ہماری ملت کی حالت اس قدر افسوسناک کیوں ہے وہ تمام عناصر جو ملت کے لیے زندگی، بیداری اور قوت تعمیر و ترقی بخش سکتے ہیں آخر بے اثر کیوں ہیں۔ ان کا ہماری زندگی اور حالات پر کوئی اثر کیوں مرتب نہیں ہوتا دین مذہب طبقہ دانشوراں (روشن فکر) اور عوام کہیں کوئی کمی یا خرابی نہیں ہے پھر ملی صورت حال اس قدر خراب کیوں ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے کہ ہماری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو جو ہمارے ایمان اخلاقی اور وفاداری کی علامت ہیں اور ہمارا ایمان جو ان معانی سے متعلق ہے جو زندگی اور آزادی سے لبریز ہیں اور ہمارا عشق جو ان ہستیوں سے ہے جو انسان کی عظمت و جلالت کا شاہکار ہیں ہمارے لیے بے غم اور بے نتیجہ ہے ہم مومن و

عاشق ہیں لیکن ہمارا ایمان اور ہمارا عشق ہمارے مسائل کو حل کرنے میں کوئی  
مدد نہیں کرتا۔ مگر کیوں؟

ہمارا دین - دین نجات ہے - ہمارا مذہب - مذہب عدالت ہے ہمارا  
طبقہ دانشوراں (روشن فکر) بیدار اور ذمہ داری کے احساس سے سرشار ہے  
ہمارے عوام مومن ہیں - سچے اور غلط مومن اور عاشقان صادق اس کے باوجود  
ہم در ماندہ مفلس، عزیز اور جہالت کا شکار اور ترقی کی دوڑ میں بہت  
سی قوموں سے پیچھے ہیں - ایسا کیوں ہے - قصور کس کا ہے؟

ایک لفظ میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قصور وار "عالم" ہیں  
لیکن کیسے؟ اس لیے کہ اسلام محمدؐ و راہ علیؑ کا حقیقی پیروں ہمارے  
ایمان کے بے شمار بے نتیجہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم دراصل ان  
عظیم ہمتیوں کو پہچاننے سے معذور اور محروم ہیں۔

ہمیں ان سے عشق ہے لیکن ہم ان کا شعور نہیں رکھتے -  
ہم ان سے محبت کرتے ہیں لیکن ہمیں ان کی معرفت حاصل نہیں ہے -  
ہمارا دین جو حقیقتاً حیات تازہ بخشنے والا دین ہے - اگر ہمیں زندگی نہیں  
بخشتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم اس دین پر رسمی ایمان رکھتے ہیں مگر اس دین  
کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں اور دین کی حقیقت سے آگاہی عطا کرنے  
کی ذمہ داری کسی پر عائد ہوتی ہے - دینی شعور کی تربیت کا ذمہ دار کون ہے؟  
"در عالم"

یہ عالم کافر بنی تھا کہ وہ لوگوں کو علیؑ اور ان کے پیغام فکر سے  
آگاہ کرتا۔

عالم علم فقہ

اسلام کے لغت میں عالم، دانندہ ہے تعبد یعنی کسی ایسے شخص کو نہیں

کہتے جس نے کچھ کتابیں تو پڑھ رکھی ہوں مگر جو اپنی معاشرتی اور اجتماعی ذمہ داریوں کے عہد کو پورا نہیں کرتا اسلام کسی ایسے شخص کو عالم نہیں تسلیم کرتا جو محض صاحب معلومات ہو جس کے ذہن میں معلومات اور اطلاعات کا دھیر تو جمع ہو مگر جس کا دل بے نور ہو دراصل علم ایک نور ہے۔ نور خداداد۔ اور عالم کا دل اس نور کے پر تو سے منور ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”علم ایک نور ہے۔ جسے اللہ جس قلب میں چاہتا ہے روشن کرتا ہے۔ حضور کا یہ ارشاد پر اسرار اور ہم نہیں ہے یہاں علم سے مراد محض علم لدنی، علم اشراق یا عرفانی نہیں ہے اسی طرح یہاں علم سے مراد طبیعیات، کیمیا، تاریخ، جغرافیہ، فقہ، اصول، فلسفہ اور منطق بھی نہیں ہے اس لیے کہ یہ سب علوم محض ”معلومات کا مجموعہ“ ہیں یہ نور نہیں ہیں وہ علم جو نور ہے۔ علم منقول ہے۔ علم ہدایت ہے، علم عقیدہ ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں فقہ کہتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ ہم نے آج کل فقہ کے معنی بہت محدود کر دیئے ہیں اور ہم محض فروعی اور شرعی احکام کے علم کو فقہ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اصطلاح قرآن میں فقہ ایک بلیغ اور جامع علم ہے فقہ کا علم رکھنے والا عالم تاریکی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا وہ اپنے علم کے نور سے فضا کو روشن کرتا ہے بات کی تاریکی کا پردہ چاک کرتا ہے۔ راہ ہدایت و عمل کی نشاندہی کرتا ہے اس کا دائرہ عمل کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں ہے وہ محض چند طالب علموں ہی کو درس نہیں دیتا بلکہ وہ عوام کی شعوری تربیت کا فریضہ ادا کرتا ہے اس کا علم افلاطونی اکیڈمی کا علم نہیں ہے (جو محض نظری ہے۔ عملی نہیں) بلکہ اس کا علم، علم رسالت کا پر نور ہے، حضورؐ نے فرمایا علماء و انبیاء کے وارث ہیںؑ

وہ علم جو محض معلومات کا انبار ہے ایک طرح کی قدرت اور طاقت ہے۔

وہ علم جو نور ہے، وہ ہدایت ہے اور ایسا عالم جس کے لیے اس کا علم نور بن گیا۔ وہ ایک صاحبِ بصیرت دانشور ہے۔ وہ ایک ایسا روشن فکر ہے جو متعهد (COMMITTED) ہے جو اپنے مکتبِ فکر کی ذمہ داریوں سے آگاہ ہے اور ان کو پورا کرتا ہے اور جو اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کا شعور رکھتا ہے اور ان ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھاتا ہے۔

شیعہ عالم کی مسئولیت اس کی ذمہ داری اہم تر اور واضح تر ہے وہ نائبِ امام ہے اپنے علم کی بدولت وہ امامت کی ذمہ داری کا بار عظیم اپنے کاڈھوں پر اٹھائے ہوئے ہے اور امامت کی ذمہ داری (مسئولیت) نبوت کی ذمہ داری کا تسلسل ہے۔

عالم تشیع نائبِ امام ہے وہ امام کے نام پر لوگوں سے رقم وصول کرتا ہے سہم امام کو اپنے تصرف میں لاتا ہے وہ لوگوں کو پیغمبر کی رسالت اور علی کی امامت کی معنویت اور پیغام سے متعارف کرانے کا ذمہ دار ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس باب میں علماء نے مکمل سکوت اختیار کر رکھا ہے اگر لوگ یہ نہیں جانتے کہ امام کسے کہتے ہیں؟ آئمہ کی سیرت اور ان کی فکر کیا تھی انہوں نے کیا کہا کیا عمل کیا، کس طرح زندگی گزاری تاریخ پر کیا اثرات مرتب کئے ان کا مکتبہ فکر کیا ہے انہوں نے کس نظامِ فکر و عمل کی حمایت اور کس کی مخالفت کی مختصر یہ کہ اگر عوام اس بات سے بے خبر ہیں کہ آئمہ اپنے بروئے سے کس بات کی خواہش کرتے ہیں اور ہم ان کے راستہ کو جاری رکھنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں تو یہ علماء کا قصور ہے۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی زبان میں کسی یورپی فلم پر کتابیں جس قدر تعداد میں ملتی ہیں اتنی تمام آئمہ شیعہ کے متعلق بھی دستیاب نہیں ہیں تو قصور علماء کا ہے۔

اگر ہمارا پڑھا لکھا نوجوان یونان کی زن فاحشہ بلیٹس کے اشعار کا نہایت  
خوبصورت فارسی ترجمہ تو پڑھ سکتا ہے لیکن اسے علیؑ کی پیچ البلاغۃ کا ترجمہ دستیاب  
نہیں تو قصور وار علماء ہیں

اگر ہمارے عوام کی اپنے آئمہ کے متعلق معلومات کا دائرہ صرف ان کے  
اسماء اور چند معجزات اور کرامات تک محدود رہے اور اگر ہم ان کی تمام پر برکت  
زندگی میں سے صرف ان کے ایام ولادت و شہادت ہی سے واقف ہیں تو  
یہ قصور علماء کا ہے۔

## محبت — معرفت

علیؑ چشمِ حریت ہے۔ منبعِ توانائی ہے مگر وہ لوگ جو علیؑ کی محبت کا دم بھرتے  
ہیں۔ غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ صنف اور انحطاط کا شکار ہیں اس تضاد  
کا سبب کیا ہے؟۔ ”عدم معرفت“ ہم علیؑ کی حقیقی معرفت نہیں رکھتے محبت کی قدر  
و قیمت اور معنویت معرفت کے حوالے سے مقرر ہوتی ہے جہاں معرفت نہیں ہے  
وہاں محبت بے اثر ہے بے قیمت ہے، وہ چاہنے والوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی  
رو نما نہیں کرتی۔ بے معرفت محبت بے اثر بے قیمت شے ہے۔ قرآن کی اگر معرفت  
حاصل نہ ہو سکے اگر اس کی تلاوت بصیرت کے ساتھ نہ کی جائے تو پھر قرآن اور کسی  
اور کتاب میں کوئی اور فرق نہیں ہے قرآن بے شک سرچشمہ ہدایت ہے لیکن اس  
ہدایت کے حصول کے لیے معرفت ناگزیر شرط ہے۔

علیؑ بھی اپنے پیروکاروں کو آگاہی، عظمت، عزت اور آزادی کی دولت  
عطا کرتے ہیں مگر کب جب وہ یہ پہچان سکیں کہ علیؑ کون تھے  
عشق و ایمان کی روح معرفت ہے۔ یہ معرفت ہے جو محبت کو جو شریعت  
اور جذبہ تعمیر عطا کرتی ہے۔



Country	1950	1960	1970	1980	1990	2000	2010	2020	2030	2040	2050
Japan	7	8	10	12	14	16	18	20	22	24	26
Germany	10	11	12	13	14	15	16	17	18	19	20
France	11	12	13	14	15	16	17	18	19	20	21
Italy	12	13	14	15	16	17	18	19	20	21	22
Spain	13	14	15	16	17	18	19	20	21	22	23
Sweden	14	15	16	17	18	19	20	21	22	23	24
United Kingdom	15	16	17	18	19	20	21	22	23	24	25
United States	16	17	18	19	20	21	22	23	24	25	26
Canada	17	18	19	20	21	22	23	24	25	26	27
Australia	18	19	20	21	22	23	24	25	26	27	28
South Africa	19	20	21	22	23	24	25	26	27	28	29
India	20	21	22	23	24	25	26	27	28	29	30
China	21	22	23	24	25	26	27	28	29	30	31
Indonesia	22	23	24	25	26	27	28	29	30	31	32
Philippines	23	24	25	26	27	28	29	30	31	32	33
Thailand	24	25	26	27	28	29	30	31	32	33	34
Malaysia	25	26	27	28	29	30	31	32	33	34	35
Singapore	26	27	28	29	30	31	32	33	34	35	36
South Korea	27	28	29	30	31	32	33	34	35	36	37
Taiwan	28	29	30	31	32	33	34	35	36	37	38
Hong Kong	29	30	31	32	33	34	35	36	37	38	39
China (incl. HK)	30	31	32	33	34	35	36	37	38	39	40
India (incl. HK)	31	32	33	34	35	36	37	38	39	40	41
Indonesia (incl. HK)	32	33	34	35	36	37	38	39	40	41	42
Philippines (incl. HK)	33	34	35	36	37	38	39	40	41	42	43
Thailand (incl. HK)	34	35	36	37	38	39	40	41	42	43	44
Malaysia (incl. HK)	35	36	37	38	39	40	41	42	43	44	45
Singapore (incl. HK)	36	37	38	39	40	41	42	43	44	45	46
South Korea (incl. HK)	37	38	39	40	41	42	43	44	45	46	47
Taiwan (incl. HK)	38	39	40	41	42	43	44	45	46	47	48
Hong Kong (incl. HK)	39	40	41	42	43	44	45	46	47	48	49
China (excl. HK)	40	41	42	43	44	45	46	47	48	49	50
India (excl. HK)	41	42	43	44	45	46	47	48	49	50	51
Indonesia (excl. HK)	42	43	44	45	46	47	48	49	50	51	52
Philippines (excl. HK)	43	44	45	46	47	48	49	50	51	52	53
Thailand (excl. HK)	44	45	46	47	48	49	50	51	52	53	54
Malaysia (excl. HK)	45	46	47	48	49	50	51	52	53		

1999

Johnston, Henry

[illegible]

523

[illegible]

1. What is the purpose of the study?  
 2. What are the research questions?  
 3. What is the significance of the study?  
 4. What are the limitations of the study?  
 5. What are the conclusions of the study?  
 6. What are the implications of the study?  
 7. What are the future research directions?  
 8. What are the ethical considerations?  
 9. What are the funding sources?  
 10. What are the acknowledgments?  
 11. What are the references?  
 12. What are the appendices?  
 13. What are the footnotes?  
 14. What are the tables?  
 15. What are the figures?  
 16. What are the charts?  
 17. What are the graphs?  
 18. What are the diagrams?  
 19. What are the maps?  
 20. What are the photos?  
 21. What are the videos?  
 22. What are the audio files?  
 23. What are the data files?  
 24. What are the source files?  
 25. What are the output files?  
 26. What are the intermediate files?  
 27. What are the temporary files?  
 28. What are the cache files?  
 29. What are the log files?  
 30. What are the error files?  
 31. What are the warning files?  
 32. What are the debug files?  
 33. What are the trace files?  
 34. What are the performance files?  
 35. What are the security files?  
 36. What are the configuration files?  
 37. What are the resource files?  
 38. What are the library files?  
 39. What are the module files?  
 40. What are the component files?  
 41. What are the service files?  
 42. What are the application files?  
 43. What are the system files?  
 44. What are the user files?  
 45. What are the database files?  
 46. What are the network files?  
 47. What are the hardware files?  
 48. What are the software files?  
 49. What are the firmware files?  
 50. What are the driver files?  
 51. What are the plugin files?  
 52. What are the extension files?  
 53. What are the interface files?  
 54. What are the protocol files?  
 55. What are the standard files?  
 56. What are the specification files?  
 57. What are the requirement files?  
 58. What are the design files?  
 59. What are the implementation files?  
 60. What are the test files?  
 61. What are the deployment files?  
 62. What are the maintenance files?  
 63. What are the documentation files?  
 64. What are the source code files?  
 65. What are the binary files?  
 66. What are the object files?  
 67. What are the library files?  
 68. What are the module files?  
 69. What are the component files?  
 70. What are the service files?  
 71. What are the application files?  
 72. What are the system files?  
 73. What are the user files?  
 74. What are the database files?  
 75. What are the network files?  
 76. What are the hardware files?  
 77. What are the software files?  
 78. What are the firmware files?  
 79. What are the driver files?  
 80. What are the plugin files?  
 81. What are the extension files?  
 82. What are the interface files?  
 83. What are the protocol files?  
 84. What are the standard files?  
 85. What are the specification files?  
 86. What are the requirement files?  
 87. What are the design files?  
 88. What are the implementation files?  
 89. What are the test files?  
 90. What are the deployment files?  
 91. What are the maintenance files?  
 92. What are the documentation files?  
 93. What are the source code files?  
 94. What are the binary files?  
 95. What are the object files?  
 96. What are the library files?  
 97. What are the module files?  
 98. What are the component files?  
 99. What are the service files?  
 100. What are the application files?  
 101. What are the system files?  
 102. What are the user files?  
 103. What are the database files?  
 104. What are the network files?  
 105. What are the hardware files?  
 106. What are the software files?  
 107. What are the firmware files?  
 108. What are the driver files?  
 109. What are the plugin files?  
 110. What are the extension files?  
 111. What are the interface files?  
 112. What are the protocol files?  
 113. What are the standard files?  
 114. What are the specification files?  
 115. What are the requirement files?  
 116. What are the design files?  
 117. What are the implementation files?  
 118. What are the test files?  
 119. What are the deployment files?  
 120. What are the maintenance files?  
 121. What are the documentation files?  
 122. What are the source code files?  
 123. What are the binary files?  
 124. What are the object files?  
 125. What are the library files?  
 126. What are the module files?  
 127. What are the component files?  
 128. What are the service files?  
 129. What are the application files?  
 130. What are the system files?  
 131. What are the user files?  
 132. What are the database files?  
 133. What are the network files?  
 134. What are the hardware files?  
 135. What are the software files?  
 136. What are the firmware files?  
 137. What are the driver files?  
 138. What are the plugin files?  
 139. What are the extension files?  
 140. What are the interface files?  
 141. What are the protocol files?  
 142. What are the standard files?  
 143. What are the specification files?  
 144. What are the requirement files?  
 145. What are the design files?  
 146. What are the implementation files?  
 147. What are the test files?  
 148. What are the deployment files?  
 149. What are the maintenance files?  
 150. What are the documentation files?  
 151. What are the source code files?  
 152. What are the binary files?  
 153. What are the object files?  
 154. What are the library files?  
 155. What are the module files?  
 156. What are the component files?  
 157. What are the service files?  
 158. What are the application files?  
 159. What are the system files?  
 160. What are the user files?  
 161. What are the database files?  
 162. What are the network files?  
 163. What are the hardware files?  
 164. What are the software files?  
 165. What are the firmware files?  
 166. What are the driver files?  
 167. What are the plugin files?  
 168. What are the extension files?  
 169. What are the interface files?  
 170. What are the protocol files?  
 171. What are the standard files?  
 172. What are the specification files?  
 173. What are the requirement files?  
 174. What are the design files?  
 175. What are the implementation files?  
 176. What are the test files?  
 177. What are the deployment files?  
 178. What are the maintenance files?  
 179. What are the documentation files?  
 180. What are the source code files?  
 181. What are the binary files?  
 182. What are the object files?  
 183. What are the library files?  
 184. What are the module files?  
 185. What are the component files?  
 186. What are the service files?  
 187. What are the application files?  
 188. What are the system files?  
 189. What are the user files?  
 190. What are the database files?  
 191. What are the network files?  
 192. What are the hardware files?  
 193. What are the software files?  
 194. What are the firmware files?  
 195. What are the driver files?  
 196. What are the plugin files?  
 197. What are the extension files?  
 198. What are the interface files?  
 199. What are the protocol files?  
 200. What are the standard files?  
 201. What are the specification files?  
 202. What are the requirement files?  
 203. What are the design files?  
 204. What are the implementation files?  
 205. What are the test files?  
 206. What are the deployment files?  
 207. What are the maintenance files?  
 208. What are the documentation files?  
 209. What are the source code files?  
 210. What are the binary

[illegible][illegible]

1900

[illegible]

1990年12月25日

*Chlorophyll*  $\frac{0.7}{\text{mg}}$

[illegible][illegible][illegible]

CONFIDENTIAL

## باب چہارم

### مسئلہ کیسے حل کیا جائے

#### سہ چہرہ زن

مسلم معاشروں میں عورت کے تین روپ ہیں۔  
ایک روایتی عورت کا روپ ہے دوسرا روپ جدید عورت کا ہے جو مغرب کی  
تقلید کرتی ہے۔

عورت کا تیسرا روپ وہ ہے جس کی علامت جنابِ فاطمہؑ ہیں وہ خواتین جو  
جنابِ فاطمہؑ کی تقلید کرتی ہیں ان میں اور روایتی عورت میں کوئی ایک بھی قدر  
مشترک نہیں ہے بہا کے (ایرانی) معاشرہ میں روایتی عورت کا جو تصور ہے وہ  
جنابِ فاطمہؑ کی روش سے بننا ہی درجہ ہے جتنا کہ جدید مغرب زدہ عورت کا تصور  
آج کی دنیا، خصوصاً مشرقی دنیا اور اس میں بھی بالخصوص ایرانی  
معاشرہ جس زبردست حقیقت سے دوچار ہے وہ حقیقت تغیر اور انقلاب  
کی وہ کیفیت ہے جو تمام انسانی اقدار، کیفیات اور تصورات کو بدل رہی ہے  
ہمارا معاشرہ، تضاد، بحران اور آشفتمندی کا شکار ہے ایک نیا طبقہ وجود میں آ رہا  
ہے جسے روشن فکر یا تعلیم یافتہ یا حدت پسند (MODERN) طبقہ کہتے ہیں  
جو قدیم روایتی مردوں اور عورتوں سے قطعی مختلف ہے یہ تضاد ایک جبری تضاد  
ہے ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ ان تاریخی اور سماجی عوامل کو جو اس تبدیلی اور  
تضاد کا محرک بنے ہیں روکنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

یہ تغیر اور انقلاب اچھا ہے یا برا اس سے قطع نظر ہیں اس وقت یہ کہنہ ہے کہ معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اور ان کے زیر اثر مردوں اور عورتوں کی وضع قطع سر پہنے کے طریقے اور رہنے پہنے کے ڈھنگ بدلنا لازمی ہیں یہ ممکن ہی نہیں کہ آج کی عورت قدیم اور روایتی روش پر قائم رہ سکے۔

گزشتہ دور میں بیٹا باپ کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ بالکل اپنے باپ کے قالب میں ڈھل جاتا تھا۔ کوئی باپ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا بیٹا اس سے اس قدر مختلف ہو جائے گا کہ باپ اور بیٹے کے درمیان کوئی قدر مشترک کوئی فکری مفاہمت اور کوئی جذباتی اشتراک ممکن نہیں ہو سکے گا لیکن آج صبر حال اس سے مختلف ہے نسلی بعد (GENERATION GAP) ہمارے دور کی ایک خصوصیت ہے مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ نسلی بعد کا مسئلہ شدید اور سنگین ہے آج دونوں کے درمیان "زمانی فاصلہ" بظاہر (۳۰ سال) ہے لیکن معاشرتی تبدیلیوں کے پیمانہ سے ناپا جائے تو یہ فاصلہ کم از کم تین سو سال ہو جاتا ہے

عہد گزشتہ میں معاشرہ جامد تھا اور اس کی اقدار اور خصوصیات ایک شکل میں قائم تھیں تغیر کا عمل مفقود تھا۔ ۱۰۰۰، ۲۰۰، ۳۰۰ سال میں بھی کوئی خاطر خواہ تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہر چیز اپنی جگہ ویسے ہی رہتی تھی اس معاشرتی جمود کا عالم یہ تھا کہ ذرائع پیداوار، دولت کی تقسیم، باہمی تعلقات، حکومت، دینی ادارہ، مذہبی رسوم، عادات و اطوار، مہبت اور منفی اقدار کا تصور فن، ادب، زبان، غرض ہر شے جو دادا اور پردادا کے زمانے میں جیسی تھی بیٹوں اور پوتوں کے دور میں بھی ویسی ہی رہتی

## اہلِ نابل

اس ٹھہری ہوئی دنیا میں اور جامد معاشرہ میں جہاں "زمانِ اجتماعی"

یعنی معاشرتی وقت حرکت نہیں کرتا۔ مرد، عورتیں اور طبقات ایک ہی رُخ پر قائم رہتے ہیں ایسے معاشروں میں یہ ایک فطری بات ہے کہ بیٹی بالکل اپنی ماں سے مشابہ ہو اس کی نقل ہو اگر ماں اور بیٹی میں کوئی فرق ہو گا بھی تو اس کی نوعیت ضمنی، فروغی اور ذاتی ہوگی۔ یہ اختلاف انفرادی سطح تک محدود ہو گا۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ یہ اختلاف اجتماعی نوعیت اختیار کر سکے اس لیے کہ معاشرتی اقدار، اخلاقی معیار اور اچھائی اور برائی کے تصورات سب ایک تھے تمام طبقے ان امور پر ہم رائے تھے اُممیں کوئی اختلاف نہیں تھا ایسا نہیں تھا کہ معاشرے کے کسی طبقہ کے نزدیک جو بات مذموم ہو دوسرا اسے اچھا سمجھے مگر آج ہی متحوّل حال ہے۔

آج کی دنیا میں ماں اور بیٹی کے درمیان اختلافات کی خلیج واضح اور نمایاں ہے۔ بیٹی کسی اخلاقی فساد اور اخلاف کے بغیر ہی اپنی ماں سے مختلف اور میگاند نظارتی ہے اور ان دونوں کے درمیان ۲۰، ۱۵ یا ۲۰ سال کا فرق دراصل دو اجتماعی ادوار کا فرق ہے اب ماں اور بیٹی دو ایسے افراد ہیں جو دو مختلف زمانوں سے متعلق ہیں ان کی تاریخ ان کی ثقافت ان کی زبان ان کا معیار فکر و نظر سب جدا جدا ہیں یہ دو مختلف انسان ہیں جن کے درمیان اگر کوئی قدر مشترک ہے تو بس اس قدر کہ وہ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں اور ان کے گھر کا پتہ ایک ہی ہے۔

دو نسلوں اور انسان کی دو قسموں کے درمیان یہ بعد اور تضاد یہ تنازع فصل اجتماعی زندگی کے خارجی مظاہر میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ تہران کی پنجتہ اور جدید سڑکوں پر ایک شخص بکریوں کا گلہ لئے گھومتا ہے اور حریز اوروں کی آنکھوں کے سامنے ان کے لیے دودھ دوتا ہے اس کے ساتھ ہی کیمیائی طور پر محفوظ کیا ہوا دودھ . . . . . بھی دستیاب ہے اسی طرح ہم یہ نظارہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی اورٹ

کسی نہایت جدید خود کار گاڑی کے ساتھ کھڑا ہو اے گویا آج کے دور میں دولتوں کے درمیان اسی قدر بعد و ہی تاریخی فاصلہ اور وہی معاشرتی دوری ہے جتنی دوری بائبل اور قابیل کے عہد کو خلائی قیصر اور جدید برقیات کے موجودہ عہد سے الگ کرتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس تاریخی فاصلہ کے باوجود ماں اور بیٹی شانہ سے شانہ ملائے شاہراہوں پر سفر کرتی ہیں لیکن ان میں سے ایک (ماں) ایرانی ساختہ آئسکیم سے شغل کرتی ہے اور دوسری (بیٹی) ماسہ چلتے ہوئے چوڑنگم چباتی رہتی ہے۔

## مذہب — روایت

یہ اجتماع ہندین، یہ دو متضاد انسانی قسموں کا اجتماع کوئی فطری اور پایدار اجتماع نہیں ہے ظاہر ہے کہ ان دو قسموں میں سے ایک قسم (TYPE) کی نمائندہ وہ ماں ہے جو اپنی زندگی کے آخری دور سے گزر رہی ہے اس کی عادات و اطوار پختہ اور راسخ ہیں اور ان عادات کے تحت وہ ایک خاص پہنچ پر اپنی زندگی گزار رہی ہے اور دوسری قسم کی نمائندہ وہ بیٹی ہے جو ابھی نو عمر ہے اسے اپنی زندگی کا سفر طے کرنا ہے اپنے عادات و اطوار کی تربیت کرنی ہے ماہ و سال کی گردش کے زیراثر وہ مکر کے اعتبار سے زندگی کے اس مرحلہ میں داخل ہو جائے گی جس سے اس وقت اس کی ماں گزر رہی ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ اپنی ماں کے قالب میں نہیں ڈھل سکے گی آج کی یہ بیٹی جب کبھی ماں کے بے لگی قواس کی شخصیت اپنی ماں کی شخصیت سے مختلف ہوگی لیکن اس کے بعد کی نسل کے دور میں تغیر کا یہ عمل جو اس وقت جاری ہے اپنے منطقی اور فطری انجام تک پہنچ چکا ہوگا معاشرہ میں جو بحرانی کیفیت طاری ہے وہ سکون سے بدل جائے گی پھر اس دور میں ماں اور بیٹی ایک ہی تاریخی اور سماجی دور سے متعلق ہو جائیں گی دونوں کے درمیان جو فصل ہمارے دور میں ہے۔

یہ فاصلہ، یہ نسلی بعد، ختم ہو جائے گا دونوں میں یکساں نکت اور یک رنگی قائم ہو جائے گی پھر ماں اور بیٹی میں وہی نسبت اور تعلق قائم ہو جائے گا جو عہد سابق میں تھا۔ یعنی بیٹی اپنی ماں کی ایسی نقل ہوگی جسے مطابق اصل کہا جاسکے گا۔

عورت کا روایتی ٹاپ سے جدید ٹاپ میں بد نئے کا عمل

..... ایک ایسی بات ہے جو قطعی اور ناگزیر ہے خواہ یہ بات حق ہو یا باطل

اچھی ہو یا بری لیکن یہ حقیقت ہے کہ تبدیلی کا یہ عمل بہر حال مکرر رہے گا، اب اگر کوئی شخص اس حقیقت سے چشم پوشی کرتا ہے اس عمل تغیر کا مذاق اڑاتا ہے اس کی تضحیک کرتا ہے اس کے خلاف جمعیت اور حقارت کا اظہار کرتا ہے زمانہ کے دباؤ اور حالات کے جبر کا مقابلہ صرف قیل و قال سے کرنا چاہتا ہے۔ تغیر کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ہے تو وہ محض ایک کارِ عبث میں

مشغول ہے وہ بے سود مشقت کر رہا ہے۔ زحمتِ عبث کا شکار ہے اس کی تمام زحمات اور کوششوں کا نتیجہ نہ صرف یہ کہ صفر بلکہ صفر سے بھی کم تر ہے بلکہ وہ اپنی اس زحمت بے سود سے تبدیلی کے عمل کو تیز کرنے اور اپنی مخالف قوتوں کو تقویت پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔

یہی وہ حقیقتِ ناس گروہ ہے جو مفکر اور مادی کی شکل میں ایمان عقیدہ اور مذہب کے نام پر ہر اس شے کو جو ہمیں ماضی سے ورثے میں ملی ہے اور جو ہماری عادت اور روایت کا حصہ ہے ہر اس شے کو جسے قرآنی اصطلاح میں ”سنت الاولین“ یا ”اساطیر الاولین“ سے تعبیر کیا گیا اور جس کا تعلق آباء الاولین سے قائم تھا اسی طرح برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور تغیر کے سماجی اور تاریخی عمل کی نفی کے لیے دین و مذہب کا سہارا لیتا ہے لوگوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ماضی کی ہر روایت، ہر سنتِ قدیم کی توجیہ کریں اس کو درجہ تقدیس عطا کریں گویا ان کے خیال میں ”ماضی پرستی“ مذہب پرستی کے مترادف ہے نتیجہ یہ کہ وہ ہر تغیر اور تبدیلی کو ماضی کی روایت سے ہر معمولی سے معمولی

انحراف کو، خواہ اس کا تعلق لباس یا آرائش گیسو ہی سے کیوں نہ ہو، "کفر" گردانتے ہیں اور ماضی پرستی، جدت طرازی سے فراز، اور تغیر و تبدیلی سے بیزاری کو جو حقیقتاً روح تسلیم کی جند ہے اسلام کا لبادہ پہناتے ہیں اور اسی منطق کے تحت ان کا خیال ہے کہ تمام عورتیں اپنی اسی حالت پر قائم رہیں جو انہیں ماضی

سے ورثہ میں ملی ہے وہ روایت سے سرمو انحراف نہ کریں اس لیے کہ اس حقیقت ناشائس گروہ کو عورتوں کی یہی وضع پسند ہے وہ انہیں روایتی قالب میں دیکھنے کے عادی ہیں اور ان کا مفاد اسی میں ہے کہ عورتیں اپنے اسی قالب میں محصور رہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ عورتوں پر یہ جبر و روایتی قالب میں قائم رہنے کا جبر، ابد تک قائم رہے اور اپنی اس کوشش کی سند اور تائید کے لیے وہ ادعا کرتے ہیں کہ اسلام عورتوں پر اس جبر کی توثیق کرتا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام نے عورتوں کے لیے یہی وضع اور یہی قالب پسند کیا ہے اور وہ قیامت تک اسی وضع پر قائم رہنے کے لیے مجبور ہیں دنیا بدل سکتی ہے زمین آسمان بدل سکتے ہیں ہر شے متغیر ہو سکتی ہے یہاں تک کہ عورتوں کے شوہر اور ان کی اولاد اپنی وضع قطع بدل سکتی ہے اور اپنے قالب تبدیل کر سکتی ہے لیکن عورت کو اپنی وضع تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر ان کا ادعا ہے کہ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کیلئے اسی وضع کو پسند کیا۔ جس سے اس کا خاوند خوش رہے گویا عورت اپنے خاوند کی خوشی کی پابند اور اس کی مرضی کے قالب میں ڈھلنے پر مجبور ہے۔ یہ منہی انداز فکر ایک دعوت گراہی ہے ایک نقصان رساں دعوت ہے اسی لئے کوئی اس آواز پر کان نہیں دھرتا بات یہ ہے کہ حرکت اور تغیر کے اہول کو سکون اور ثبات سے بدلنا ممکن نہیں ہے طبقہ نسواں اس تغیر سے محفوظ نہیں رہ سکتا سماجی تبدیلی کے عمل سے نہیں بچ سکتا۔ خواہ کوئی پسند کرے یا نہ کرے بہر حال عورتیں تغیر کے دور سے گزر رہی ہیں۔ زمین کی گردش اور سماجی تبدیلیوں کے زیر اثر ان کی عادات و اطوار اولاد

ومنہ قطع بدل رہی ہے زمانہ کے بدلنے کے ساتھ سماجی اداروں میں تبدیلی ناگزیر ہے اور سماجی حالات اور معاشرتی ماحول کے بدلنے سے لوگوں کے عادات و اطوار ان کی ومنہ قطع اور ان کے رہن سہن کے طریقے سب کچھ بدل جاتے ہیں۔

مذہب ایک حقیقت ہے جو قائم اور ثابت ہے یہ زمانہ کی گردش سے متاثر نہیں ہوتی۔ سماجی تغیرات کے دباؤ سے بدل نہیں سکتی لیکن اس حقیقت کے خارجی مظاہر، اس کی ظاہری شکلیں، مردود اور ہر معاشرے کی ضرورت کے مطابق تبدیل ہو سکتی ہیں، 'خارجی اشکال' اور 'ظاہری رسوم' کو اصل حقیقت سمجھنا بہت بڑا مفاسط ہے ماضی کی وہ سنت اور وہ طور طریقے جو دراز کار ہو جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہو جاتے ہیں وہ عادتیں جو اپنا جواز کھودیتی ہیں ان کا بدل جانا ضروری ہوتا ہے اگر ہم ماضی کی مردہ روایت کو مذہب کے ہم معنی سمجھتے ہیں تو یہ بہت بڑا مفاسط ہے اگر غلط ہیں علماء مذہب کے نام پر ماضی کی روایت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مذہب کے ذریعہ مردہ ماضی کو زندہ نہیں رکھ سکتے البتہ مذہب اور روایت ماضی کو ایک دوسرے سے مشروط کرنے کا نتیجہ ہو سکتا ہے کہ... روایت ماضی کے ساتھ مذہب کو بھی دوزخ کا ر سمجھ لیا جائے۔

مذہب اور ماضی کی روایت دو الگ الگ حقیقتیں ہیں انہیں ایک حقیقت سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے اس طرح اہم اسلام کو جو ایک قائم اور لازوال حقیقت ہے معاشرتی زندگی کے ان خارجی مظاہر اور اشکال کا نگہبان بنا دیتے ہیں جو زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں ہم خود کوئی عقائد، تمدنی، ثقافتی اور تاریخی آثار کو دین سمجھنے کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ زمانہ کی گردش کو روکنا ممکن نہیں ہے زمانہ حرکت سے اور تغیر سے عبارت ہے اور اپنی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کی سکت اور قدرت رکھتا ہے



روایت، عادت، وضع قطع، طرز بود و باش، اجتماعی روابط اور ان کے خارجی مظاہر سب کچھ وقت کے سیلاب تغیر کی زد میں ہیں۔ ان کو مذہب کو یا ہم خلط ملط کرنا ایک اشتباہ ہے ایک دھوکہ ہے کیا ہم نہیں دیکھتے کہ بعض لوگ آج بھی اس اشتباہ کا شکار ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی فکر کس قدر بڑا دھوکہ کھا رہی ہے۔

## سنت پیغمبر اسلام

دین اسلام میں حضور کی سنت کی بڑی زبردست اہمیت ہے۔ سنت جن باتوں سے عبارت ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

حضور کے اقوال مبارک

حضور کے تعلیم کردہ قوانین

حضور کا وہ سکوت جو آپ نے کسی عمل کو دیکھ کر اختیار فرمایا حضور نے جو عمل خود انجام دیئے اگرچہ کہ آپ نے دوسروں کو ان کے بارے میں حکم نہ دیا ہو۔

گویا حضور کی سنت آپ کا قول اور عمل ہے اس اعتبار سے احکام اسلام کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) وہ احکام جو قبل از اسلام رائج تھے اور جن کی پیغمبر نے تائید و توثیق فرمادی۔ یہ احکام امضائی ہیں

(۲) وہ احکام جو سابق میں موجود نہیں تھے مگر جنہیں خود پیغمبر نے وضع فرمایا۔ یہ احکام تائیدی ہیں۔

لیکن احکام کی ان دو قسموں کے علاوہ یعنی امضائی اور تائیدی احکام یا بالفاظ دیگر قول و عمل پیغمبر کے علاوہ سنت کا ایک اور رخ بھی ہے ایک تعمیری جہت بھی ہے جو میرے خیال میں باقی دونوں جہتوں سے زیادہ حساس

اور اہم ہے اور وہ ہے روش کار پیغمبر یعنی حضور کا طریقہ کار۔ وہ طریقہ (METHOD) اور حکمت عملی و نظری (TACTIC AND STRATEGY) جو آپؐ نے پیغام رسالت کی تبلیغ میں استعمال فرمائی۔ حضورؐ نے معاشرے کی اصلاح اور اسلام کے اصولوں کی تبلیغ و نفاذ کے لیے جو مخصوص حکمت عملی اختیار کی وہ ہر دور کے فکری اور سماجی مسائل سے نمٹنے کے لیے سب سے مؤثر اور رہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے آپؐ کی یہ حکمت عملی دیگر مروجہ مکاتب فکر کے طریقہ کار سے مختلف اور اپنی جگہ منفرد اور ممتاز ہے لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دیگر مکاتب فکر کا ایک اجمالی تعارف پیش کریں۔

## تین مکاتب فکر

اجتماعی اور معاشرتی اصلاح کے تین معروف طریقے ہیں جنہیں تین معین اور واضح مکاتب فکر کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے۔

(۱) : مکتب تحفظ روایت (TRADITIONALISM AND CONSERVATISM)  
اس مکتب فکر میں ماضی کی ہر روایت اور تمام رسوم و شعائر کا تحفظ کیا جاتا ہے خواہ وہ اچھے ہوں یا برے۔

(۲) : مکتب انقلابی (REVOLUTIONISM)  
اس مکتب فکر میں ماضی کی ہر روایت کو رد کر دیا جاتا ہے انقلابی رہبر ماضی کی ہر رسم اور ہر طریقہ کو رجعت پسندی، کہنگی اور فرسودگی کی علامت سمجھتا ہے۔

(۳) : مکتب اصلاحی و ارتقائی (REFORMISM - EVOLUTIONISM)  
اس مکتب فکر میں ماضی کی روایتوں کو تدریج تبدیل کیا جاتا ہے معاشرے کی ہریت رفتہ رفتہ تبدیل ہوتی ہے اور اصلاح کا عمل ایک طویل مدت

میں مکمل ہوتا ہے یہ مکتب اوپر بیان کئے گئے دونوں مکاتیب کی درمیانی راہ ہے۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تینوں راستوں سے الگ ایک چوتھا راستہ اختیار فرمایا۔ یعنی وہ شعائر اور وہ رسوم جن کی جڑیں معاشرہ میں بہت گہری ہیں اور جو کئی نسلوں کی میراث تھے اور جن کے لوگ اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ان پر عمل کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا حضورؐ نے ان کو برقرار رکھا مگر اس طرح کہ ان کی ظاہری شکل تو ماضی سے مماثل رہی لیکن ان کی معنویت۔ ان کی روح۔ ان کی ہمت کو یکسر تبدیل کر دیا گیا۔ مگر یہاں حضورؐ کی نگاہ ہیئت (FORM) سے زیادہ ماہیت (CONTENT)

پر رہی اور آپؐ کا طریقہ کار تبدیلی ہیئت سے زیادہ قلبِ ماہیت کا طریقہ ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مکتب فکر اپنے حق میں کیا استدلال پیش کرتا ہے مکتب تحفظ روایت کے علمبرداروں کا استدلال یہ ہے کہ ماضی کے شعائر

اور رسوم و رواج کی جڑیں معاشرہ میں بہت گہری ہوتی ہیں اور کسی اجتماعی نظام میں ان کی حیثیت وہی ہے جو کسی جسم میں نظامِ اعصاب کی ہے اگر ان کو یک لخت بدلنے کی کوشش کی جائے گی تو معاشرہ کا شیرازہ بکھر جائے گا اجتماعی نظام کے تار و پود بکھرنے سے معاشرہ میں بحران کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر بڑے انقلاب کے بعد معاشرہ میں بحران انتشار اور اضطراب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے یا پھر کوئی ڈکٹیٹر معاشرہ پر مسلط ہو جاتا ہے اس مکتب فکر کے خیال میں ماضی کے ان شعائر و شعائر کو جن کی جڑیں معاشرہ اور ثقافت میں گہری ہوں کسی ضد انقلابی عمل کے ذریعہ یک لخت بدلنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ ایک زبردست بحران اور ایک خلائی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے یہ معاشرتی ظلم انقلاب کی ہما ہمی ختم ہونے کے بعد پوری طرح ظاہر ہوتا ہے

مکتبہ انقلابی کے علمبرداروں کا استدلال یہ ہے کہ اگر ہم ماضی کے رسوم و رواج کو برقرار رکھیں گے تو اس کا مطلب معاشرے کو کھنگی، فرسودگی رجعت پسندی اور جمود کی حالت میں برقرار رکھنا ہے سچا انقلابی وہی ہے جو ماضی کی ان تمام روایتوں کو جو لوگوں کے بہت دیا ان کی رد و محکوم کر دے اور ان کے عوام و ابادہ کو فرسودگی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یکسر رد کر کے لوگوں کو آزادی دلاتا ہے اور تمام پرانے رسوم و رواج کی جگہ نئے قوانین نافذ کرتا ہے کیونکہ اگر یہ ہمہ گیر انقلابی تبدیلی عمل میں نہ آئے تو انقلاب اپنی عرضی و غایت کو پورا نہیں کر سکتا اور معاشرہ بدستور قدامت، فرسودگی، جمود اور رجعت پسندی کا شکار رہتا ہے۔

مکتبہ اصلاحی کے علمبرداروں کا استدلال یہ ہے کہ ان کا طریقہ باقی دو مکتب کی کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے یہ ایک درمیانی راستہ ہے جس میں اصلاحی عمل رفتہ رفتہ بدرجہ واقع ہوتا ہے اس مکتب فکر کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ معاشرہ کو ماضی کی قید و بند اور جمود سے نجات دلانی چاہئے لیکن یہ عمل اس قدر ناگہانی نہ ہو کہ معاشرہ یکسر رد ہم پر ہم ہو جائے بلکہ اس تبدیلی کے لیے رفتہ رفتہ زمین ہموار کی جائے آہستہ آہستہ اور تشدد سے پاک طریقوں کو کام میں لاکر یہ کوشش کی جائے کہ معاشرہ تدریجی ارتقاء کے ذریعہ اصلاح یافتہ ہو جائے یہ ایک طویل اور صبر آزما طریقہ ہے جس میں انقلابی عمل کے ذریعہ تبدیلی رونما نہیں ہوتی بلکہ ایک طویل مدت کی جدوجہد اور مرحلہ وار منصوبہ بندی کے ذریعہ تبدیلی کا عمل مکمل ہوتا ہے

لیکن اس تدریجی اصلاح کے عمل میں ایک واضح خرابی ہے اور وہ خرابی یہ ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے اور اس طویل مدت میں منفی عوامل، رجعت پسند قوتیں اور خارجی اور داخلی دشمنوں کی دباؤ و اینٹیں اس اصلاح تدریجی کی تحریک کو اس کے راستے سے ہٹا دینے میں

کامیابی حاصل کر سکتی ہیں یا پھر اس اصلاحی تحریک کو سرے سے ناکام اور نیست و نابود کر سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ہم یہ چاہیں کہ نوجوانوں کے اخلاق کو تدریجی طور پر سدھاریں یا عوام کے افکار کی اصلاح کریں تو عین ممکن ہے کہ قبل اس کے کہ ہم اپنا ہدف حاصل کر سکیں۔ فساد انگیز عوامل اور عوام کو دھوکہ دینے والی قوتیں معاشرہ پر غلبہ حاصل کر کے ہماری کوششوں کو بالکل مغلوب کر دیں وہ لیڈر جو تدریجی اصلاح کے طریقہ سے معاشرہ کو سدھارنا چاہتے ہیں وہ اپنے منصوبہ پر بہت عزم کرتے ہیں لیکن جوابات ان کی نظر سے اوجھل رہتی ہے وہ ان اصلاح دشمن قوتوں کا منفی اثر ہے جو معاشرے کو اصلاح و ترقی سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ یہ قوتیں اتنی ہمت ہی کہاں دیتی ہیں کہ تدریجی اصلاح کا عمل اپنے انجام تک پہنچ سکے۔ مختصر یہ کہ تدریجی اصلاح کے ذریعہ جو مثبت تبدیلی بہت دنوں کی تدریجی کوشش کے ذریعہ عمل میں آتی ہے اسے منفی قوتوں کا اقتدار ڈراسی دیر میں پلٹ دیتا ہے اور یوں صورت حال پہلے ہی کی طرح یا اس سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔

لیکن پیغمبر اسلام نے ان تینوں معروف طریقوں سے ہٹ کر اپنا ایک منفرد طریقہ وضع کیا۔ معاشرتی تبدیلیوں اور اجتماعی اصلاح کے باب میں آپؐ کی روشی سب سے جدا اور سب سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہے یہ طریقہ تینوں مروجہ طریقوں کے نقائص اور ان کے منفی اثرات سے پاک ہے یہ وہ طریقہ ہے جو منفی عوامل اور سماج دشمن قوتوں کے علی الرغم اپنے مقاصد کو بہت تیزی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اور وہ مخصوص طریقہ اور وہ منفرد روشی ہے کہ حضورؐ نے ماضی کے شعائر اور رسوم کی ظاہری شکل و صورت کو تو برقرار رکھا لیکن ان کے باطن میں جو معنویت پوشیدہ تھی اسے انقلابی عمل کے ذریعہ یکسر بدل دیا یا الفاظ دیگر یہ تبدیلی ہیئت سے زیادہ قلب ماہیت

کی روش ہے۔

اس بات کو چند مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً غسل کی رسم دور جاہلیت میں بھی تھی مگر اس دور میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حالت نجاست میں ان پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے ان کے جسموں میں جن اور شیطان حلول کر جاتے ہیں اس سے نجات کے لیے غسل ضروری ہے اسلام نے بھی غسل کی رسم جاری رکھی مگر دور جاہلیت کے تصور اور اسلام کے تصور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اسی طرح حج کے معاملہ کو لیجئے۔ حج کی ابتداء حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی مگر زمانہ کے تغیر کے ساتھ ساتھ اس کی معنویت مسخ ہوئی رہی۔ بعثت پیغمبر کے وقت حج ایک ایسی رسم میں تبدیل ہو گیا تھا جس کا مقصد بیت پرستی اور قریش کا اقتصادی فائدہ تھا مگر پیغمبر کی نگاہ دیکھ رہی تھی کہ حج معاشرہ کی اصلاح میں ایک زبردست انقلابی کردار ادا کرنے کی صلاحیت اور استعداد رکھتا ہے اس لیے کہ یہ سنت حضرت ابراہیمؑ سے منسوب تھی اور دور جاہلیت میں بھی جب کعبہ بتخانہ بن گیا تھا عرب کے ٹوٹوں نے اس بات کو فراموش نہیں کیا تھا کہ کعبہ کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے رکھی تھی جو خلیل خدا تھے گویا عرب معاشرے میں حج ایک اہم تاریخی روایت کی حیثیت رکھتا تھا پیغمبر نے حج کی اس اہمیت اور اثر آفرینی کی استعداد کے پیش نظر اسے ایک انقلابی اقدام کے ذریعے اپنے مکتب فکر کے مقاصد سے ہم آہنگ کر دیا اور ایک ایسی رسم کو جو دور جاہلیت میں عربوں کے متفرق قبائل کے اتحاد کی علامت اور قریش کے اقتصادی فوائد کی ضمانت بن گئی تھی ایک ایسے ادارے میں تبدیل کر دیا جو حقیقہ توحید پر مبنی ہے وحدت بشری کی علامت ہے اور جس میں بہت گہری دور رس اور ہمہ جہت مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ پیغمبر نے حج کو جو عربوں کے قبائلی اجتماع اور

تجارتی میلہ کی شکل اختیار کر گیا تھا اپنے انقلابی اقدام کے ذریعے ایک ایسی سنت اور ایک ایسے ادارے میں تبدیل کر دیا جس کے اعراض و مقاصد دور جاہلیت کے حج کے مقاصد سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تھے لیکن یہ انقلابی تبدیلی اس خوبصورتی سے عمل میں آئی کہ عربوں میں کوئی ہیجان یا اضطراب پیدا نہیں ہوا انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ ماضی سے ان کے شے ٹوٹ رہے ہیں یا ان کی مقدس اقدار کو تبدیل کیا جا رہا ہے بلکہ اس کے برعکس انہیں یہ احساس ہوا کہ پیغمبرؐ نے ماضی کی ایک سنت اور عظیم روایت کو جو گردشویام کے ہاتھوں میں ہو گئی تھی آلودگی اور کثافت کا شکار ہو گئی تھی پاک صاف کر کے اس کی اصلی اور حقیقی صورت کی طرف لوٹا دیا۔ عربوں میں بت پرستی کی رسم کئی صدیوں سے جاری تھی اور در آن حالیکہ پیغمبرؐ نے بت پرستی سے توحید کا فاصلہ ایک انقلابی عمل کے ذریعہ یک لخت طے کیا۔ لیکن عربوں کو یہ محسوس تک نہ ہوا کہ وہ اپنے ماضی سے جُرا ہو رہے ہیں یا یہ کہ ان کی صدیوں پرانی معاشرتی اور اجتماعی قدیں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہی ہیں۔

پیغمبرؐ کی اس خاص حکمت عملی اس مخصوص طریق کار (TACTIC) کے متعلق ہمارا کہنا ہے کہ یہ معاشرتی اصلاح کے باب میں سب سے منفرد اور سب سے زیادہ موثر طریقہ کار ہے اور اس طریقہ کار کو ایک جملہ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس طریقہ میں کسی رسم یا سنت کی ہیئت (FORM) کی صرف ضروری اور مناسب اصلاح کی ہے البتہ اس کی مابینیت (CONTENT) کو یکسر منقلب کر دیا جاتا ہے۔

اس موقع پر ہم دیگر مکاتیب فکر اور مکتب پیغمبرؐ کے طریق کار کے فرق کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

ایک ایسا شخص جو قدامت پسند ہے جو ماضی کی ہر روایت کا تحفظ کرنا چاہتا ہے اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر حال میں اور ہر قیمت پر سنت قدیم

کا تحفظ کرے خواہ اس کی قیمت میں اسے اپنی اور دوسروں کی قربانی پیش کرنا پڑے

اس کے برعکس ایک انقلابی یہ چاہتا ہے کہ ماضی کی ہر شے کو ایک دم منقلب کر دے۔ بیک تلم منسوخ کر دے اور ایک ایک کر کے ماضی کی تمام رسوم و رواج کو نیت و نابود کر دے اور اس انقلابی جوش میں وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ معاشرہ ایسے انقلابی اقدام کے لیے آمادہ و تیار نہیں ہے اس تضاد صورت حال کے نتیجہ میں انقلاب کا عمل جبر و تشدد، قتل و غارت گری اور بالآخر آمریت (ڈکٹیٹر شپ) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس تشدد اور قتل و غارت گری کا نشانہ صرف چند انقلاب دشمن افراد ہی نہیں رہتے بلکہ جملہ عوام اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

جہاں تک ایسے مصلح کا تعلق ہے جو تدریجی اصلاح اور ارتقائی عمل پر یقین رکھتا ہے اس کا طریقہ کار اس قدر طولانی ہے کہ اس طویل مدت میں منفی قوتوں اور مفسدوں کو کھل کھیلنے کا اچھی طرح موقع مل جاتا ہے۔

مگر پیٹر اسلام نے ان تینوں راستوں سے الگ ایک راستہ بنایا اپنی ایک مخصوص اور منفرد روش ایجاد کی اور سنت پیغمبر کی یہی وہ مخصوص انقلابی جہت ہے جو ہر دور اور ہر معاشرے میں اصلاحی اقدام کے لیے واضح اور روشن اصول فراہم کرتی ہے ماضی کی کہنہ روایتیں ثقافت کی بے روح اقدار، مذہب کے مسخ شدہ عقائد غرض وہ تمام رجعت پسندانہ عوامل جو کسی معاشرے کو تباہی اور جہود سے دوچار کرتے ہیں ان سب سے نمٹنے کے لیے یہ مخصوص طریق کار نہایت فعال اور موثر ہے اور اگر ہم اس مخصوص طریقہ کار (Tactic) کو سمجھ سکیں اس کا شعور حاصل کر سکیں اور اس پر عمل پیرا ہو سکیں تو معاشرے کو خرابیوں سے پاک کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہم انقلابی عمل کی خرابیوں اور ان کے منفی اثرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں ہم ماضی کی اقدار اور کہنہ رسوم



ورواج سے دور ہو سکے ہیں لیکن یہ دوری عوام سے دوری نہیں ہوگی۔ کچھ ماحولی سے بے گامگی عوام سے بیگانگی نہیں بنے گی پہلے سے اور عوام کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہوگی مختصر یہ کہ یہ طریق کار تمام دیگر مکاتب کے منفی پہلوؤں سے پاک اور نہایت زود اثر اور ہمہ گیر ہے اس لیے کہ یہ طریقہ ایک ایسے رہبر نے تعلیم فرمایا ہے جس کی فکر کا سرچشمہ وحی تھا اور جو انسانیت کی تاریخ میں سب سے بڑا مصلح اور انقلابی ہے اور جس کا پیغام تمام انسانیت کے لیے ہر دور، ہر عہد اور ہر معاشرے کے لیے فوز و فلاح کی ضمانت اور بشارت ہے۔

### مثالیت / حقیقت پسندی (IDEALISM/REALISM)

اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ معاشرہ کی عینی اور تجربی حقیقتوں کو تسلیم کرتا ہے ان کے وجود کا اعتراف کرتا ہے اور ان کی طرف ایک مخصوص اور منفرد رویہ رکھتا ہے ان حقیقتوں کے بارے میں بھی اسلام کا اندازِ نظر دوسرے مکاتبِ فکر کے اندازِ نظر سے مختلف ہے۔ مثالیت پسند ہوں یا حقیقت پسند دو نونوں افرات اور تفریط کا شکار ہیں مثالیت پسند صرف اعلیٰ اقدار اور مثالی اخلاق کی بات کرتے ہیں اور واقعیت اور حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ان کی مثالیت پسندی ایک ایسا خول ہے جو انہیں ٹھوس معاشرتی اور فطری حقائق کو قبول کرنے سے باز رکھتا ہے۔ عفتہ انتقام، جنتی جذبہ، مسرت اور دولت کی طلب ایسی حقیقتیں ہیں کہ جن کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن مثالیت پسندی خواہ اخلاقی ہو (زہد) یا مذہبی (مسیحیت) ان تمام حقیقتوں سے چشم پوشی کر کے ان کا انکار کرتی ہے اور ان کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اس کے برعکس مکتبِ حقیقت پسندی (REALISM) ہر بات کو اس لیے قبول کرتا ہے کہ وہ موجود ہے گویا اس مکتب میں حقیقت / واقعیت کا وجود اسی کے تسلیم کرنے کے لیے کافی ہے اسی منطق کے تحت انگلستان میں لواطت کو

جائز تسلیم کر لیا گیا ہے جبکہ دوسری طرف مسیحیت کی مثالیت پسندی طلاق کو حرام قرار دیتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک رشتہ ازدواج ایک مقدس رشتہ ہے جسے توڑا نہیں جاسکتا علاوہ ازیں اس رشتہ کے ٹوٹنے سے خاندانی تنظیم قائم نہیں رہ سکتی اور خاندانی تنظیم کی حفاظت اس لیے ضروری ہے کہ یہ ایک مقدس تنظیم ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہر موقع اور ہر صورت میں اس مقدس رشتہ ازدواج کو قائم رکھ سکے ہوتا یہ ہے کہ زوجین ایک دوسرے سے بے گانہ اور متنفر رہتے ہیں ان کی ازدواجی زندگی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار رہتی ہے وہ ایک حالتِ جبر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں ان کا تعلق مجبوری ہے سماجی اور معاشرتی جبر ہے ورنہ ان میں کوئی الفت یا یکگانیت نہیں ہے ان کا باہمی ربط و تعلق عشق و محبت کے ذریعہ قائم نہیں ہے شرع کی مجبوری کے ذریعہ قائم ہے یہ دو انسان، دو مجبور و درمنازہ انسان جو اپنی خواہش اور پسند کے خلاف ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں ممکن ہے کہ کسی دوسرے انسان کی رفاقت میں مطمئن اور سرور زندگی بسر کر سکتے یہ ازلی اور ابدی حقیقت ہر دور میں موجود رہتی ہے یہ کبھی بھی ایک حقیقت تھی آج بھی ایک حقیقت ہے اور آئندہ بھی ایک حقیقت رہے گی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو متدن، غیر متدن، مذہبی، غیر مذہبی ہر قسم کے معاشروں میں موجود ہے لیکن مسیحیت اس واضح اور مستقل حقیقت کا انکار کرتی ہے اس لیے کہ اس کی نظر میں رشتہ ازدواج مقدس ہے اور دو ایسے انسانوں کو جو ایک بار رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے اس رشتہ پر قائم رہنا چاہیے خواہ ان کی زندگی جہنم کا نمونہ بن جائے خواہ وہ ایسے ماحول میں رہتے ہوں جو جرم اور فساد کا ماحول ہے مگر اس ضمن میں جو اہم بات نظر انداز کر دی جاتی ہے وہ یہ کہ طلاق کا ایک دفعہ بند کر کے اخلاقی خرابیوں کے بے شمار دروازے وا کر دیے جاتے ہیں۔

## غیر شرعی ازدواج ( CONCOBINAGE )

اجتماعی حقیقتیں، اگر انہیں اپنے اظہار کا مناسب راستہ نہ ملے تو خود اپنے لئے راپیں بنا لیتی ہیں ان کی مثال ایسے پرندوں کی سی ہے کہ اگر ان پر قفس کا دروازہ بند کر دیا جائے تو وہ قفس کی تنیلیوں کو توڑ کر باہر آ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حرمت طلاق کا قانون، غیر شرعی ازدواج کو رواج دینے کا سبب بنا یعنی ایک شوہر جس کے لیے اپنی شرعی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن نہیں رہتا اپنی بیوی سے الگ ہو جاتا ہے مگر اسے طلاق نہیں دے سکتا یہی صورت حال بیوی کے ساتھ پیش آ سکتی ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے سے معذور ہے مگر اس سے طلاق حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے وہ بغیر طلاق کے شوہر سے علائق ہو جاتی ہے پھر دونوں شوہر اور بیوی کسی دوسری عورت اور کسی دوسرے مرد کے ساتھ والبتہ ہو جاتے ہو اور بغیر کسی نکاح کے ازدواجی زندگی بسر کرتے ہیں یہ ایک سنگین اور وحشتناک صورت حال ہے ایسے حملوں کی اولاد اکثر و بیشتر نفسیاتی بیماریوں اور ذہنی، الجھنوں کا شکار ہوتی ہے ان میں شدید مہجر مانہ رجحانات پائے جاتے ہیں اور وہ معاشرے کے امن و سکون کو غارت کرنے کا سبب بنتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ شوہر اور بیوی جن کے درمیان اختلاف اور تضاد پایا جائے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ ہوتے جائیں یہاں تک کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان کے لیے اپنے اختلافات کو حل کرنا اور محبت اور یگانگت کے ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے تو پھر اس مسئلہ کا فطری حل یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

(اور اس علیحدگی کی قانونی شکل طلاق ہے)

اس طرح مرد آزاد ہو کر گھر سے باہر قدم رکھتا ہے اور زندگی کی وسیع اور کشادہ فضا میں اپنی پسند کی عورت کو تلاش کر لیتا ہے جو صحیح معنوں میں اس کے لیے رفیقہ حیات ثابت ہوتی ہے پھر وہ دونوں مل کر ایک نیا گھر بناتے

ہیں اور ایک خوش گوار زندگی گزارتے ہیں۔ یہی صورت عورت کے ساتھ بھی پیش آتی ہے یعنی عورت طلاق کے نتیجے میں آزاد ہونے کے بعد اپنے لیے نیا ساتھی تلاش کر لیتی ہے اور جائز طور پر نیا گھر بسا لیتی ہے اس طرح ایک گھر کی شکست و ریخت دو نئے گھرانوں کی تعمیر کا سبب بنتی ہے۔ پہلا گھر ایک ناپائیدار اور غیر مربوط اکائی تھا اب جو دو گھر بنے ہیں وہ پائیدار اور مربوط اکائیاں ہیں مگر مسیحیت کی مثالیت پسند روش اس حقیقت کو جو معاشرے میں ایک ناقابل انکار وجود رکھتی ہے جس کی واقعیت سے انکار کرنے کی سکت کسی میں بھی نہیں ہے تسلیم نہیں کرتی اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس گھر کو تو تسلیم کرتی ہے جس کا وجود صرف رسمی اور خیالی ہے اور جو حقیقی اور خارجی دنیا میں کوئی وجود نہیں رکھتا جن کا سامانِ تعمیر دوسرے گھروں کی تعمیر میں صرف ہونچکا ہے مگر وہ دو خاندان حقیقت کی دنیا میں جن کا وجود مسلم ہے ان کا انکار کر کے حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور یہی وہ موقع ہے جہاں ہم شریعت قانونِ فطرت اور سماجی حقیقت میں تضاد اور تفاوت کو ابھرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں یعنی ایک خاندان جو حقیقتاً موجود نہیں ہے اسے رسمی سطح پر موجود مانا جاتا ہے جبکہ دوسرے خاندان جو واقعی موجود ہیں جن کا وجود حقیقی دنیا میں مسلم ہے انہیں تسلیم نہیں کیا جاتا اور ان کی شرعی حیثیت کا انکار کر کے انہیں فحشاء و گناہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دراصل مسیحیت کا حقیقت سے انکار اس بات کا سبب بنا کہ دوسرے خاندان جو حقیقی دنیا میں وجود میں آچکے ہیں شریعت کی سند اور حجاز سے محروم ہیں اور وہ بچے جو مرد اور عورت کے اس فطری اور طبعی تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں جو واقعی محبت اور یگانگت کا تعلق ہے انہیں جائز اولاد تسلیم نہیں کیا جاتا اور معاشرہ انہیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے یہ بچے جو خاندان کی پاکیزگی اور معاشرے کے انصاف سے محروم رہتے ہیں اور معاشرہ انہیں قبول نہیں کرتا

اس لیے کہ وہ فرزا ندان گناہ ہیں ناجائز بچے ہیں اپنے حالات اور معاشرے کے رویے کے تحت گونا گوں ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں ان کی شخصیت میں ایسی گڑبگڑیں پڑ جاتی ہیں جو ہزار ہا خرابیوں اور جرائم کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں یہ بچے بڑے ہو کر معاشرے سے اپنی محرومیوں کا ایسا سنگین انتقام لیتے ہیں جس کی ہولناکیاں ناقابل تصور ہیں۔

یورپ اور خصوصاً امریکہ کے معاشروں میں جو کینگیوں اور جرائم نظام ہوتے ہیں پس ماندہ اور غیر متقدم معاشروں میں ان کی مثال نہیں ملتی ان کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ مغربی معاشرے ترقی یافتہ ہیں ان کی ثقافت اور تمدن ان کے ذہنی اور اخلاقی تربیت کے معیار اور انفرادی اور اجتماعی آزادی کا تصور ان کی ترقی کی بولیل ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کی نئی نسل الجھنوں اور پچیدگیوں کا شکار ہے نوجوان نسل داخلی طور پر جرم اور گناہ کے احساس میں گرفتار ہے۔ یہی داخلی الجھنیں ان سنگین جرائم کو جنم دیتی ہیں جنہوں نے آج مغربی معاشروں کو تباہ کر رکھا ہے دراصل جرائم کی یہ بہتات احساس جرم و گناہ میں پرورش پانے والی نسل کا اپنے معاشرے سے ایک سنگین اور خوفناک انتقام ہے۔

میں آپ کو انگلستان کا ایک واقعہ سنا ہوں ایک نوجوان نے ایک ایسا ہتھیار بنایا جسے ہم بہت چھوٹے تیر اور کمان سے تشبیہ دے سکتے ہیں اس حربہ کو اس نے ایک ایسے تختہ کینچے پر شیدہ طور پر نصب کر لیا جسی تختہ پر وہ سگریٹ سہا کر فروخت کرتا تھا اس نے یہ طریقہ بنالیا تھا کہ وہ شاہراہوں اور سینما گھروں میں جہاں لوگوں کا جھوم ہوتا گھوم پھر کر سگریٹ بیچا کرتا اور اس آرڈر میں وہ لوگوں کو ذہنی تیروں کا نشانہ بنایا کرتا جو لوگ ان تیروں کا نشانہ بنتے وہ یا تو مرحلتے یا کم از کم اندھے ہو جاتے پولیس قاتل کو تلاش کرنے میں ناکام رہی اس لیے کہ وہ قاتل کو تلاش کرنے کے لیے قاتل اور مقتولین کے درمیان عداوت اور دشمنی کی کڑیاں تلاش کرتی رہی لیکن یہ کڑیاں پولیس کے ہاتھ نہیں آ سکیں اس لیے

کہ سبقتل قاتل اور مقتولین کے درمیان کوئی ذاتی عداوت نہیں تھا بلکہ وہ خلش تھی جو قاتل کے ذہن میں اس لیے پیدا ہوئی کہ مقتول اس معاشرے کا ایک فرد تھا جس نے قاتل کو مردود اور ناپسندیدہ قرار دیا تھا گویا قاتل کی یہ تمام وارداتیں قاتل کے جذبہ انتقام کی تسکین کا ذریعہ تھیں اور یہ ذریعہ انتقام ایسا شدید اور سنگین تھا جس کی تسکین کسی صورت ممکن نہیں تھی۔

اس طرح کے جرائم معاشرتی حالات سے جنم لیتے ہیں اور معاشرتی حالات میں یہ بیجید گیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ کلیسا نے حقیقت اور واقعیت کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے معاشرے ان مسائل سے پاک ہیں ہمارے معاشرے میں چونکہ طلاق کی اجازت ہے اس لیے ناخاندانہ (خاندانہ نامشروع) وجود میں نہیں آتے اسی طرح ہم نے چونکہ طلاق کو معدوم نہیں کیا ہے تو ہمارے یہاں خاندانہ معدوم، کا کوئی وجود نہیں ہے یعنی ہمارے یہاں ایسے گھر نہیں پائے جہاں اس گھر کے ملکین ایک جبر، زبردستی اور قانونی اور شرعی مجبوری کے تحت رہتے ہیں۔

میں آپ کے سامنے مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک بچہ ہے جو کمرے سے باہر جانا چاہتا ہے مگر سداور، چار دانی اور دوسرے ظروف زمین پر بکھرے ہوئے ہیں جنہوں نے اس کا راستہ مسدود کر دیا ہے وہ بچہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ راستہ سے گزر جائے آنکھیں بند کر کے وہ یہ سمجھتا ہے کہ راستے کی تمام رکاوٹیں خود بخود دور ہو گئی ہیں مثالیت پسند (ایڈولٹ) کی مثال اسی نادان بچے کی سی ہے۔ وہ حقیقت کو نہیں دیکھتا اس لیے کہ وہ حقیقت کو دیکھنا نہیں چاہتا وہ جن چیزوں کو پسند نہیں کرتا ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کیونکہ وہ ان حقیقتوں کو نہیں دیکھ رہا اس لیے واقعی وہ حقیقتیں موجود نہیں ہیں۔

اس کے برعکس ایک حقیقت پسند ہے (ریالسٹ) جو ہر اس شے کو جو باہر

وجود رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی گھناؤنی اور بری ہو محض اس لیے قبول کر لیتا ہے کہ واقعیت کی دنیا میں موجود ہے اور نہ صرف ان موجود حقیقتوں کو قبول کر لیتا ہے بلکہ انہیں اپنا عقیدہ اور ایمان بنا لیتا ہے اس کے برعکس ہر وہ بات، خواہ وہ کسی قدر حسین اور اعلیٰ ہو جو خارجی دنیا میں موجود نہیں ہے اس کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ وہ ایسے تمام اعلیٰ اصولوں اور حسین قدروں کا انکار کر دیتا محض اس لیے کہ اس کے نزدیک وہ مثالی (آئیڈیل) ہیں اور ان کا حقیقت کی دنیا میں وجود نہیں ہے۔

میرا ایک شاگرد تھا جس کا تعلق اس ملک کے دانشور نما، طبقہ سے تھا میں اس سے چلو کچھ بھی گفتگو کروں وہ صرف ایک ہی بات جانتا تھا کہ وہ مارکس کی مادی جدلیات کے عقیدہ کا طرفدار ہے اور میں ایک مذہبی آدمی ہوں جو اسلام پر عقیدہ رکھتا ہے اس وجہ سے اس نے اپنا یہ فرض سمجھ لیا تھا کہ میں جو بات بھی کہوں وہ اسے رد کرے یہاں تک کہ اگر میں کوئی ایسی حقیقت بیان کروں جو مارکس کے نزدیک بھی پسندیدہ ہو اور میں اس بات کا ذکر نہ کروں تو بھی وہ ہمیشہ کی طرح میری بات کی مخالفت کا فرض پورے جوش و خروش سے انجام دیتا تھا۔

ایک دن موضوع گفتگو تاریخ اسلام میں بنی امیہ کا عہد تھا۔ اس عہد میں طبقاتی تقسیم اور سیاسی آمریت کو مذہبی جواز عطا کرنے کے لیے مذہب کی صحیح روش سے انحراف کر کے عقیدہ جبر کو وضع کیا گیا تاکہ لوگ اپنی امیہ کی حکومت کو خدا کی مرضی سمجھ لیں اور وضع موجود کو جبر الہی ثابت کیا جاسکے میں نے اس ضمن میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا جو حکومت کی اس سازش کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے۔

اس مرحلہ پر میں نے دیکھا کہ میرا وہ طالب علم کبیدہ خاطر ہو گیا ہے۔ میں نے مزید وضاحت کی کہ میں بنی امیہ کا ذکر کر رہا ہوں اور ان کے مقابلے میں میں فاطمہ، علیؑ، ابوذرؓ، حجرؓ اور حسینؑ جیسی ہستیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

جو تحریک عدل آزادی کی راہ پر اور ظلم و جہالت کے خلاف جہاد کی علامت ہیں اور پھر یہ کہ ان کا جہاد محض زبانی، نظری یا مابعد الطبیعیاتی سطح تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسا عملی جہاد تھا جس کی اساس سماجیات کے حکم علمی اصولوں پر تھی جو ایک ایسی آئیڈیولوجی پر منحصر تھا جو طبقاتی تقسیم کے خلاف اور عوامی ترقی کی علمبردار ہے لیکن ہمارے اس طالب علم نے جس کا تعلق خود ساختہ دانشوروں کے طبقہ سے ہے میری ان معروضات کو اپنے مخصوص نکتہ نظر سے دیکھا کیا آپ جانتے ہیں کہ اس نے ان خیالات کی کس طرح پذیرائی کی۔ اس نے کہا جناب یہ جبر تاریخ ہے مارکس کا فلسفہ تاریخ یہی ہے کہ معاشرہ اپنے ارتقائی سفر میں اپنے تقاضا اور تضادم کے مراحل سے گزرتا ہے۔ معاشرے کے ارتقائی سفر کو روکا نہیں جاسکتا یہ ایک معروضی اور تاریخی حقیقت تھی۔ علی، حسین اور ابو ذرؓ (آئیڈیلسٹ) شالیت پسند تھے وہ جبر تاریخ کے خلاف صف آراء تھے۔

میں نے اس طالب علم کی اس منطق کو سن کر کہا کہ اگر روشن فکری کا طرز فکر یہی ہے تو حذر اگرم کرے اس موقع پر میں نے اپنے اس خیال کی صداقت کو بڑی شدت سے محسوس کیا کہ جب کسی معاشرے کی سطح فکر و نظریات ہو جاتی ہے تو پھر مذہبی اور غیر مذہبی، ترقی پسند اور رجعت پسند، عالم اور جاہل کا فرق بھی ختم ہو جاتا ہے اور سب کے سب اس تنزل اور پستی کا شکار نظر آتے ہیں جب مذہب کا دور دورہ ہوتا ہے تو لوگ قضا و قدر کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں اور قضا و قدر کو جبر الہی سمجھتے ہیں وہ اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مشیت اور اس کی مرضی کے مطابق ہے یعنی انسان ان حالات کو قبول کرنے میں مجبور اور بدلنے سے معذور ہے، اور جب مارکسز کے اثرات غالب ہوتے ہیں تو جبر الہی کا عقیدہ جبر تاریخ کے تصور سے بدل جاتا ہے پھر یوں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسباب و علل کا ایک منطقی اور علمی نتیجہ ہے اور علت اور معلول کی اس زنجیر کو توڑنا انسان کے عزم و ارادے کے



دائرے سے باہر ہے انسان حقیقت اور واقعیت کو قبول کرنے پر مجبور ہے۔  
کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ تاریخ اسلام میں بنی امیہ نے اپنے اعمال  
کو دینی جواز فراہم کرنے کے لیے جو عقیدہ جبر وضع کیا تھا آج کے دور میں  
ہمارے خود ساختہ دانشور مارکسزم کے فلسفہ کی رو سے اس عقیدہ جبر الہی کی نئی  
ترجیمہ کر رہے ہیں اور اسے جبر تاریخ کا نام دے رہے ہیں۔

مگر اس دانشورانہ منطق کے جواب میں مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ  
”جناب! یہ جبر تاریخ نہیں ہے یہ جبر شمشیر ہے“

بدقسمتی سے ہمارے اکثر و بیشتر نیم دانشور طاقت کے جبر اور حالات یا تاریخ  
کے جبر کو ایک ہی بات سمجھ لیتے ہیں حقیقت پسند حضرات ایک قدم آگے بڑھا کر جو  
کچھ ہے اور جو ہونا چاہیے کا فرق بھی ختم کر دیتے ہیں ان کے خیال میں جو بات جیسی  
کچھ بھی ہے ویسی ہی ہونی چاہیے تھی ان کے خیال میں کسی بات کے متعلق یہ کہنا  
کر اسے یوں ہونا چاہیے تھا ایک مثالیت پسندانہ طرز فکر ہے جس کا تعلق حقیقی دنیا  
سے بہت مبہوم ہے اس منطق کی رو سے انگلستان کا راکین پارلیمنٹ کا یہ  
استدلال ہے کہ ہمارے معاشرے میں ’لواطت‘ ایک موجود حقیقت ہے اس لیے  
اسے قانونی جواز فراہم کر دینا چاہیے اس حقیقت موجود کی مخالفت ایک طرح سے خیالی  
دنیا کی باتیں کرنا ہے آئینڈ میززم ہے۔

کیا آپ نے ایسے سیاست دانوں اور جھوٹے دانشوروں کو نہیں دیکھا کہ جو یہ  
استدلال پیش کرتے ہیں کہ اسرائیل ایک ایسی حقیقت اور واقعیت ہے جو موجود ہے  
اس کے برعکس فلسطین میں ان فلسطینیوں کی آباد کاری جنہیں اسرائیل نے دھونس  
اور دھاندلی کے ذریعہ ان کی اپنی زمین سے نکال دیلے خواب و خیال کی باتیں  
ہیں۔ آئیڈیل کی پرستش کرتا ہے اسرائیل اقدام ظلم ہے قتل و غارت گری ہے۔  
انسانیت دشمنی ہے لیکن اس سب کے باوجود ایک واقعیت ہے ایک حقیقت ہے  
جسے قبول کرنا ضروری ہے۔

مجلہ، اس ہفتہ، جو حال ہی میں نوجوانوں کے لیے جاری کیا ہے اس سال کے تمام مضامین، خبریں، فیچر تصاویر، غرض اس کا تمام مواد درحقیقت صرف روایتیں شخص لکھے ہیں مگر ان کی تحریریں مختلف قلمی ناموں سے شائع ہوتی ہیں یہ قلم کار تنقید کی آڑ میں، فحاشی کے اڈوں کی کہانیاں تمام جزئیات اور تشریحات کے ساتھ تحریر کرتے ہیں اور پھر یہ رنگین تحریریں اور تصویریں ہماری نئی نسل کی معلومات اور دلچسپی کے لیے شائع کی جاتی ہیں ایک مضمون جو درحقیقت ایک چوٹی کے قلم کار نے تحریر کیا ہے اور یہ قلم کار ایک علمی اور سیاسی شخصیت اور اسلامی ثقافت کا علمبردار ہے اس مضمون میں ان خواتین کو جو اپنے جسم کی فربہ سے پریشان ہیں مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ موٹاپے سے نجات پانے اور اپنے جسم کو سڈول اور دلکش بنانے کے لیے کوئی عاشق، فاسق تلاش کر لیں غالباً محترم لکھنے والوں نے ان ترکیبوں کو پہلے خود آزمایا ہوگا اور پھر اپنے عملی تجربات نوجوانوں کے فائدے کے لیے بیان کئے ہیں۔

سیاسی استعمار اقتصادی استحصال اور طبقاتی تضاد بھی ایک واقعیت ہے حقیقت پسندان حقیقتوں کو واضح اور روشن طور پر دیکھتا ہے وہ ان کے بالے میں کوئی تردد یا تکلف نہیں کرتا حقیقتیں جو عینی اور خارجی وجود رکھتی ہیں جو دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہیں انہیں وہ بلا تاامل قبول کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو آئیڈیل (مثالیت پسندی) کے تصور میں نہیں الجھتا ایک آئیڈیلسٹ ایک مثالیت پسند مفکر جو معاشرے کی اصلاح اور ترقی کا خواہشمند ہے اس کی نگاہ ہمیشہ بلند اصولوں، اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مثالی امکانات پر ہوتی ہے اور وہ ناپسندیدہ حقائق جو اس مثالیت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور جو حقیقت کی دنیا میں اس طرح موجود ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں ہے اس کی آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں وہ ان حقیقتوں سے آنکھیں چار نہیں کرتا جو باتیں اسے ناپسند ہیں ان سے کنارہ کشی اختیار کر کے خود کو ایک مثالی، حسین مگر خیالی دنیا میں محصور

کر لیتا ہے اور اس بات کا احساس نہیں کرتا کہ وہ جس دنیا میں موجود ہے وہ یہ خیالی اور مثالی دنیا نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جس کے حالات اور ماحول مثالی نہیں ہے لیکن وہ اس دنیا کے حقائق کے بارے میں کوئی غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا گویا اس کے نزدیک یہ حقیقتیں کوئی وجود نہیں رکھتیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عملاً ایسی دنیا میں رہتا ہے جو موجود ہے۔

مگر سوچنا ہے اس دنیا کے متعلق جو ”مردم، اور غیر موجود ہے وہ گفتار میں سب سے آگے مگر عمل میں سب سے پیچھے ہے وہ ایک ایسے معاشرے کی تعبیر کرتا ہے جو مثالی ہے نقصان سے پاک ہے لیکن یہ جیتے جاگتے انسانوں کا معاشرہ نہیں ہے۔ لفظوں کا معاشرہ ہے یہ ایک خیالی دنیا ہے ایک یونٹوپیا ہے مدینہ افسلاطون ہے جو مدینہ محمد سے مختلف ہے۔

اس کے برعکس حقیقت پسند (ریالسٹ) فکر کی پرواز، قلب و نظر کی ترقی اور تلاش کمال کے جذبہ کو آدمی سے چھین لیتا ہے اسے عالم موجود، حلقہ میں بند اور اقتدار و وضع موجود کے حصار میں قید کر دیتا ہے۔ انسانوں خلافت اور بغاوت کی استعداد سے محروم کر کے اس کی ان تمام صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتا ہے جو زندگی میں کوئی گہری تبدیلی لانے اور جبر تارخ اور جبر معاشرت کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کرنے کا سبب بنتی ہے وہ انسانوں کو خوب سے خوب تر کی تلاش سے روک دیتا ہے ان کی فکری اور عملی صلاحیتوں اور وضع موجود کو بہتر بنانے کی خواہش اور تمنا کو دبا اور مٹا کر انہیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ واقعیت کو تسلیم کر لیں اور جو کچھ بھی اور جیسا کچھ بھی ہے اس کے آگے سر جھکا دیں گویا حقیقت پسندی اگر بھوک کی شخصیت کو مسموم کرتی ہے تو مثالیت پسندی اس کی بھوک کی حقیقت ہی سے انکار کر دیتی ہے

## نہ صرف مثالیت پسندی نہ صرف حقیقت پسندی بلکہ دونوں

اسلام وہ چراغِ ہدایت ہے جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی بلکہ یہ وہ کلمہ طیبہ ہے جس کی مثال ایک ایسے پاکیزہ درخت در شجر طیبہ سے دی گئی ہے جس کی جڑیں زمین میں ہیں اور جس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام ان حقیقتوں کو جو زندگی میں روح و جسم میں معاشرتی روابط میں معاشرہ کی بنیاد میں حرکت تار و پود میں موجود ہیں تسلیم کرتا ہے اسلام کی یہ روش مثالیت پسندی کی ضد ہے اور حقیقت پسندی کی روش کے مماثل ہے لیکن اسلام حقیقت پسند مذہب فکر کے برخلاف ان حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود قبول نہیں کرتا بلکہ ان کو بدلتا ہے ان کی ماہیت کو اپنی انقلابی روش کے ذریعہ متغلب کرتا ہے انہیں اپنے آئینہ دل کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے ان موجود حقیقتوں کو اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے جو حقیقت پسندوں کی طرح حقیقت موجود کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا بلکہ پوچھتا ہے حقیقت کو اپنی حقیقت مقصود کے تابع کر لیتا ہے اسلام مثالیت پسندوں کی طرح حقیقت سے گریز نہیں کرتا ان کا سراغ لگاتا ہے ان لبگام دیتا ہے انہیں رام کرتا ہے اور اس طرح وہ حقیقتیں جو مثالیت پسندوں کی راہ کا پتھر تھیں اسلام انہیں اپنا مرکب بنا لیتا ہے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ان سے سوار یوں کا کام لیتا ہے

شلاً غیر شرعی ازدواج (CONCOBINES) کے مسئلہ کو لیجئے جو یورپ میں ایک غیر قانونی، ناپاک اور قابل نفرت حقیقت سمجھے جانے کے باوجود پوری قوت کے ساتھ موجود ہے اور یورپی ممالک کے علاوہ امریکہ اور بہت سے دیگر مذہبی ممالک اور مذہبی گروہوں میں نہ صرف رائج ہے بلکہ مزید پھیلتا جا رہا ہے اسلام نے مخصوص حالات اور شرائط کے تحت طلاق اور اس کے بعد دوسری شادی

کی اجازت دیکر ایک حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ حقیقت کو تسلیم نہ کرنے سے حقیقت مٹ نہیں سکتی بلکہ اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور اس کے ساتھ ہی آپ کے دسترس اور قابو سے باہر ہو جاتی ہے اسلام نے اس حقیقت کو تسلیم کر کے اس پر تسلط حاصل کر لیا اسے قانونی اور شرعی جواز عطا کر کے اسے اپنی شریعت اور قانون کا پابند کر دیا۔ طرفین کو اپنے مقررہ اصول و شرائط کا پابند کر کے انہیں احساس جرم و گناہ سے نجات دی اور خلق خدا کی نگاہوں میں مردود و مجرم ہونے سے محفوظ رکھا ہے لہذا زطلاق شادی کو اخلاقی اور مذہبی تحفظ فراہم کر کے ان کی اولاد کے لیے پاک و پاکیزہ اور فطری ماحول فراہم کیا اور ان بچوں کو معاشرے کی نظر میں، حقیر، ناپاک، نجس، ناجائز اور مردود ہونے سے نجات دی۔

اسلام ان تمام حقیقتوں کو قبول کرتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی سطح پر بطور ایک واقعیت موجود ہیں ان حقیقتوں کا اعتراف کر کے اسلام انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور نتیجتاً ان کے نتائج اور حقائق کو بدلنے کی قدرت حاصل کر لیتا ہے اسلام ان حقیقتوں کی شکل میں ضروری اصلاح کر کے انہیں مذہبی اور اخلاقی سانچے میں ڈھال دیتا ہے نتیجہ یہ کہ حقیقت کی ہیئت اور ماہیت دونوں کی اصلاح ممکن ہو جاتی ہے یہ حقیقت موجود اس کا اعتراف ہے جو ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم ان موجود حقیقتوں کی اصلاح کر سکیں ان پر قابو حاصل کر سکیں ان پر تسلط پاسکیں حقیقت موجود کا انکار کر کے ہم حقیقتوں کو خود پر مسلط کر لیتے ہیں پھر جملے اس کے کہ ہم ان حقائق کو اپنی مرضی اور ارادے کے مطابق بدل سکیں یہ حقائق ہمیں اپنی مرضی اور ارادے پر چلائے ہیں جدھر چاہتے ہیں، بہانے جلاتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک حقیقت پسند کے مقابلہ میں جو ہر حقیقت موجود کو خواہ وہ ابھی ہو یا بری قبول کر لیتا ہے ایک مثالیت پسند جو ہمیشہ حقیقت پسند بلوٹی کر کے خیالی اور مثالی باتوں کے متعلق سوچتا ہے اپنی عملی زندگی میں ان موجود حقیقتوں کے آگے زیادہ عجور اور بے بس نظر آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے

کہ حقیقت پسند تو حقیقتوں کو جانتا اور پہچانتا ہے لیکن مثالیت پسندان کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں اور جب وہ محلی زندگی میں ان حقیقتوں سے دوچار ہوتا ہے تو بری طرح مغلوب ہو جاتا ہے۔

کیا ہم نہیں دیکھتے کہ وہ لڑکیاں جو قدامت پسند ماحول میں پرورش پاتی ہیں اور جو اپنے گھر کے پائین باغ میں سیر کرتے اور حوض کا نظارہ کرنے وقت بھی اپنے جہروں کو نقاب سے چھپائے رکھتی ہیں کہ کہیں حوض کی نرمچھلیاں ان کے چہرے کو نہ دیکھ پائیں وہ جب علمی زندگی میں قدم رکھتی ہیں تو انہیں کس قدر دشوار بان پیش آتی ہیں کیونکہ وہ اپنے دست و بازو سے کام لینے اور وقت کے دربا میں تیرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہیں اس لیے وقت کے سیلاب کی تند موجیں انہیں غرق کر دیتیں ہیں یہی حال ان نوجوانوں کا ہے جنہیں روایت پسندی اور قدامت پسندی کے حصار میں مقید رکھا جاتا ہے وہ قرون وسطیٰ کے ماحول میں پرورش پاتے ہیں سائنسی علوم ان کے لیے شجر ممنوعہ ہیں یونیورسٹی اور کالج کی تعلیم کے دروازے ان کے لیے بند ہیں ان کی وضع قطع ان کی ہیئت ان کی شکل و صورت ان کا لباس ان کا رہن سہن طرز گفتگو، آداب نشست و برخاست سب اسی قدیم وضع پر قائم ہیں وہ ٹیکسی کے بدلے گھوڑا گاڑی میں سفر کرتے ہیں لائڈ اسپیکر اور ریڈیو کے استعمال سے ناواقف ہوتے ہیں جدید دنیا کے حقائق و مسائل سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر جب انہیں علمی زندگی کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ان کی کیا حالت ہوتی ہے وہ جدید تہذیب و تمدن کی چکا چوند سے کس قدر متاثر و مغلوب ہو جاتے ہیں جدید تہذیب و ثقافت کی نقالی وہ اس بھوندے طریقے سے کرتے ہیں اور اس قدر بے اعتدالی اور فضول خرچی کا مظاہرہ فرماتے ہیں کہ خود جدید تہذیب کے علمبردار، مغربی دنیا کے لوگ ان پر ہنستے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہیں ان کو ایرانی اور تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اس لیے کہ مغربی دنیا کے دانشور کے لیے جدید تہذیب و ثقافت ایک حقیقی واقعیت ہے جسے انہوں نے فطری

طور پر قبول کیا ہے وہ ان کے لیے ایک فطری اور طبعی حقیقت ہے جبکہ ہمارے لیے صورت حال اس کے برعکس ہے ایک طرف تو ہم ان واقعتوں کا انکار اور ان سے انصاف کرتے ہیں ان سے اپنا دامن کھینچتے ہیں دوسری طرف جب وقت اور حالات ہمیں ان موجود حقیقتوں کے روبرو کر دیتے ہیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں چونکہ ہم پہلے سے ان مسائل سے واقفیت نہیں رکھتے اس لیے ہم ان میں اچھی اور بری حقیقتوں کا انتخاب نہیں کر سکتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان حقیقتوں کو اپنے طور پر چنتے اور یہ موجود حقیقتیں ہمیں اپنے لیے چن لیتی ہیں۔

ہماری دنیا پر تمدن جدید کا حملہ بڑا ہمہ گیر اور ہمہ جہتی حملہ ہے ماضی کے تمام سرچشے خشک ہو گئے تمام مینار منہدم ہو گئے تمام آئنا مرث گئے نشاۃ ثانیہ قرون جدید کا ظہور فکر و نظر میں روشن فکری کی انقلابی تحریک فرانس کا صنعتی انقلاب ایسے پے درپے عوامل ہیں جنہوں نے دنیا کے نقشہ کو بدل دیا فکری اور نظری ماحول میں عوامی انقلاب برپا کر دیا ہمارے ملک کا اس تغیر و تبدیلی سے متاثر ہونا ناگزیر ہے ایک جبری اور فطری عمل ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو جلد یا بدیر واقع ہو کر رہے گی۔ برق، مشین، پریس، یونیورسٹی، جمہوریت، ریڈیو، ٹیلیفون، سینما، اخبار، مطبوعات، مغربی تعلیم، بیرونی درس گاہوں کی تعلیم، جدید علوم، جدید ٹیکنک، آزادی، حقوق انسانی کا تصور، عورتوں اور مردوں کی مساوات کا لغوہ اور تمدن جدید کے دوسرے مظاہرے ہمارے انفرادی اور اجتماعی معاملات پر اثر انداز ہو کر رہیں گے جن کے نتیجے میں ہماری فکر، ہماری سوچ، ہماری رسوم و رواج ہمارے اجتماعی روابط، ہمارا معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچہ ہماری سیاسی ہیئت غرض ہماری زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں انقلابی تبدیلیوں کا رونما ہونا ایک بدیہی اور فطری حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

اور تمدن جدید کے اس تند و تیز حملے سے نمٹنے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں  
ہمارے رہبر ان عوام وہ لوگ جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے محافظ اور نگہبان  
اور اس کی اصلاح و ہدایت کے ذمہ دار ہیں انہوں نے ان واقعیتوں کی طرف  
سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں انہوں نے اپنے آپ کو محض خیالی اور مثالی باتوں  
کے لیے وقف کر دیا ہے وہ قدیم افکار و مسائل میں غرق ہے نہ صرف یہ بلکہ  
ان کی ذہنیت قدامت پسندانہ ہے وہ ٹیٹھی کے مقابلہ میں گچی کو تحفظ دیتے ہیں  
برق کی روشنی میں چراغ جلائے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ جدید تمدن کفار  
سے منسوب ہے جبکہ قدیم آثار، قدما کی نشانی ہیں ان کا خیال ہے کہ ہمارا  
ماضی سے تعلق و فکری، ثقافتی اور روحانی (صرف اسی صورت میں قائم رہ  
سکتا ہے جب ہم وضع قدیم پر قائم رہیں نیکر کے پیرے بنے رہیں اور کسی بھی نئی تبدیلی  
کو قبول نہ کریں۔

اس مرحلہ پر یہ نہ بھولیے کہ یہ کوئی بے خبر اور بے نظر افراد نہیں ہیں یہ وہ  
صحابانِ فکر و نظر ہیں جو حالات کا صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یہ،  
درست طور پر اس بات کی پیش بینی کرتے ہیں کہ تمدن جدید کا سیلاب ہمارے معاشرے  
کو فکری اور اخلاقی اعتبار سے پستی کی طرف بھجائے گا یہ جدید حقیقتیں اور  
یہ تازہ واقعات جو ظہور میں آتے ہیں ہماری ثقافت، ہماری اقدار، ہماری  
روحانی پاکیزگی، ہمارے ایمان و تقویٰ ہمارے معتقدات، ہمارے ایمان غرض  
ہماری تمام فکری اور ثقافتی زندگی پر منفی اثرات مرتب کریں گے انہیں آلودہ  
کیٹف اور غیر صحت بخش بنادیں گے لیکن حالات کے اس نہایت طاقتور سیلاب  
کے مقابلہ میں کوئی موثر بند نہیں باندھا ہمارا جدید مغربی تہذیب اپنے اثرات  
کے لحاظ سے سحرانہ قدرت رکھتی ہے وہ انتہائی دور افتادہ اور پس ماندہ  
معاشرہ کو یہاں تک کہ صحرائین بدوی قبائل تک کو متاثر کر سکتی ہے۔  
لیکن اس کے ان ہمہ گیر اثرات کو روکنے کے لیے ہمارے یہ مقدس رہنما کیا کر رہے



ہیں وہ نقطہ اور فقط ایک جملہ بول دیتے ہیں "حرام است"

ریڈیو مت خریدو، فلم! مت دیکھو، ٹیلیوژن! مت سنا! لاؤ اسپیکر! مت استعمال کرو، یونیورسٹی! مت داخلہ لو، علوم جدید مت حاصل کرو، روزنامہ! مت پڑھو، ووٹ! مت استعمال کرو، ادارہ! میں کام! مت کرو اور عورت! خبردار عورت کا نام بھی زبان پر مت لاؤ

اس طاقتور صنعتی انقلاب کے مقابلے میں جس نے تمام دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے اور اس زبردست سرمایہ دارانہ تہذیب کے مقابلے میں جو پتھر میں جو تک لگانے کی صلاحیت رکھتی ہے ہمارے یہ فکری قائدین ایک خاموش تماشا کی طرح کھڑے ہوئے اس بات کی توقع کر رہے ہیں کہ وہ اس انقلابی سیلاب کو پوری طرح اثر انداز ہونے سے روک دیں گے وہ ماضی کو جوں کا توں برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن اس فکری اور ثقافتی جنگ میں اس صنعتی یلغار سے دفاع کے لیے ان کی تمام فوج اور تمام حربے صرف دو چیزوں پر مشتمل ہیں۔

ایک کلمہ اور ایک حرف اور بس

کلمہ - حرام!

حرف نہ (نہیں)

نتیجہ صاف ظاہر ہے یہ انقلابی عوامل جدید تمدن کی حقیقتیں ہر چیز کو توڑ پھوڑ دیتی ہیں۔ ماضی کے تمام اقدار و آثار معدوم ہو رہے ہیں اور ہم اس حملہ سے اپنا دفاع کرنے کی بجائے اس سے غفلت برت کر حملہ آور کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ اس کے غلبہ کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں یہ سیلاب ہر چیز کو تباہ کر رہا ہے۔ ریمباد کر رہا ہے جیسے مکار لوہڑیوں کے غول، بھیڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ، گدھوں کی فوج اور ایسے خونخوار کتوں کی ٹولیاں جن کی زنجیریں کھول دی گئی ہوں آبادیوں میں گھس آئیں اور انہیں تاخت و تاراج کر دیں

وہ چوہے کہ جو چوڑی چھپے غلہ کے ڈھیر کو تباہ کر دیتے ہیں رفتہ رفتہ ہماری دولت کو خون کی طرح جو سے جا رہے ہیں ان تباہ کن عوامل سے کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ شہر آبادی، بازار، مسجد، دکانیں یہاں تک کہ ہمارے گھر تک اس تباہی کی زد پر ہیں سیلاب تباہی نے ہر چیز کو اپنی پیٹ میں لے لیا ہے۔ جنگیزی لشکر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ طوفانِ بلا کی طرح آیا، لوٹ مار، قتل و غارت آتش زدگی کا بازار گرم کیا ہر چیز کو تاخت و تاج کیا اور پھر واپس چلا گیا۔ مگر یہ لشکر بے اماں وہ ہے جو واپس جانے کے لیے تیار نہیں ہے کیوں؟ اس لیے کہ یہ دشمن ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے ہمارے میدانوں کے نگہبان اور ہماری چوکیوں کے محافظ اس سے اس قدر بیزار اور متنفر ہیں کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتے ان حقیقتوں کو سمجھنے اور انہیں خوب و بد کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت نہیں فرماتے ان کی اصلاح کر کے ان کو ہمارے ماحول ہماری وضع و معیار اور ہمارے لوگوں کے مزاج کے مطابق ڈھال کر ان کو ایسی سواروں میں تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے جو ہمارے سفرِ ترقی میں ہمارے کام آسکیں اس کے برخلاف ہم نے انہیں بے قید اور بے لگام چھوڑ دیا ہے یہ تیز رفتار سواریاں بغیر کسی ڈرائیور کے پوری رفتار سے دوڑ رہی ہیں اور ہم ان کی راہ میں سڑک کے عین وسط میں آنکھیں بند کئے کھڑے ہیں تاکہ یہ تندروسواریاں ہمیں روندتی اور کچلتی ہوئی گزر جائیں۔

اور ہمارے اس رویہ کا یہ نتیجہ ہے کہ آج پر وہ نشیں عورتیں وضع حمل کے موقع پر احتجاج کرتی ہیں کہ ”مرد ڈاکٹر کیوں! عورتوں کے لیے خواتین ڈاکٹر کیوں نہیں ہیں؟“

پھر جب وہ اپنے بچوں کو کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے بھیجتی ہیں تو ان کی احتجاجی آواز اور بلند ہو جاتی ہے ”یہ درس گاہِ فنون ہے یا فیشن شو؟“ کیا یہ کسی اسلامی معاشرے کا تعلیمی ادارہ ہے؟ ”اس

مدرسہ سے تو اسلام اور اس کے اخلاق و اقدار کی کوئی ہک نہیں آتی۔ کیسی مذہبی مملکت کا ریڈیو ہے؟ یہ ٹیلیوژن، یہ مطبوعات یہ مجلس قانون ساز اور اس کے وضع کئے ہوئے قوانین۔ یہ بینک جو قانونی طور پر سود کا کاروبار کرتے ہیں یہ کس تمدن کی غمازی ہے۔ یہ فلم یہ تریجے، یہ فن، یہ صنعت و حرفت یہ سب کیا ہے ان کے پس پردہ کیا ہے انہیں یہ کیسا تمدن ہے اور یہ کس کا تمدن ہے۔

ہر چیز کہ یہ سب اعتراضات درست ہیں لیکن ان سب اعتراضات کے جواب میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اعتراض کا حق نہیں ہے اس لیے کہ بقول حافظ۔

”دو چو قسمت از بی حضور ماکردند  
گر اندکی نہ بد رفتی رضا است خودہ منگیر“

لیکن ہم جن صورت حال سے دوچار ہیں اس کے متعلق حافظ کے قول کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ”اگر سب کچھ ہماری مرضی کے خلاف ہے تو بھی پرواہ نہ کرو“

جس وقت واقعی ظہور پذیر ہوتی ہیں اپنے پاؤں جماتی ہیں اپنے کام کا آغاز کرتی ہیں اس وقت تم غائب ہو جاتے ہو میدان سے بھاگ جاتے ہو تم کہ صاحب تقویٰ و مذہب و اخلاق و اسلام ہو تم کہ عوام کے نگہدار معاشرے کی روحانی اور فکری قدروں کے ذمہ دار اور تمدن و ثقافت اسلام کے محافظ ہو تم اس میدانِ نبرد کو چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ صنعتی تمدن اور علم جدید معاشرہ پر اپنا تسلط جمالیتا ہے

حالات کا دھارا جس رخ پر بہہ رہا ہے اس کو روکنے اور صنعتی تمدن کے سیلاب کی راہ میں بند باندھنے کے لیے بڑی زبردست جدوجہد اور احساسِ ذمہ داری اور آگاہی کی ضرورت ہے یہ راہ پر خطر راہ ہے

یہ ذمہ داری مکر توڑنے والی اور یہ مسئولیت اختیار طلب ہے۔

وہ لوگ جو عوام کو جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں انہیں صبر و سکون کی تلقین کر رہے ہیں ان کو ان چیزوں کی بقا اور تحفظ کی آس دلا رہے ہیں جن کا باقی رہنا ممکن نہیں ہے اس بیمار کی صحت کے بارے میں تسلی دے رہے ہیں جو مرنے والا ہے جو لوگوں کو حقیقی خطرات سے آگاہ نہیں کر رہے ہیں وہ اس معاشرہ کو ان خیالی اور فرضی باتوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں جو قبول کئے جانے کے قابل نہیں ہیں وہ لوگوں کو غفلت کا شکار کر رہے ہیں وہ معاشرے کو کمزور، جامد اور غیر فعال بنانے کے ذمہ دار ہیں۔

وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ معاشرہ فعال اور متحرک ہو وہ ان کو راند کا چیزوں کا دفاع نہیں کرتے جو اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا دفاع کیا جائے وہ دھوکے کے ذریعہ عوامی مقبولیت حاصل نہیں کرتے وہ مذہب و باتوں کی مدح و ثناء نہیں کرتے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والے اور حقیقت کے آگے سے فرار کرنے والے نہیں ہیں وہ موجود حقیقتوں کو، ان قصبات کو جو ہمارے معاشرہ پر اثر انداز ہو رہی ہیں نظر انداز نہیں کرتے ان کا اعتراف کرتے ہیں ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں اور معاشرے کو ان کے مضراثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے پوری قوت اور شدت سے جدوجہد کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ زمانہ ساکن نہیں ہے متحرک ہے معاشرہ ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر قائم نہیں رہتا بلکہ اپنے پیر بن تبدیل کرتا رہتا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ دنیا کے طاقتور ترین انقلابی عمل کا رخ ہماری طرف ہے اور وہ ہمارے معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کا قصد کئے ہوئے ہے

یہ وہ لوگ نہ اس قدر بے حس اور بے درد ہیں کہ حالات کو ایک خاموش تماشا کی طرح دیکھتے رہیں۔ نہ اتنے بے شرم اور بے غیرت ہیں کہ کسی

بھی ہاتھ میں کھلونا بن جائیں اور نہ اس قدر بے شعور ہیں کہ جب یہ دیکھیں کہ سیلاب بلا شہر کو اپنی زد میں لیے ہوئے ہے۔ اپنے گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھے رہیں اور یہ سمجھ لیں کہ اس طرح وہ اور ان کے بیوی بچے بتا ہی سے محفوظ رہ سکیں گے وہ اس قدر ناہنم اور غلط ہیں انہیں ہیں کہ حال اور ماضی کے فرق کو نہ سمجھ سکیں یہ نہ سمجھ سکیں کہ آج صورتحال ماضی سے یکسر مختلف ہے آج کے دور میں کوئی خاندان معاشرے سے الگ ہو کر اپنے حصار میں بند نہیں رہ سکتا۔ آپ اپنی بیٹی کو خواہ گھر کے عقبی حصہ میں بند کر دیں مگر ٹیلیوژن اس کا تعاقب کرے گا اس تک رسائی حاصل کر لے گا ٹیلیوژن کے پروگراموں کے ذریعے وہ قومی اور بین الاقوامی رجحانات سے مربوط رہے گی۔ اور تمدن جدید کی دلفریبیوں اور رنگینوں سے متاثر ہوتی رہے گی۔

## باب پنجم

### تعمیر شخصیت کے دو قالب

ہمارے معاشرے میں اس وقت دو قالب ہیں جن میں انسان خود کو ڈھال سکتے ہیں دوسرا نچے ہیں جن کے مطابق اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکتے ہیں اس طرح ہمارا معاشرہ انسانوں کی دو قسموں (TYPES) میں بٹا ہوا ہے ان میں سے ایک قسم وہ ہے کہ جو اس روایت کہہ پر قائم ہے جسے مذہب اور اخلاق کا نام دے دیا گیا ہے یہ گروہ چاہتا ہے کہ زمانہ کے رجحانات اور دباؤ کے علی الرغم اپنی وضع قدیم اور روایت کہہ کو معاشرہ میں نافذ کرے حالانکہ اس روایت میں نفوذ کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے اس بات کو جاننے کے باوجود کہ یہ روایت کہہ اپنی توانائی کھو چکی ہے یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل بھی ان کے قالب میں ڈھل جائے ان کا عکس اور ان کا نمونہ بن جائے

دوسری طرف لوگوں کی وہ قسم ہے جو دانشوری حیدت اور ترقی پسندی کے نام پر انسانی آزادی کے نام پر جدید نسل کو بالکل آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ دراصل یہ لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ نئی نسل کے معاملات میں مداخلت کریں گے ان پر کوئی حکم چلا نہیں گے ان کو نیک اور بد کی امر اور نہی کریں گے تو انہیں قدامت، مشرقیت اور پس ماندگی کا طعنہ دیا جائے گا انہیں مذہبی اور مومن کہہ کر ان کا مذاق اڑایا جائے گا اس لیے وہ سماجی حالات کے تعبیر اور اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی ترقی پسندانہ روش کو ایک خاموش تماشا بننے دیکھتے رہتے ہیں وہ ترقی پسندی کے اس کھیل میں ایک نقش کا کردار ادا کرتے

ہیں یعنی۔ ان کی اولاد ترقی پسندی کے امکانات پر عمل کرتی ہے اور ماں باپ اپنی اولاد کے لیے یہ امکانات فراہم کرتے ہیں تاکہ انہیں ران ماں باپ کو دانشور، روشن فکر کہا جائے لیکن اپنی اولاد کی روش کے بارے میں ان کا سلوک اور رضامندی کا اظہار کسی دانشوری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ یہ خوف اور اندیشہ کار فرما ہے کہ اگر ہم نے نئی نسل کو ٹوکے یا انکی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی تو ہماری عزت و احترام کا ظاہری پردہ بھی چاک ہو جائے گا۔ اور ہم حقیقتاً جس صنغ اور بیچارگی کا شکار ہیں وہ پوری طرح آشکار ہو جائے گی اور ہماری اولاد ہماری ہر بات کو حقارت سے رد کرے گی یہ دو قالب ہیں۔ دوسرا بچے ہیں جن میں انسان ڈھل سکے ہیں یہ دو قسمیں ہیں جن میں انسان بے ہوئے ہیں ان میں سے ایک قسم ماضی کی روایت سے اس طرح چبٹی ہوئی ہے کہ وہ کسی تغیر یا تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور دوسری قسم جدید تہذیب و ثقافت کی اندھا دھند نفاتی پر اس طرح کمر باندھے ہوئے ہے کہ اس نے برے بھلے کی تمیز کو ختم کر دیا ہے یہ دو قسمیں ہیں لیکن دونوں غلط ہیں یہ دو راستے ہیں مگر دونوں گمراہی کے راستے ہیں اس لیے کہ ان میں سے ایک گروہ حقیقت اور واقعیت کے سیلاب کو روکنا چاہتا ہے مگر اس سیلاب کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے وہ آہ و ناری نالہ و فریاد طعن و تشنیع اور لعنت و ملامت کے ذریعے اس سیلاب کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے اور انسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جس نے خود کو اس سیلاب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے یہ وہ زندہ ہیں جو زندگی کی حرارت اور توانائی سے محروم ہیں اور جنہیں سیلاب کی موجیں جس طرف چاہتی ہیں بہا لے جاتی ہیں یہ نعلش کی طرح ہیں ان کی کوئی شخصیت نہیں ہے ان کے تمام اخلاق و اقدار مردہ ہو چکے ہیں۔ یہ صبح سے شام تک محض دولت کمائے کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں کام کرتے ہیں ہر غلط طریقہ

اپناستے ہیں ہر ناجائز راستے پر چلتے ہیں اپنی عزت کو داؤں پر لگا کر لوگوں کی خوشامد کر کے جھوٹ بول کر دھوکہ دہی کے ذریعہ عرصی جس طرح بھی ممکن ہو اپنی جیبوں کو نوٹوں سے بھرتے ہیں مگر کس لیے؟ اس لیے کہ وہ اس دولت سے بیرونی اشیاء خرید سکیں گویا اپنی دولت کو مغربی سرمایہ داروں کی جیب میں منتقل کر دیں۔

انسانوں کی یہ دونوں قسمیں بنظائر مختلف اور اپنے طریقہ کار کے لحاظ سے متضاد ہیں لیکن ان کے متضاد طریقہ کار اور جدید تمدن کے سیلاب کے مقابلہ میں ان کے مختلف رد عمل کا نتیجہ ایک ہی ہے اور یہ کہ یہ سیلاب بے روک ٹوک بہہ رہا ہے اور اپنے اس تند بہاؤ کے نتیجہ میں ہر چیز کو تباہ و برباد کر رہا ہے ہمارے تمام دیواریں گر رہی ہیں اور ان دیواروں کا بلبہ دونوں قسم کے انسانوں کے سروں کو آلودہ اور زخمی کر رہا ہے ہمارے شہر قبرستان بن گئے ہیں۔ یہ مردوں کی لبتیاں ہیں جن سے تعفن اٹھ رہا ہے

## مغربی عورت / حقیقت اور غلط فہمی

مغربی عورت کا وہ تصور جو ایران میں پایا جاتا ہے وہ غلط ہے اور حقیقی مغربی عورت سے مختلف ہے ہم مغربی عورت کی جو تصویر دیکھ رہے ہیں در حقیقت مغرب میں ایسی عورت کا کوئی وجود نہیں ہے ایسی عورتیں صرف ایران میں پائی جاتی ہیں اور وہ بھی بازاروں اور شاہراہوں میں نہیں بلکہ ان کا وجود ریڈیو، ٹیلیوژن اور عورتوں کے بعض مخصوص رسالوں تک محدود ہے گویا ہم ایران میں مغربی عورت کا جو روپ دیکھ رہے ہیں وہ ساختہ ایران ہے مغربی عورت کا ایرانی ایڈیشن ہے یہ مغرب کی آواز اور آبرو داخستہ عورتوں کی تصویر ہے لیکن اس قسم کی عورتیں صرف یورپ



کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں یہ ایران میں بھی پائی جاسکتی ہیں یہ دنیا کے کسی بھی ملک میں مل سکتی ہیں یہ عورتوں کی ایک بین الاقوامی قسم ہے ہم جس عورت کو پہچانتے ہیں اس کا تعلق عورتوں کے ایک مخصوص اور محدود طبقہ سے ہے لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ مغربی عورت کا وہی روپ دکھایا جاتا ہے دراصل ہمارا مغربی عورت سے تعارف صرف فلم، ٹیلی ویژن اور جسنی رسالوں کے ذریعہ ہے ہمارے سامنے عورت کے اس مخصوص روپ کو تمام مغربی عورتوں کی نمائندہ قسم بنا کر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں اس مغربی عورت کو جاننے کا حق نہیں دیا گیا جو عنفوان شباب میں صحرائے لوبی، افریقہ یا الجزائر اور آسٹریلیا کے ریگستانوں میں چلی جاتی ہے اور اپنی تمام زندگی اس پر خطر اور دہشتاک ماحول میں بیماری اور موت کے حصار میں وحشی قبائل کے درمیان گزار دیتی ہے اور اپنی زندگی کے تمام روز و شب اپنی جوانی، اپنا کمال اور اپنی ضعیفی تحقیقی اور سائنسی کاموں کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ وہ چیونٹیوں کی آوازوں اور ان کے طریق پیغام رسانی کا مطالعہ کرتی ہے ان موجوں پر تحقیق کرتی ہے جو چیونٹیوں کے مورچہ سے ایک دوسرے انیٹا پر موصول کی جاتی ہیں پھر جب اس کی عمر تمام ہو جاتی ہے تو اس کی بیٹی اس کے تحقیقاتی کام کو آگے بڑھاتی ہے یہاں تک کہ یہ دختر فرنگ طویل علمی سائنسی اور تحقیقاتی کام کی تکمیل کے بعد ۵۰ سال کے سن میں یورپ واپس پہنچتی ہے اور فرانس کی یونیورسٹی میں اپنے تحقیقاتی مطالعہ کی کامیابی کے متعلق یہ بیان دیتی ہے کہ میں نے چیونٹیوں کی بولی کو سمجھ لیا ہے اور ان کے طریقہ ابلاغ کے بعضی علامت کو دریافت کر لیا ہے۔“

ہمیں اس بات کا حق نہیں دیا گیا کہ ہم مادام ”گواشن“ کے متعلق جان سکیں۔ اس عظیم خاتون نے اپنی تمام عمر ابوعلی سینا، ابن رشد،

ملا صدرا اور حاجی ملا ہادی سبزواری جیسے اکابر فلاسفہ کے افکار و خیالات کے مطالعہ میں صرف کردی ان کے فلسفوں کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کیا اور یونانی فکر اور ارسطو کے خیالات کا ان کے خیالات سے موازنہ اور مقابلہ کر کے اس بات کی نشاندہی کی کہ ہمارے حکماء نے یونانی فکر سے کس قدر اور کس نوعیت کا استفادہ کیا ہے مزید یہ کہ فکر یونان کے وہ کون کون سے مقامات ہیں جنہیں ہمارے مفکرین نے غلط سمجھا مادام گواشن نے ان غلطیوں کی نشاندہی کی جنہیں ہم اپنے ہزار سالہ دور تمدن میں دریافت کرنے سے قاصر رہے تھے۔

ہمیں یہ موقع نہیں دیا گیا کہ ہم اٹلی کی مادام "دولادیدا" (DELAVIDA) کو جان سکیں ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم یونانی زبان میں لکھے گئے ارسطو کے رسالہ "نفس کی روشنی میں حکیم بوعلی سینا کی کتاب نفسیات کی تصحیح و تکمیل کی۔

ہمیں مادام کیوری (CURE) کے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا جاتا کہ جنہوں نے کوانٹم اور تابکاری (QUANTUM, RADIOACTIVITY) جیسے مسائل پر تحقیقی کام کیا۔

ہم نے سویڈش نژاد رزاس دولاشاپل (RESESS DULA-CHAPPELL) کا نام تک نہیں سنا جو حضرت علیؑ کے بارے میں علماء اسلام شیعیت کے علمبرداروں اور معرفت علیؑ کے دعویداروں سے زیادہ بہتر علم رکھتی ہے یہ سویڈش نژاد آزاد لڑکی ایک ایسے علاقہ سے تعلق رکھتی ہے جو اسلامی ثقافت کے اثرات سے بہت دور ہے اور جہاں تک شیعہ اعتقادات و خیالات کا کوئی اثر نہیں ہے اس نے عنوان شباب سے اپنی تمام زندگی حضرت علیؑ کی شخصیت ان کے افکار و خیالات کے مطالعہ کے لیے وقف کر دی اس نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اس عظیم ہستی کی شناخت

کے لیے وقف کر دیا جسے اسلامی معاشرے میں نظر انداز کر دیا گیا اس نے اس شخصیت کو تلاش کیا جسے غیروں کے تعصب اور عداوت اور اپنوں کی بے معنی مدح و ستائش کے حجابات نے چھپا رکھا تھا اس نے علیؑ کے بابے میں درست ترین حقائق کے چہرے سے نقاب ہٹائی ان کی روح کی لطیف ترین امواج، ان کے احساس کے بلند ترین ابعاد اور ان کی فکر کے عمیق ترین گوشوں کی نشاندہی کی اس نے پہلی بار ان کے رنج و غم، احساس تنہائی و بے چارگی اور ان کی امیدوں اور آرزوؤں کے حوالے سے ان کی شخصیت کا مطالعہ کیا اور اس علیؑ کو دریافت کیا جو صرف بدر واحد و حنین کے معرکوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ محراب عبادت میں سجدہ ریز اور رات کی تنہائیوں میں مدینہ کے باہر ایک کنوئیں میں فریاد کناں بھی نظر آتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس دختر فرنگ نے علیؑ کی نہج البلاغۃ کو مرتب اور مدون کیا عرب مسلمان اس عظیم کتاب سے مفتی محمد عبدہ مفتی اعظم اہل سنہ کے ادبی منتخبات کی حد تک واقف ہیں جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے شیعہ اس کتاب سے یا تو سخنانِ حوادناصل "منسوب بہ علیؑ کے حوالے سے واقف ہیں یا پھر ان کی آگاہی کا دائرہ اس ترجمہ فیض تک محدود ہے جسے عربی متن کی مدد کے بغیر نہیں پڑھا جاسکتا مگر اس دختر فرنگ نے جو کافر ہے اس لیے اسے جہنمی سمجھا جائے گا حضرت علیؑ کے تمام اقوال و ارشادات کو جو مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے اور مختلف قلمی نسخوں میں پوشیدہ ہیں بڑی کاوش اور تحقیق کے ساتھ دریافت کیا ان کا مطالعہ کیا ان کے ترجمہ اور تشریح کا کام انجام دیا اور حضرت علیؑ کی شخصیت پر وہ خوبصورت ترین اور عمیق ترین نوثر تحریر کیا جس کی مثال ملنا مشکل ہے اس کام میں اسے ۴۲ سال لگے اور اس مدت کا ہر لمحہ غور و فکر، تفکر و تامل اور تحقیق و شناخت میں صرف کیا گیا ہے

ہم اس دخترِ مشینی سے بھی نادانف ہیں جس نے یہودی ہونے کے باوجود نازیت کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا جس نے ہٹلر کی فوجوں کو ایسی زک پہنچائی کہ اسے اس کی عدم موجودگی میں دوبارہ سزلے موت کا مجرم قرار دیا گیا وہ یہودی ہے مگر کیونکہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور آزادی کی روح کو سمجھتی ہے اس لیے فلسطینیوں کے دوش بدوش یہودیوں کے خلاف سرگرم عمل ہے۔

ہمیں یہ بھی حق نہیں ہے کہ ہم ان فرانسیسی نژاد نوجوان لڑکیوں کے متعلق جان سکیں جو الجزائر میں مجاہدین کے دوش بدوش کسی نام و نمود کسی دنیاوی یا اخروی فائدے کی تمنا کے بغیر، خفیہ دستوں، چھاپہ مار گروہوں اور زیر زمین تحریکوں میں مصروف کار ہیں اور پیرس کی فضائے شہوت و شراب میں غرق ہونے کی بجائے الجزائر کی جنگ آزادی میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کر رہی ہیں وہ ایک ایسے ملک کی جنگ آزادی کی راہ میں آلام و مصائب برداشت کر رہی ہیں جو ان کا اپنا ملک نہیں ہے جبکہ وہ جس ملک کے استعمار اور استبداد کے خلاف سرگرم عمل ہیں وہ ان کا اپنا ملک ہے یعنی فرانس۔

ہمیں یہ بھی حق نہیں ہے کہ ہم ”آنجلہ“ کے متعلق جان سکیں جو ایک مجاہدہ آزادی ہے جس کا تعلق امریکہ یا آئرلینڈ سے ہے

تمام دنیا کے آزادی پسند انسان اور ظلم و استبداد، تعصب اور استحصال کی ماری ہوئی انسانیت جو مغرب کی علم دوست، آزادی پسند اور انقلابی عورتوں سے واقف ہے اس بات کو بخوبی سمجھتی ہے کہ مغرب کی نمائندہ عورت وہ نہیں ہے جو فحش رسالوں یا عریاں فلموں کے ذریعے ہم سے متعارف کرائی جاتی ہے مغرب کی نمائندہ عورت وہ نہیں ہے جو ڈان ڈوان جیسے مردوں کا کھلونا ہے جو مال و دولت اور زور و جواہر کی دیوانی ہے جو ایک ایسی موڈرن، کینز ہے جو

ہوس کاروں اور شہوت پرستوں کے لیے کھلونا بنی رہتی ہے یہاں تک کہ جب ان کا دل بھر جاتا ہے تو وہ اسے کوئی بے کار شے سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ ایسی عورت مغرب کی نمائندگی کا حق نہیں رکھتی بلکہ مغربی عورت تو درحقیقت انسانی ترقی کی ان حدوں کو چھو رہی ہے کہ جہاں وہ اپنی ملت کی بلندی کا آئینہ مل اور اپنی نسل کی آزادی اور افتخار کا مظہر نظر آتی ہے۔

لیکن ہم صرف مادام "ٹوئنگی" (Twigg) سے واقف ہیں جسے ۱۷۷۰ء میں حیثیت عالم منتخب کیا گیا تھا۔ ہمیں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ وہ اور اسی قبیل کی عورتیں جدید اور تمدن مغربی عورت کا آئینہ مل ہیں۔ جیسے جیکولین اوزامیس جو ہر معاملہ کو دولت کی ترازو میں تولتی ہے یا فلم اسٹار ب۔ب۔ یا ملکہ موتا کو یا وہ سات عورتیں جو جیمز بانڈ کی باڈی گارڈز ہیں بالفاظ دیگر ہمارے سامنے جن عورتوں کو یورپ کی نمائندہ عورتیں بنا کر پیش کیا جاتا ہے وہ سب عورتیں وہ ہیں جو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں انفرالشیڈز کا ایک ذریعہ ان کی مصنوعات کے لیے اشتہار، سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا اور نو دولت طبقہ کے عشرت کدوں کے لیے کینزان تمدن جدید کی حیثیت رکھتی ہیں یہ وہ عورتیں ہیں جن کے لیے تہذیب و تمدن کے معنی صرف لباس اور جسم کی آرائش ہے اور جن کے نزدیک اعلیٰ ترین اقدار اپنے جسم کے اسفل حصوں کی نمائش ہے۔

ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہمیں ان نوجوان لڑکیوں کے متعلق بھی کچھ بتایا جائے جو کیمبرج، سنو بورن یا ہارورڈ جیسی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں اور جو صبح سے رات تک لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ اور تحقیق میں مہمک رہتی ہیں ان کا موضوع مطالعہ کوئی چودھویں یا پندرھویں صدی عیسوی کا قدیم نسخہ یا دھاتی تین ہزار سال پرانی الواح جو چین سے برآمد ہوئی ہیں یا کوئی نسخہ قرآن یا پھر لاطینی، یونانی یا سنسکرت کا کوئی قدیم مخطوطہ ہوتا ہے وہ صبح سے رات تک ان کتابوں پر اس طرح نظر جمائے رکھتی ہیں کہ ایک لحظہ کے لیے بھی ان کی

نگاہ ادھر ادھر نہیں بھٹکتی اور وہ اس محنتِ شاقہ سے کوئی تھکاوٹ بھی محسوس نہیں کرتیں وہ مسلسل اپنے مطالعہ اور تحقیق میں مصروف رہتی ہیں یہاں تک کہ لائبریری کا وقت ختم ہو جاتا ہے لائبریرین وقت ختم ہونے کی وجہ سے ان سے معذرت کے ساتھ کتاب واپس لے لیتا ہے ان کے شبِ روز اسی طرح کے علمی اور تحقیقی کاموں میں صرف ہوتے ہیں مگر ہم کو مغربی عورت کے نام پر جس عورت سے متعارف کرایا جاتا ہے وہ محض ”زنِ بازار“ ہے وہ بازار کی عورت ہے جو سڑکوں پر آوارہ گردی کرتی ہے اور ہوٹلوں، تفریح گاہوں اور کلبوں میں لوگوں کے لیے تفریح اور دلہنگی کا سامان فراہم کرتی ہے مگر یہ مغرب کی نمائندہ عورت نہیں ہے۔ یہ نمائندہ ٹائپ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مخصوص ٹائپ ہے

### رجعت پسندی اور استعمار کا گٹھ جوڑ

مغرب زدہ عورت کی یہ نئی قسم (TYPE) رجعت پسند گروہ اور نئے سرمایہ دار طبقہ کے مشترکہ عمل کا نتیجہ ہے قدامت پرست گروہ اخلاق و مذہب کے نام پر اور جدید سرمایہ دارانہ طبقہ آزادی اور ترقی کے نام پر عورت کے ساتھ جو عملی رویہ برتتا ہے ان دونوں کا مشترکہ اثر عورت کی اس نئی قسم کو وجود میں لانے کا سبب بنا ہے۔

قدامت پرست طبقہ عورت کو ابھی تک جہالت اور قدامت کی لائٹھی سے ہانک رہا ہے عورتوں کے ساتھ ان کا رویہ سخت اور درشت ہو وہ ان کے حصارِ ظلم میں آب و غذا کے لیے بھی محتاج ہے اس سختی اور درشتی کے نتیجہ میں عورت اپنے ہوش و ہوا اس کھو بیٹھتی ہے اور بے سوچے سمجھے، ایک دیوانگی کے عالم میں، آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس رجعت پسندی کے حصار سے نکال کر ان لوگوں کا دامن تھام لیتی ہے جو متجدد ہیں جن کا تعلق جدید سرمایہ دارانہ طبقہ سے ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کے سروں پر اونچے ہیٹ اور جن کی

دارھیاں چگی ہیں یہ اپنے آغوش کو ایسی عورتوں کے لیے خوش دلی سے کشادہ کر دیتے ہیں ان کے احترام میں اپنے ہیٹ اتار کر اپنا سرجم کرتے ہیں ان سے ایک مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بات کرتے ہیں غرض ہر طرح ان کے ساتھ ایک جنتلمین (GENTLEMAN) کا سا سلوک کرتے ہیں

مغربی عورت کے جس تصور سے ہم آشنا ہیں وہ عصر جدید کی پیداوار ہے لیکن یہ زن عصر جدید اقرون وسطیٰ کے بطن سے پیدا ہوئی ہے اس لیے کہ یہ اس غیر انسانی، رجعت پسندانہ اور خثوث آمیز رویے کا جو قرون وسطیٰ میں عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا رد عمل ہے۔ زن جدید، زن قدیم کے خلاف رد عمل کے طور پر وجود میں آئی ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسیحیت نے مذہب اور روحانیت کے نام پر عورت کو ہر طرح کی ذلت اور رسوائی کا نشانہ بنایا اسے آزادی اور انفرادیت سے محروم کیا اس کی حیثیت ایک قیدی اور ایک غلام کی سی تھی اسے کسی طرح کا حق ملکیت حاصل نہیں تھا اسے نہ اپنی دولت پر اختیار حاصل تھا اور نہ اولاد پر۔ حتیٰ کہ اس کا نام بھی اس کے باپ یا شوہر کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا اس دور میں عورت کو خدا کی ناراضگی کی نشانی اور تمام بلیوں اور فساد کی جڑ سمجھا جاتا تھا اس دور کی روحانیت اولاد پر آدم کو حجت سے نکلوانے کا اصلی مجرم عورت کو گردانتی تھی

اگر قرون وسطیٰ میں کسی پادری سے سوال کیا جاتا کہ کیا کسی ایسے گھر میں جہاں عورت موجود ہے کوئی نامحرم مرد داخل ہو سکتا ہے تو جواب ملتا کہ نہیں، ہرگز نہیں۔ کیونکہ اگر کسی گھر میں نامحرم مرد داخل ہو اور اگرچہ عورت اسے نہ بھی دیکھے تو بھی وہ مرد گناہگار ہو جاتا ہے گویا اگر کوئی نامحرم مرد کسی مکان کی بالائی منزل پر ہے اور اس گھر کے تہ خانہ میں بھی کوئی عورت ہے تب بھی مرد گناہگار ہونے سے نہیں بچ سکتا۔ گویا عورت کا وجود ہی گناہ ہے اور جس جگہ وہ موجود ہے اس کی نضاء کو گناہ سے آلودہ کر دیتی ہے۔

سینٹ تھامس ڈیکن (ST. THOMAS DAKIN) کا فرمانا ہے کہ اگر خداوند کسی مرد کے چہرے پر عورت کے لیے محبت کا جذبہ دیکھتا ہے خواہ وہ عورت اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہو، تو غضبناک ہو جاتا ہے اس لیے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی مرد کے دل میں خداوند کی محبت کے علاوہ اور کوئی محبت جگہ بنا سکے مسیح نے تمام عمر بغیر شادی کے بسر کی اس لیے جو چاہتا ہے کہ سچا مسیحی بنے اسے چاہیے کہ عورت کے سامنے سے بھی دور رہے یہی وجہ ہے کہ عیسائیت کا روحانی طبقہ تمام برادران، پدران، و خواہران (BROTHERS, FATHERS & SISTERS) تمام عمر شادی نہیں کرتے کیونکہ شادی کا بندھن خداوند کے غضب کا موجب بنتا ہے خداوند سے تعلق اور توسل صرف عیسیٰ مسیح کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ چونکہ ایک دل میں دو محبتیں جگہ نہیں پاسکتیں لہذا روحانی یعنی حامل روح القدس صرف یہ ہو سکتے ہیں جو مجرد زندگی گزارتے ہوں

عیسائیت میں گناہِ اولیٰ (ORIGINAL SIN) کا عقیدہ پایا جاتا ہے اس عقیدہ کے مطابق یہ اولین گناہ دراصل عورت کا گناہ تھا اس لحاظ سے ان کا کہنا یہ ہے کہ جب بھی کوئی ابنِ آدم عورت کی طرف رجوع کرتا ہے خواہ وہ عورت اس کی زوجہ ہی کیوں نہ ہو جیسے کہ جناب حوا حضرت آدمؑ کی زوجہ تھیں تو گویا وہ اس گناہِ اولیٰ کی تکرار کرتا ہے جو تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اپنے اس عمل کے ذریعہ خداوند کے حضور گناہِ آدمؑ کی یاد کو تازہ کرنے کا سبب بنتا ہے پس انسان کو وہ کام کرنا چاہیے کہ خداوند گناہِ آدمؑ کو بھول جائے اسی لیے قرونِ وسطیٰ کا انداز فکر یہ تھا کہ عورت کا وجود قابلِ نفرت ہے۔ اسے عاجز و محروم بنا کر رکھا جائے وہ ہر قسم کے حق ملکیت سے محروم تھی یہاں تک کہ اگر کوئی عورت صاحبِ دولت و ثروت ہوتی اس کی کوئی جائیداد ہوتی تو جیسے ہی وہ اپنے شوہر کے گھر میں قدم رکھتی اس کا حق ملکیت سلب ہو جاتا۔ وہ تمام چیزیں جو اس کی ملکیت ہوتیں خود بخود اس



کے شوہر کی ملک قرار پا جاتیں قرون وسطیٰ کی اس روایت کی جڑیں اس قدر گہری تھیں کہ ان کے اثرات آج کے ترقی پسند یورپی معاشرے میں بھی کسی حد تک موجود ہیں مثلاً آج بھی جب مغربی معاشرے میں کوئی عورت شادی کرتی ہے تو اسے اپنا نام تبدیل کرنا پڑتا ہے اور نام کی یہ تبدیلی محض خانگی حدود یا غیر سرکاری امور تک محدود نہیں رہتی بلکہ اسے تمام اندراجات، تعلیمی اسناد، شادی کارڈ، پاسپورٹ وغیرہ میں اپنے باپ کے نام کی جگہ اپنے شوہر کا نام درج کرنا پڑتا ہے گویا یہ عورت بذات خود کچھ نہیں ہے اپنی جگہ کوئی وجود نہیں رکھتی اصل بات تو نام ہے اس کا وجود خود بے معنی ہے قائم بہ غیر ہے جب تک باپ کے گھر رہتی ہے باپ کے نام کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے اور جب پرانے مالک کا گھر چھوڑ کر نئے آقا یعنی شوہر کے گھر چلی جاتی ہے تو پھر اس کا شخص شوہر کے حوالے سے قائم ہو تا ہے مغربی معاشرے کی نظر میں اس کی اتنی قدر و قیمت بھی نہیں ہے کہ وہ حوالہ غیر کے بغیر خود اپنا نام رکھ سکے یہ طریقہ اب ایرانی اور دوسرے مشرقی بھی اپنا رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ چونکہ مغرب کا طریقہ ہے اس لیے ہمارے اپنے طور طریقہ سے بہتر ہے خواہ یہ طریقہ دور غلامی کی یادگار ہو۔ خواہ یہ لغو، بیہودہ اور قابل نفرت طریقہ ہو مگر چونکہ اس پر مغرب کی چھاپ لگی ہے اس لیے ہمارے وہ جدت پسند جو مغرب کے مقلد ہیں آنکھ بند کر کے اس کی تقلید کرتے ہیں

مقلد خواہ قدیم ہوں یا جدید، محض نقال ہیں ان کے اندر شعور و ارادہ، انتخاب اور فیصلہ کی قوت نیک و بد اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت معطل ہو جاتی ہے ان کا کام صرف نقالی کرنا ہے وہ آنکھیں بند کر کے نقالی کرتے ہیں اور کبھی کبھی نقل اصل کے مقابلہ میں مضحکہ خیز حد تک بڑھ جاتی ہے۔

یورپ میں جہاں کہیں سرکاری یا قانونی کاغذات میں کسی شادی شدہ

عورت کا نام درج کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اس کا نام دوبار اور دو طریقے سے لکھا جاتا ہے یعنی وہ نام جو اس نے شادی کے بعد اختیار کیا اور جو اس کے شوہر کا خاندانی نام ہے اور وہ نام جو زمانہ دو شیرگی میں شادی سے قبل تھا اور یہ اس کے باپ کا خاندانی نام ہوتا ہے یعنی عورت کا نام اس کا اپنا نام نہیں ہے بلکہ اس کے صاحب خانہ کا نام ہے اور عورت اگرچہ کہ وہ گھر کی مالک ہو مگر چونکہ عورت ہے اس لیے صاحب خانہ نہیں ہو سکتی وہ اپنی ذات کے حوالے سے نہیں پہچانی جاتی وہ آزادانہ اپنا نام نہیں رکھ سکتی یہی وجہ ہے کہ وہ شادی کے بعد سرکاری اور خانگی ہر دو سطح پر اپنا نام تبدیل کر لیتی ہے یہ تبدیلی اس کی مجبوری ہے۔

ہماری جدت پسند خواتین جو مغرب کی اس رسم سے حال ہی میں متعارف ہوئی ہیں شادی کے بعد نہ صرف خاندانی نام بدلتی ہیں بلکہ اپنا اصلی نام بھی تبدیل کر لیتی ہیں۔ گویا وہ مغرب کی نقالی میں خود مغرب سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتی ہے یہ بھونڈی اور بے سوچی سمجھی نقالی ہے جو حد درجہ مضحکہ خیز ہے ہمارا مغرب زدہ طبقہ یورپ کی نسل کو خود سے برتر مانتا ہے اور ان سے اس درجہ مرعوب ہے کہ ہر بات میں ان کی نقالی کرتا ہے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جن بات کی وہ نقالی کر رہا ہے اس کی علت، معنویت، افادیت یا قدر و قیمت کیلئے یہ اندھی تقلید عقل و شعور سے عاری ہے ہمارے جدت پسند اس راہ پر آنکھیں بند کر کے دوڑ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مغرب کی نقالی کے ایسے نمونے موجود ہیں جن کی مثال خود مغرب کے معاشرے میں نہیں مل سکتی۔

آج بھی فرانس کے مروجہ قانون کی رو سے کوئی عورت اپنے شوہر سے جدا ہونے کے بعد اپنی اولاد پر کسی قسم کا معمولی سا حق بھی نہیں رکھتی جبکہ اسلام میں (خالص اور اصلی اسلام میں نہ کہ موجودہ دور کے نقلی اور غیر خالص اسلام میں)

عورت شخصیت اور حقوق کے اعتبار سے ایک آزاد اور مستقل حیثیت رکھتی ہے  
 حتیٰ کہ وہ شوہر سے بچوں کو دودھ پلانے کی اجازت طلب کر سکتی ہے وہ شوہر  
 کی دخل اندازی کے بغیر کاروبار اور تجارت کر سکتی ہے معاشی پیداوار کے عمل  
 میں آزادانہ حصہ لے سکتی ہے غرض ہر طرح اسے وہ تمام حقوق اور اختیارات  
 حاصل ہیں جو کسی بھی معاشرے میں ایک آزاد فرد کو حاصل ہو سکتے ہیں۔  
 اس کی حیثیت ذیلی اور طفیلی نہیں ہے بلکہ وہ ایک آزاد اور مستقل حیثیت کی  
 مالک ہے۔

یورپ نے ماضی میں عورت کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا اور دین  
 و مذہب کے نام پر اس کی جو تحقیر اور تذلیل کی گئی آج کی مغربی عورت اس سلوک  
 کے رد عمل کی منظر ہے۔ قرون وسطیٰ میں عورت کے متعلق جو انداز نظر اختیار  
 کیا گیا تھا اس کی جڑیں اس قدر گہری تھیں کہ آج بھی مغرب کی متمدن عورت  
 اپنی فکر اور سوچ کو اس سے پوری طرح آزاد نہیں کر سکی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ  
 اٹلی اور اسپین میں جہاں آج بھی مذہبی عنصر غالب ہے آزادی اور حقوق  
 بشری کے تمام بڑے بڑے دعوؤں کے باوجود عورت بہت سے انسانی اور نیکی  
 حقوق سے اب بھی محروم ہے

میں دراصل انسانی آزادی اور اجتماعی اور سماجی حقوق کی بات کر  
 رہا ہوں۔ یہ آزادی اس جنسی آزادی سے یکسر مختلف ہے جو نہ صرف مغرب  
 میں پائی جاتی ہے بلکہ جو بڑی تیزی سے مشرقی معاشروں میں بھی پھیل رہی  
 ہے آج جو صورت حال ہم دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ مغرب اپنی صنعتوں کے لیے  
 خام مواد جیسے پٹرول، ہیرے، تانبا، لوہا چاندی، قہوہ، یوروئم دوسری  
 دنیا (سابقہ تیسری دنیا) کے ملکوں سے نہایت سستے داموں خریدتا ہے اور ان  
 بھوکے ننگے ملکوں کو جو یورپ کے ممالک کے لیے لوٹ کھسوٹ کا بازار ہیں۔  
 نہایت فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ آزادی، اخلاق، ٹیکنک، ثقافت

فن اور ادب کے نام پر جنسی آزادی اور بے راہ روی کا تحفہ فراہم کر رہا ہے اور پسماندہ ملکوں کے تمام وسائل ابلاغ، نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اس مغربی روش کی ترویج، توجیہ اور توسیع میں منہمک ہیں جنسی آزادی حقیقی آزادی نہیں ہے اس کا حقوق انسانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دراصل جنسی آزادی ایک فریب ہے، ایک دھوکہ ہے، استعمار جدید نے اس طرح کے بہت سے فریب ایجاد کئے ہیں تاکہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اپنی ظالمانہ لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھ سکے اور مشرقی ممالک جو مغرب کے استعمار کا شکار ہیں اپنے حالات کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں وہ مغرب کے اقتصادی استحصال کو آزادی اور ترقی پسندی کے نام پر قبول کئے رہیں مغرب کے سرمایہ دار اور صنعت کار مشرق کے عوام کو اقتصادی اور سیاسی طور پر غلام بنائے رکھنے کے لیے انہیں جنسی آزادی کے دام میں پھنساتے ہوئے ہیں خصوصاً نوجوان نسل جو بغاوت اور سرکشی کا فطری میلان رکھتی ہے جو مذہب کی قیود اور روایت قدیم کی پابندی سے آزاد ہونا چاہتی ہے جو کسی بھی وقت شورش اور بغاوت کر کے مغرب کے استحصال اور استعمار کے لیے سنگین خطرہ بن سکتی ہے اسے جنسی آزادی کے سیلاب میں اس طرح غرق کر دیا گیا ہے کہ انہیں دنیا اور مافیہا کا کوئی ہوش ہی نہیں ہے وہ ایک غفلت اور بے حسی کا شکار ہیں ان پر مدہوشی کی کیفیت طاری ہے وہ مغرب کی جنسی آزادی کے سحر سے مسحور ہو گئے ہیں وہ اپنے حالات، اپنی عزت اور سیاسی اور اقتصادی غلامی کے احساس سے بے خبر ہیں یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں خود وہاں کے حدت پسند طبقے مغرب کے مفادات کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں داخلی استبداد کے ذریعہ نوآبادیاتی نظام کو تقویت پہنچاتے ہیں اور جنسی آزادی کے دام میں پھنس کر اپنے مغربی آقاؤں کے تسلط کو مستحکم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

اس مرحلہ پر ہم معمولی سے عذوف فکر کے ذریعے اس طوفان جنسیت کے پس پردہ چھپے ہوئے شیطانی وجود کو شناخت کر سکتے ہیں یہ شیطانی وجود ایک ایسا بت ہے جس کے تین چہرے ہیں اور ان تینوں چہروں کے جدید نام "استثمار"، "استعمار"، اور "استبداد" ہیں۔ عصر جدید کے اس مذہب کا پیغمبر فریڈ (FREUD) ہے اس کا علمی اور مذہبی سرمایہ فرائڈزیم (FREUDISM) ہے اس مذہب میں انسانی حقوق کی بنیاد جنسیت ہے اور اس میں اخلاقی قدر جنسی آزادی اور بے راہ روی ہے اس مذہب کا معبد "شہوت پرستی" ہے اور اس معبد میں جس شے کو سب سے پہلے قربان کیا جاتا ہے وہ "محوریت" ہے۔

### عزت - عصر جدید کے ثقافتی اور سماجی تناظر میں

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد پندرھویں اور سولہویں صدی میں قدیم روایتی اور مذہبی مہد ختم ہو گیا اور اس کے نتیجے میں زندگی کی تمام قدریں اور تصورات یکسر منقلب ہو گئے اب فطری شعور اور مذہبی احساس کی جگہ ڈیکارٹ (DESCARTES) کے عقلی شعور اور تجرباتی منطق نے لے لی۔ اجتماعیت کی جگہ انفرادیت کا تصور ابھرا معاشرتی اکائیوں (خاندان، قبیلہ، ملت) کی جگہ فرد کی اکائی کی آزاد اور مستقل حیثیت نمایاں ہوئی۔ اجتماعی مفاد کی جگہ انفرادی مفاد پر زور دیا جانے لگا۔ دورِ کیم (DURKHEIM) کے الفاظ میں، اجتماعیت (SOCIALISM) کی جگہ انفرادیت (INDIVIDUALISM) نے لے لی۔ زندگی کے متعلق بنیادی تصور میں تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ "اقدار"

استثمار - معاشی استحصال کا سرمایہ دارانہ نظام

استعمار - مغرب کا نوآبادیاتی نظام

استبداد - مشرق میں غیر جمہوری اور ظالمانہ حکومتوں کا نظام

افادیت سے بدل گئیں مثالییت پسندی (IDEALISM) کی جگہ واقعیت (REALISM) نے لی۔ روحانی عاطفہ کی جگہ فطری جبلت کو دیدی گئی زندگی کا کمال روحانی ترقی، تقویٰ، اور استغفار نہیں رہا بلکہ مادی آرام و آسائش کو زندگی کا مقصد سمجھا جانے لگا۔ وہ مقدس روحانی اور ثقافتی اقدار جن کی جڑیں انسانی فطرت میں بہت گہری ہیں جن کی منطقی تحلیل ممکن نہیں ہے مگر جوانی سکون اور راحت کی ضمانت ہیں اب دورِ ازا کا رسم بھی جلنے لگیں اور ان کی جگہ ان اقدار نے لی جنہیں عقل منطقی کی کسوٹی پر پرکھ کر منتخب کر سکتی ہے

مختصر یہ کہ وہ تمام قدریں جو عقل منطقی کے ذریعہ معلوم کی جاسکتی ہیں جو مصلحت وقت کے تقاضوں پر پوری اترتی ہیں جن میں افادیت کا عنصر نمایاں ہے جن کا منطقی تجزیہ اور تحلیل ممکن ہے جن کو علت اور معلول کے سلسلہ میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ تمام قدریں جو زمینی ہیں، مادی ہیں، تغیر پذیر ہیں۔ انہی پر ہماری تمام زندگی، تمام تہذیب و ثقافت تمام سماجی اور معاشرتی روابط منحصر ہیں۔ یہی قدریں روح عصر کی علامت ہیں اب ہمارا ان اقدار سے کوئی علاقیہ باقی نہیں رہا جو الہامی اقدار کہلاتے ہیں جن کو ناقابلِ تغیر ہیں۔ جن کا تعلق ایک ایسی حقیقت سے ہے جو ہمارے عقل و ارادہ کی سطح سے بلند ہے جسے منطق کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن نہیں ہے۔ یہ اقدار عقل کی اس سطح سے تعلق رکھتی ہیں جو تحلیل و تجزیہ کی سطح سے ماورا رہے ان کا تعلق اس حقیقت سے ہے جو غیبی ہے جو علت اور معلول کے سلسلہ میں بلند ہے ان اقدار کی جڑیں انسانی وجود میں بہت گہری ہیں اس لئے کہ یہ ابتدائے آفرینش سے آج تک موجود ہیں ان اقدار کا سرچشمہ مادی اور زمینی نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق ایک جہانِ دیگر سے ہے اور ان کا سرچشمہ ایک ایسی حقیقت سے ہے، جو ثابت، قدیم، مطلق اور کامل و اکل ہے۔

روحانی ناقابلِ تغیر اور اعلیٰ اقدار سے منہ موڑ کر زمینی، مادی، تغیر

پذیرا اور مصلحت آمیز اقدار سے رشتہ جوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ ما بعد الطبیعیات سے ہمارا تعلق ٹوٹ گیا۔ اور جب ہم ما بعد الطبیعیاتی سطح سے کٹ کر طبعیاتی سطح تک محدود ہو گئے تو پھر الہام کی جگہ سائنسی علوم نے لی، 'عفت کا تصور لذت سے بدل گیا۔ طلب کمال، طلب مال میں ڈھل گئی۔ تقویٰ کا تصور مادی آرام و آسائش کے تصور سے بدل گیا۔ بقول فرانسیس بیکن اب "حقیقت کی جگہ طاقت نے سنبھال لی ہے۔"

اس روحانی اور فکری انقلاب پیمانہ اقدار میں اس گہری تبدیلی اور تہذیب و ثقافت اور تصورات کی بنیادی جہت میں تغیر نے زندگی اس کے تمام تصورات تمام مظاہر اور تمام اداؤں پر انقلابی اثرات مرتب کئے ہیں، جذبہ خشق، تصورات خاندان، اور عورت اور مرد کے تعلقات کی نوعیت اور اس کی سطح ہر چیز بدل گئی معاشرے میں عورت کا مقام و مرتبہ، مرد کے مقابلے میں اس کی حیثیت اور زندگی، فن، ادب، اور ثقافت میں اس کی جگہ تبدیل ہو گئی۔ زندگی اور اس کی قدروں میں اس ہم گیر تبدیلی کی علمی بنیاد ڈیکارٹ کی منطق ہے جس کی رو سے ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا اور منطق کے تجزیاتی اصولوں پر جانچا جاسکتا ہے اس نکتہ نظر کی رو سے ہر چیز یہاں تک کہ وہ مقدس قدریں اور اخلاقی اصول جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ عقل برہانی کی حد سے ماوراء اور الہی صفات کا پر تو ہیں اب تجزیاتی منطق کی سطح پر پرکھے جانے لگے اور ان کو بھی دیگر مادی اشیاء کی طرح قابل تحلیل و تجزیہ سمجھا جانے لگا۔ عورت اور محبت جن کے گرد ایک ایسا پراسرار، مقدس، روحانی، خیالی اور شاعرانہ ہالہ تھا جس تک رسائی ممکن نہیں تھی اب وہ نشر و ترویج و تحلیل کی زد میں آ گئے اب انہیں ایک حسابی مسئلہ کی طرح حل کیا جانے لگا۔

فکر و نظر کی اس تبدیلی کے ذمہ داروں میں ایک نام کلود برنارڈ (CLAUDE BERNARD) کا ہے جس کے خیال میں انسان ایک ایسی مالا

ہے جو بے روح ہے، فرائد کا خیال ہے کہ روح ایک شوک بیمار، مریض  
سور ہے ان دونوں تصورات کے سروں پر سایہ فگن وہ بورژوائی ذہنیت ہے  
جس کے نزدیک زندگی کے معنی دولت اور سرمائے کے ہیں ان تحقیقات اور  
تصورات سے جو نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا وہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔

ایک طرف اس طرح کے مفکرین تھے اور دوسری طرف مسیحی ملا ایک طرف  
جدید تجربہ گاہیں تھیں اور دوسری طرف کلیسا۔ ان جدید تصورات کے مقابلہ میں  
بحر فتویٰ کفر اور کچھ کہنے کو نہیں تھا اور اس کفر کے فتویٰ سے خوفزدہ ہونے کو  
اب کوئی تیار نہیں تھا۔ ان جدید مفکرین کے مقابلہ میں جو استدلال اور مثال  
پیش کرتے تھے مسیحی ملایت صرف ہائے مذہب (دامنہا) کا نعرہ بلند کرتی کفر  
کے فتویٰ صادر کرتی اور لوگوں کو آتش جہنم سے ڈراتی تھی لیکن ان کی یہ تمام  
ہاؤ ہو بے سود اور بے اثر تھی عورت جو عہد گذشتہ میں ایک خاندان کا حصہ  
تھی اور اگرچہ کہ اس کی مستقل اور آزاد شخصیت نہیں تھی بلکہ وہ خاندان میں  
جو ایک اکائی کی طرح تھا، پوری طرح گھل مل کر اس کا ایک حصہ بن جاتی تھی  
رفتہ رفتہ اسے اقتصادی آزادی حاصل ہونے لگی اب اسے گھر کے باہر کی فضا  
میں کام کرنے کے مواقع ملنے لگے صنعتی دور کی متحرک اور پیچیدہ زندگی اور اس  
کے روز افزوں مسائل اور مشاغل نے عورت کو گھر کی چار دیواری کے حصار سے  
باہر نکال کر اقتصادی مشاغل میں مصروف کر دیا۔

اقتصادی آزادی کے نتیجہ میں عورت کو سماجی آزادی بھی حاصل ہو گئی  
اپنے شوہر اور بچوں کے تناظر میں بھی اس کا ایک آزاد اور مستقل بالذات وجود  
تسلیم کر لیا گیا۔ آج کی عورت شادی سے قبل بھی اپنا وجود رکھتی ہے وہ عقلی اور  
منطقی اعتبار سے ترقی کر چکی ہے لہذا دوسروں کے ساتھ اس کے روابط کی  
نوعیت بدل گئی ہے۔ اب ان تعلقات کی بنیاد فطری جذبات و احساسات یا مادی  
منطق روحانی تصورات پر نہیں ہے۔ بلکہ عورت اب اپنے تمام تعلقات کو عقل



معاش کی کسوٹی پر پرکھتی ہے اور مفاد و مصلحت ذات کی ترازو میں تولتی ہے اس انداز نظر نے جو سائنسی، مادی، تجزیاتی، مصلحت آمیز اور واقعیت پر مبنی ہے اور جس کا پیمانہ صرف اپنی ذات کا مفاد، اپنی حیلتوں کی تسکین اور اپنے لئے عیش و آرام کے اسباب ہبیا کرنا ہیں عورتوں کو خاندانی، اجتماعی اور مذہبی قیود سے بڑی حد تک آزاد کر دیا ہے اس آزادی کا مطلب یہ بھی ہے کہ عورتیں ان تمام گہرے اور لطیف جذبات و احساسات سے بڑی حد تک محروم ہو گئیں جن کا تعلق روحانیت سے ہے اس لیے کہ تہذیب جدید میں عورتوں کی آزادی کا یہ ایک لازمی نتیجہ ہے دورِ کریم اس بات کی تائید کرتا ہے کہ عہد گذشتہ میں روح اجتماعی طاقتور تھی اجتماعیت کا جذبہ قوی اور غالب تھا لیکن جب جدید تعلقل، اقتصاد اور انفرادیت کا رجحان بڑھا اور اقتصادی عناصر نے اس رجحان کو تقویت عطا کی تو فرد نے ان تمام رشتوں کو جن کی بنیاد فطری اور روحانی تقاضوں پر تھی اور جو مذہب اور روایت قدیم کے حوالے سے استوار کئے جاتے تھے توڑنا شروع کر دیا اجتماعی روابط کی اس شکست و ریخت کے نتیجہ میں فرد کو وہ آزادی حاصل ہو گئی ہے جو تہذیب جدید کا ایک طرہ امتیاز ہے یہاں تک کہ آج ایک ۸ سالہ دوشیزہ کسی دوسرے کی اعانت اور سرپرستی کے بغیر آزادانہ طور پر کسی مکان میں رہ سکتی ہے اب ایک عورت کو اپنے خاندان میں خود مختار اور آزاد حیثیت حاصل ہے عورت چونکہ معاشی طور پر خود کفیل ہے اس لیے اسے یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کے لیے خاندانی زندگی ناخوشگوار اور تکلیف دہ بن جائے تو وہ اس بندھن سے آزادی حاصل کر لے۔ اب عورت کو چونکہ انفرادی حقوق حاصل ہیں چونکہ وہ اقتصادی طور پر آزاد ہے چونکہ وہ تمام معاملات کو عقل کی ترازو میں تولنے کی عادی ہے اور چونکہ عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ انسان محض اپنے مفاد و آسائش کا خیال رکھے دوسروں کے لیے دکھ نہ ہے تو اب عورت اس بات پر مجبور نہیں ہے کہ وہ قربانی دے، ایثار کرے، اپنے آرام و آسائش اور اپنے

جذبات و احساسات کو کسی مرد کی محبت کی خاطر نظر انداز کر دے عشق، وفا، بیہمان شریعت اور رشتہ ازدواج کے نام پر اپنی ذات اور اس کے مسائل اور معاملات کی طرف سے آنکھیں بند کر لے اب ایسا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ عشق وفا، نفاکاری، ایثار روحانی اور اخلاقی قدریں ہیں جن کی عقلی اور منطقی تحلیل ممکن نہیں ہے۔

دوسروں کی خاطر اپنی زندگی کو قربان کرنا، دوسرے کے آرام کی خاطر رنج اور تکلیف برداشت کرنا یہ وہ باتیں ہیں جو عصر حاضر کی منطق پر کسی حساب سے پوری نہیں اترتی مجھے جس سے کوئی تعلق خاطر نہیں ہے میں اس کی خاطر کوئی قربانی کیوں پیش کروں مجھے جس سے محبت نہیں ہے میں اس سے عہد و وفا کیوں بنھاؤں؟ کوئی عورت کسی ضعیف و بدہمت شخص سے اپنی قسمت کو وابستہ کیوں رکھے وہ اس پیمان کو اس عہد اور تعلق کو کیوں نبھائے جو اس وقت کیا گیا تھا جب یہ مرد قوی اور حسین تھا جب وہ اس عورت کے لیے واحد ممکن سہارا تھا مگر اب یہ شخص ضعیف و نحیف ہو چکا ہے اب اس کی قوت صنف سے اور اس کی رعنائی و زیبائی بدہمتی اور بد صورتی سے بدل چکی ہے اب کوئی عورت کسی ایسے مرد سے تعلق کو کیوں برقرار رکھے اور اس کی وجہ سے ایک ایسے دوسرے مرد سے چشم پوشی کرے جو طاقت و راہ حسین ہے اور جو اس کے طبعی اور فطری جذبات اور تقاضوں کا گرم جوشی سے جواب دے سکتا ہے۔

سارے ترجمہ حاضر کے ایک عظیم فلسفی ملنے جاتے ہیں ایک سوال پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک عورت کسی ایسے شخص کی بیوی ہے جس میں کوئی خوبی نہیں ہے کوئی کشش نہیں ہے اس کے برعکس ایک ایسا شخص ہے جس کی شخصیت ہر اعتبار سے پرکشش ہے اور وہ اس عورت سے عشق بھی کرتا ہے عقل کی روشنی میں دیکھئے تو حساب بالکل صاف ہے دونوں مردوں کو اس عورت کی ضرورت ہے ایک کا اس سے تعلق زوجیت کا ہے اور دوسرے کا

تعلق عشق کا ہے لیکن عورت کو اپنے شوہر سے کوئی تعلق خاطر نہیں ہے اس کے برعکس وہ اپنے عاشق سے محبت کرتی ہے اگر وہ عورت اپنے شوہر سے وفادار رہتی ہے تو اس طرح وہ ایک محبت (اپنے شوہر کی محبت) کی خاطر دو محبتوں (اپنی اور اپنے عاشق کی محبت) کو قربان کرتی ہے اور اگر وہ اپنے شوہر سے قطع تعلق کر لیتی ہے تو اس طرح وہ دو محبتوں کی خاطر صرف ایک محبت کو قربان کرتی ہے اس عورت کے لیے مسئلہ بالکل واضح ہے اس باب میں عقل کا فیصلہ دو ٹوک اور قطعی ہے یہ ایک ریاضی کا مسئلہ ہے ایک محبت کے لیے دو محبتوں کو قربان کرنا کسی طرح بھی قرین عقل نہیں ہے ڈیکارٹ کی منطق ہو یا فرائیڈ کا نظریہ کوئی اس بات کو عقل کے مطابق تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے ایک جدید اور باشعور عورت منطقی عقل کی روشنی میں فیصلہ کرتی ہے وہ اس مسئلہ کو ریاضی کے مسئلہ کی طرح حل کرتی ہے معاشی آزادی اور اجتماعی حقوق اسے یہ فیصلہ کرنے میں پوری طرح مدد دیتے ہیں چنانچہ وہ یہ فیصلہ کر لیتی ہے۔

اسی طرح اولاد کا معاملہ ہے بچہ پیدا ہوتا ہے ایک چھوٹا سا بچہ، ایک ننھا وجود اپنی ماں اور باپ کی آزادی پر قدر غن لگا دیتا ہے عقل اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ ایک بچے کی خاطر دو انسان اپنی آزادی اور اپنے آرام و آسائش کو قربان کر دیں نتیجہ یہ ہے کہ یا تو ایسے طریقہ اختیار کئے جائیں کہ بچہ پیدا نہ ہو یا اگر پیدا ہو ہی گیا تو اسے کسی دایہ کے سپرد کر دیا جائے یا پھر کسی ادارے کی سرپرستی میں دے دیا جائے وہ تمام جذباتی رشتے جو منطق کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور عملی لحاظ سے غیر مفید ہیں تو رد دیے گئے وہ تمام اخلاقی، روایتی، ثقافتی، روحانی اور وجدانی قدیں جو نسوانیت زن کی نگہبان تھیں اور جو عورت کی انفرادیت کو خاندان کی اجتماعیت سے مربوط کرتی تھیں ان سب سے آزادی حاصل کر لی گئی ہے ایسے تمام روابط کو جو عورت کو اپنے شوہر، اپنے بچوں، اپنے خاندان اور اپنے قرابت داروں کے ساتھ

و ناداری، ایشاد، محبت، قربانی، ہمدردی اور علم گساری پر آمادہ کرتے تھے۔ انہیں غیر عقلی اور دوزخ کا قرار دئے دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ معاشی اور سماجی آزادی، جذبات پر منطق اور حقیقت جوئی یہ واقعیت بینی کے غلبہ نے روح اجتماعی کو ضعیف و کمزور کر دیا ہے۔ انفرادیت کا تصور حاوی ہو گیا ہے گویا اس آزادی نے عورت کو دوسروں سے غیر متعلق کر دیا ہے اجتماعیت سے رشتہ اس کا بالکل ٹوٹ گیا ہے نتیجہ یہ کہ وہ تنہائی کا شکار ہو گئی ہے

## تنہائی

تنہائی اس صدی کا سب سے سنگین المیہ ہے، بالبو اکس اور دور کیم نے خود کشی کے عزائم سے کتابیں لکھیں ہیں جن میں سماجیاتی تناظر میں یورپ میں خود کشی کے مسئلہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

خود کشی مشرق میں خال خال واقع ہونے والا حادثہ ہے جبکہ یورپ میں یہ کوئی استثنائی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک سنگین اجتماعی مسئلہ ہے کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی واقعیت ہے جس کا گراف روز بروز اوپر چارہا ہے ترقی یافتہ ممالک میں خود کشی کی شرح روز بروز ترقی کر رہی ہے جو ملک جس قدر ترقی یافتہ ہے وہاں خود کشی کا رجحان اسی حد تک غالب ہے یورپ میں سپانیہ نسبتاً کم ترقی یافتہ ملک ہے اس لیے وہاں خود کشی کا اوسط دوسرے یورپی ملکوں کے مقابلہ میں کم ہے اس کے برعکس شمالی یورپ کے علاقوں میں خود کشی کا تناسب زیادہ ہے اور شمالی امریکہ میں یہ شرح ہر جگہ سے بڑھ کر پائی جاتی ہے اسی اعتبار سے خود کشی کا رجحان اور تناسب ان تمام ممالک میں پایا جاتا ہے جو دیہات اور شہروں کے درمیان آباد ہیں۔ ان تمام شہروں میں پایا جاتا ہے جو ترقی یافتہ اور پس ماندہ ملکوں کی درمیانی سرحدوں پر واقع ہیں ان تمام ممالکوں میں پایا جاتا ہے جن میں مذہبی اور روایتی اور غیر مذہبی اور جدید دونوں طبقات پائے جاتے

ہیں ایسا کیوں ہے۔ خود کشی کے رجحان کا سبب کیا ہے؟ فرد کی تنہائی۔  
 مذہب افراد کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے ان میں ایک اجتماعی روح  
 بیدار کرتا ہے اس کے ساتھ ہی مذہب ہر فرد اور اس کے خدا کو مربوط کر کے خدا  
 کو انسان کا ہمدم بنا دیتا ہے۔ دور گزشتہ میں فرد اور اجتماع کے درمیان حد بالواسطہ  
 تھے فرد اپنے خاندان، قبیلہ اور قوم کے ساتھ باطنی رشتوں کے ذریعہ مربوط تھا  
 یہ اقتصادی اور اجتماعی آزادی کا دور ہے اس آزادی نے ہر فرد کو دوسرے  
 سے بے نیاز کر دیا ہے اب فرد خاندان، ہمسایہ، ماں باپ، اولاد، دوست اور  
 اعزاء سے بے تعلق ہو گیا ہے اور اپنی مادی اور روحانی احتیاجات کی  
 تکمیل کے لیے براہ راست معاشرے سے مربوط ہے عقلی اور منطقی انداز نظر  
 نے روحانی، مذہبی اور روایتی روابط کو توڑ دیا ہے اور ریاضیاتی منطق  
 اور مادی تصورات نے تمام روحانی اور وجدانی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے  
 فرد آزاد ہو گیا ہے، خود نگر اور خود کفیل ہو گیا ہے۔ دوسروں سے بے نیاز ہو  
 گیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ تنہائی کا شکار بھی ہو گیا ہے کیونکہ دوسرے  
 افراد بھی اس کی طرح آزاد اور اس سے بے نیاز ہیں۔ ہر شخص دوسرے شخص  
 سے کسی مصلحت یا مفاد کے تحت تعلق رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ فرد اپنی ذات کے  
 جزیرہ میں محصور ہے۔ وہ تنہا ہے اور اس تنہائی کے کرب کی حالت میں اس پر  
 خود کشی کا خیال حملہ آور ہوتا ہے دراصل تنہائی اور خود کشی ایک دوسرے کے ساتھ  
 اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے کہ دو ہمارے جن کے گھروں کی دیوار متصل ہو  
 آج کے معاشرے میں عورت اپنے لیے مرد کا انتخاب کرتی ہے۔ مرد اپنے  
 لیے عورت کو چنتا ہے۔ مگر دونوں اپنی جگہ ایک آزاد اور مستقل حیثیت رکھتے  
 ہیں دونوں ایک دوسرے سے بے نیاز ہیں۔ پھر کون سی قوت ان کو ایک دوسرے  
 سے مربوط کرتی ہے۔ یہ باہمی تعلق، جنسی، جذباتی، عشق و محبت یا دوستی  
 اور رفاقت کا تعلق نہیں ہے یہ ایک دوسرے سے ہمہ ردی اور نیازمندی

اور غم گساری کا رشتہ بھی نہیں ہے پھر وہ کون سی بنیاد ہے جو ان دو آزاد اور بے نیاز افراد کو باہم مربوط کرتی ہے آج کے دور میں مرد اور عورت کے تعلق کی واحد بنیاد محض ایک قانونی مزدورت ہے جس کا تعلق منطقی اور افادی عقل سے ہے جس میں کوئی جوش یا حرارت نہیں پائی جاتی بلکہ جس کا سرچشمہ، سست اور بے نور محاسبہ عقلی ہے۔

جنسی آزادی کا تصور دیکھ تو بلوغت کی ابتداء میں سر اٹھاتا ہے مگر عملاً کوئی مرد یا عورت جب چاہے اس تصور اور آزادی پر عمل کر سکتی ہے جو شخص ایسی آزادی کا تصور رکھتا ہے وہ گویا اس بات کا قائل ہے کہ جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے فقط ایک ہی شرط ہے اور وہ خود جنسی جذبہ کی بیداری ہے اگر کسی میں یہ جذبہ ضعیف ہے تو اس ضعف اور اس کمی کو سرمایہ کی قوت سے پورا کیا جاسکتا ہے محض روپیہ چاہیے پھر انسان جس سطح پر بھی چاہے روپیہ خرچ کر کے اپنے جنسی جذبات کی تسکین کر سکتا ہے۔ زندگی کے ہر دور میں عمر کے ہر حصہ میں یا ڈان ڈان بن سکتا ہے یا ادنا سیس امریکہ کی حالتوں اور ملک کو دولت کے بل پر خرید جاسکتا ہے۔ اس میں اور بازاری عورت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف نرخ کا فرق ہے۔

ایسے معاشرہ میں جہاں لڑکا اور لڑکی دونوں آزاد ہیں اور دونوں کو اپنے جنسی تقاضے پورا کرنے کی آزادی حاصل ہے کوئی شخص اس بات کو قرین مصلحت نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی اس آزادی کو ازدواجی بندھن سے بدلے اپنے آپ کو تمام عمر کے لیے مقید کرے، منطق، عقل، ریاضیاتی اقدار انفرادیت اور واقعیت کا تصور کوئی اس بات کا فتویٰ نہیں دیتا کہ فرد اپنی متنوع اور لامحدود آزادی کو جو اسے ہر طرح کے جنسی تجربات کی اجازت دیتی ہے۔ تھک کر

خود کو محض ایک فرد کے ساتھ مقید کر لے

## خاندان کی تشکیل

مرد ہو یا عورت جب تک ان کے جسمی جذبات پر شباب رہتا ہے ، وقص کا ہوں ، ریسٹورانٹ ، گذر گاہوں اور ایسی صحافتوں میں جہاں جسمی جذبات کی تسکین پر کوئی قدغن نہ ہو غرق ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسا وقت آتا ہے جب عورت کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اسے ہوش آتا ہے اب وہ اپنے آپ کا جائزہ لیتی ہے اپنے گرد و پیش کو دیکھتی ہے اب اسے کوئی شخص اپنی تلاش میں نظر نہیں آتا اور اگر کوئی اس کی طرف متوجہ ہوتا بھی ہے تو محض ماضی کی یاد کو تازہ کرنے کی خاطر۔ دوسری طرف مرد جسمی آزادی کے نام پر بے شمار تجربات کرتا ہے۔ وہ ہر باغ سے گل اور ہر گل سے خوشبو کو چنتا ہے اس کی زندگی ایک بے محابا لذت جونی میں گزرتی ہے یہاں تک کہ جسمی جذبہ ضعیف پڑ جاتا ہے مرد اپنی زندگی کے ایک ایسے دور میں داخل ہو جاتا ہے جہاں حب جاہ و مال شہرت اور مرتبہ کی طلب جنسیت کی جگہ لے لیتی ہے اور اس کے ذہن میں گھر آباد کرنے اور خاندان تشکیل دینے کا خیال سر اُبھارنے لگتا ہے۔

جب عورت کو اس خطرے کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے حسن و شباب کا دور ڈھل چکا ہے اب اس میں اتنی کشش نہیں رہی کہ جو مرد کو اس کی طرف متوجہ کر سکے اور جب مرد اپنی جسمی آزادی اور اپنے متنوع اور بے پایاں تجربات سے نڈھال ہو جاتا ہے تو ایسی عورت اور ایسا مرد ایک طویل اور تھکائی دینے والے جسمی آزادی کے سفر کے بعد ایک دوسرے سے مل کر خاندان بنانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

خاندان تشکیل پاتا ہے مگر قوت محرکہ جو ایسے خاندان کی تشکیل کا سبب بنتی ہے عورت کا احساس زوال و شکست اور مرد کا احساس خستگی اور جسمی آزادی

سے فرار کا جذبہ ہے۔ ظاہر میں ایک خاندان بن گیا۔ مگر یہ خاندان بے روح اور بے کیف ہے یہاں نہ محبت کا جوش ہے۔ نہ کسی آئیڈیل کی تلاش دو افراد ایک دوسرے سے مل گئے ہیں مگر ان کے درمیان نہ کوئی جوش ہے نہ جذبہ یہ دونوں مل کر کوئی اعلیٰ اور پرشکوہ خاندانی وحدت نہیں بناتے اس کے برعکس ان دونوں کے ملاپ کا نتیجہ خستگی اور بیزاری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے مل کر کوئی نیا جذبہ یا تجربہ حاصل نہیں ہوتا اس لیے کہ یہ ایسے تمام تجربات سے گزر چکے ہیں ان کے لیے اب کوئی چیز نئی نہیں ہے کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ان کے دلوں میں کوئی جوش و جذبہ بیدار ہو سکے دونوں کو معلوم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کیوں مربوط ہوئے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے کس قدر بے نیاز ہیں۔ دونوں اچھی طرح سوچ سمجھ کر تمام معاملات اور حالات کا جائزہ لے کر اپنی اپنی مصلحتوں کے تحت ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے ہیں۔ اور ہر فریق اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس کا مفاد اور اس کا ضرورت کیسا ہے اب اگر وہ ایک دوسرے سے اظہار عشق کریں ایک دوسرے کے لیے قربانی اور فداکاری کے جذبہ کا اظہار کریں تو یہ اظہار عشق محض دکھاوا بلکہ ایک طرح کی بھاری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شادی کی رسم کلیسا کے بجائے سٹی ہال میں انجام پاتی ہے۔ کلیسا ایسا جوڑوں کو خوش آمدید نہیں کہتا اس لیے ایسے دنوں میں جو اس کام کے لیے مخصوص ہوتے ہیں سٹی ہال کچھ کچھ بھرا رہتا ہے سٹی ہال کا کوئی کارندہ اپنے سینہ پر اپنے عہدہ کا بیج سجائے نظر آتا ہے (یہ ایک شہری ادارہ کا کاروباری نمائندہ ہے۔ کلیسا کا نمائندہ نہیں ہے جو روحانیت، حرمت اور تقدس کی علامت سمجھا جاتا ہے) یہ نمائندہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے جوڑوں کے نام پکارتا جاتا ہے ان ناموں کی ایک طویل فہرست ہوتی ہے ہر مرد اور عورت جیسی کا نام پکارتا جاتا ہے۔ نہایت میکاٹکی اور بے روح انداز



میں ”ہاں“ کہہ کر ازدواج کو قبول کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی کے ہاں کہنے سے قبل ہی ان کے پیچھے کھڑے ہوئے بچے ”ہاں“ کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں گویا اپنے ماں باپ کو رشتہ ازدواج قبول کرنے پر آمادہ یا مجبور کر دیتے ہیں عورتیں اور مرد بیس کی رقم ادا کرتے ہیں شادی کے منبر پر دستخط کرتے ہیں اور تقریب شادی ختم ہو جاتی ہے اور پھر لوگ اپنے اپنے حوالے میں واپس چلے جاتے ہیں اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دو، تین سو عورتوں میں صرف بیس یا تیس عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو اس تقریب کے موقع پر لباس عروسی پہنتی ہیں۔ ورنہ اکثر عورتیں یہی کہتی ہیں کہ اس عمر میں اور اس حالت میں ہم لباس عروسی پہن کر کیا کریں گے یہ تو خود اپنا مضحکہ اڑانا ہو گا۔

پھر عورت اپنے کام کی طرف لوٹ جاتی ہے اور مرد اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہے کبھی کبھی یہ لوگ دوپہر کا کھانا کسی ریستورانٹ میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھاتے ہیں مگر یہ اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ شادی ان کے اندر کوئی جوش و جذبہ بیدار کر سکے ورنہ اکثر جوڑے تو یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کیا ہلو تھا وہ اس قصہ کو ہی فراموش کر دیتے ہیں جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو سہی کارروائی ختم ہونے کے بعد جب عورت اور مرد سٹی ہال کے دروازے سے برآمد ہوتے ہیں تو نہایت سرد مہری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ جو اس سے قبل خاموشی و محبت تک ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزار چکے ہیں نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ بلکہ ان میں سے ہر فریق مختلف اور متعدد لوگوں کے ساتھ زندگی گزار چکا ہے اس لیے اب ان کے لیے شادی کوئی نیا اور دلچسپ تجربہ نہیں رہا یہی سبب ہے کہ زن و شوہر ایک دوسری تقریب کے بعد نہایت سرد مہری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں جیسے کہ پہلے ہوں کہ آخر یہ سب کیلئے یہ شادی مگر اس میں آخر کیا رکھا ہے۔ ہم کہاں

جائیں۔ کیا تفریح کے لیے جائیں۔ مگر تفریح پر تو ہم اس سے قبل ہی ہزار بار جا چکے ہیں۔ پھر کیا ہم آنکوش کے کیف سے لطف اندوز ہوں مگر اس کا مرا بھی ہم ہزار بار چکھ چکے ہیں پھر کیا گھر کی طرف رج کریں مگر ہم تو گھر ہی سے آتے ہیں۔ کون سی ایسی چیز ہے جو ان لوگوں کے لیے جذب و کشش کا باعث بن سکے جو ان کے خیال اور احساس کو تحریک دے سکے؟ ایسی کوئی چیز نہیں ہے پس یہی بہتر ہے کہ ہر دو فریق ہمیشہ کی طرح روز کی طرح اپنے معمول کے کاموں میں مشغول ہو جائیں تو گویا خاندان اس طرح تشکیل پاتے ہیں ہر دو فریق، مرد اور عورت، نہایت دقیق عذر و فکر اور احتساب کے بعد ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں۔ یہ خاندان ایک معاشی شراکت ہے یا پھر قانون کا جبر اور دباؤ ہے۔ کچھ پیدا ہو گیا اور اس کی وجہ سے عورت اور مرد ایک دوسرے سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے پر مجبور ہو گئے، لیکن یہ بندھن مجبوری کے طور پر قبول کیا گیا ہے اس میں کسی فریق کی خوشی، جوش یا جذبہ شامل نہیں ہے اس لیے نہ ان کا دل دھڑکتا ہے اور نہ ان کے خیال میں کوئی نئی لہر دوڑتی ہے حتیٰ کہ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نمودار نہیں ہوتی۔

اس خاندان کی بنیاد کمزور ہے اس لیے یہ خاندان سست اور کمزور خاندان ہے۔ بچے اس گھر میں کوئی جوش، جذبہ یا حرارت محسوس نہیں کرتے اور ان کے ماں باپ چونکہ بچوں کے لیے اپنی آزادی کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے وہ بچوں کی پرورش کے لیے صرف روپیہ جیسا کرتے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے ان کی آزادی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ ان کی سرگرمیاں معمول کے مطابق جاری رہتی ہیں اور اس کے باوجود کہ وہ مصلحت کے تقاضوں اور قانون کے دباؤ کے نتیجہ میں ایک دوسرے سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہوتے ہیں وہ رسمی طور پر ایک خاندان تشکیل دے چکے ہوتے ہیں مگر وہ ایک دوسرے سے مکملاً جدا اور بیگانہ رہتے ہیں ان کی زندگی ماضی کی روش پر چلتی رہتی ہے وہ قانونی

اور رسمی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ ہیں مگر حقیقتاً اور کلاً جدا جدا ہیں انہوں نے ایک خاندان بنایا ہے مگر ان کے رویہ نے اس خاندان کو پارہ پارہ کر دیا مرد جو صدمہ جوان اور پر جوش عورتوں کی ہم آغوشی کا مزہ چکھ چکا ہے ایک ایسی عورت سے جو خستگی اور درمماندگی کا شکار ہے اور جس کا بھنسی رویہ مرد کو متفر کرنے کا سبب بنتا ہے کس طرح خرقہ اور مطمئن رہ سکتا ہے اسی طرح وہ عورت جو اس سے قبل بہت سے جنسی تجربات سے گزر چکی ہے اپنے شوہر کی سرد آغوش اور اس کے ۱۔ فترہ رویہ کا جب اپنے سابقہ تجربات سے موازنہ کرتی ہے تو اسے سولے کو فتنہ اور عالجی کے کچھ اور حاصل نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ایک ایسے گھر سے جو جوش اور جذبہ کی حرارت سے خالی ہے فرار حاصل کرنے کے لیے مثل سابق ہوٹلوں، کلبوں، تفریح گاہوں اور اسی طرح کے دیگر مقامات کی رینگنیوں اور سرمستیوں کی تلاش میں مہمک ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ یہ گھر جو دو افراد کے ایک ایسے معاہدہ کے نتیجہ میں بنا تھا جس کی اساس عقل و منطق پر رکھی گئی ہے عملی اعتبار سے اپنا عقلی جواز اور سند کھو بیٹھتا ہے

## سرمایہ دارانہ معاشرہ میں عورت کی حیثیت

### جنسیت بجائے عشق

ایک ایسے معاشرہ میں جس کا تمام انحصار 'پیداوار اور کھپت' اور کھپت اور پیداوار کے معاملہ پر ہو اور جہاں اقتصادی مفاد کے علاوہ اور کوئی بات سوچنا عملاً ممکن نہ ہو عورت کو ایک ایسی ہستی نہیں سمجھا جاسکتا جس کا وجود خیال انگیز پاکیزہ احساسات کا مرکز اور گہرے اور بے لوث عشق کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے جس کی ہستی کو محترم اور جس سے تعلق کو مقدس مانا جاتا ہے۔ جو ماں ہے شریک حیات ہے مونس و ہمد ہے جو الہام و مہدافت کا آئینہ ہے بلکہ اس نظام میں عورت کی صرف ایک ہی حیثیت ہے اور وہ یہ کہ وہ ایک ایسی جنسی اقتصادی

ہے جسے اس کی جنسیت کی ترازو میں تولاجا تا ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشرہ میں عورت سے دو کام لیے جلتے ہیں اول یہ کہ معاشرے کو اس طرح مصروف رکھا جائے کہ کسی شخص کو یہ سوچنے کا موقع نہ مل سکے کہ بورژوائی نظام معیشت میں وہ کن مظالم اور مصائب کا شکار ہے کوئی یہ نہ سوچ سکے کہ وہ کس کے لیے محنت کرتا ہے کیوں مشقت جھیلتا ہے کس طرح کی بے مقصد اور بے ہدف زندگی گزار رہا ہے اس کی زندگی میں مصائب کا ذمہ دار کون ہے اور وہ آخر کیوں یہ آلام و مصائب جھیل رہا ہے۔

سرمایہ دار عورت کی جنسی کشش کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ مزدور کارکن، دانشور کسی کو سوچنے سمجھنے کی فرصت ہی نہ ملے تاکہ معاشرے میں طبقاتی نظام اور سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف کوئی تحریک سر نہ اٹھاسکے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ عورت کی جنسیت کا استحصال کرتا ہے وہ معاشرے میں ایسی اجتماعی اور تفریحی سرگرمیوں کو فروغ دیتا ہے جن میں عورت کی جنسی کشش لوگوں کے ذہنوں کو مسحور اور مفلوج کر دے اور معاشرہ اوقاتِ فرحت کو محض ان تفریحی اور عیاشانہ سرگرمیوں کے لیے وقف کر دے تمام فنونِ لطیفہ پر پور کا شدت سے قبضہ کر لیا گیا ہے اور سرمایہ دارانہ اور بورژوائی نظام کے مفادات کے تابع بنا دیا گیا ہے۔ فنون جو ہمیشہ، حسن، عشق، جذبات کی پاکیزگی اور روح کی بالیدگی کا ذریعہ رہے ہیں اب محض جنسیت کا آئینہ بن گئے ہیں۔ خراب انداز میں لکھنا اور بازاری جنس پرستی کو ایک عملی فلسفہ کا رنگ دیدیا ہے انسان اپنے ابتذال اور اخلاق باختگی کو حدت، روشن خیالی اور واقعیت پسندی کا نام دینے لگا ہے اب بلند اور پاکیزہ خیالی کو آئیٹلریزم کہہ کر دور از کار گردانا جاتا ہے اور اس کی جگہ ادبِ شعر، اور دیگر فنونِ لطیفہ پر جنسیت نے قبضہ جما لیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج مقصودی، نقاشی، شاعری، سنیاتھریٹ، افسانہ، ناول، غرض ہر فن جنسیت کے گرد چکر لگا رہا ہے اور اس جنسیت کا محور

عورت ہے۔ وہ عورت جسے سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے مفادات کے تحت ایک غالب خاص میں ڈھال دیا ہے۔

گویا سرمایہ دارانہ نظام میں عورت کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ اس کی جنسیت کا استحصال کر کے اسے معاشرے کی تفریح اور ہوس رانی کا ذریعہ بنا دیا جائے تاکہ لوگ اصل مسائل پر توجہ نہ دے سکیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کوئی تحریک سر نہ اٹھائے اور اس معاشرے میں عورت سے جو دوسرا کام لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ دار اپنی مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ کھیت کرنے کے لیے عورت کو اپنی مصنوعات کے اشیاء کا ذریعہ بناتے ہیں سرمایہ داروں کا مفاد اسی میں ہے کہ ان کی مصنوعات کی مانگ زیادہ سے زیادہ بڑھے اور وہ زیادہ سے زیادہ منافع پر اپنی اشیاء کو فروخت کر کے اپنے سرمایہ میں اضافہ کر سکیں۔ ان کی نظر میں عورت کی صرف ایک ہی افادیت ہے اور وہ یہ کہ وہ ایسی مخلوق ہے جو اپنی جنسی کشش کے ذریعے لوگوں کے جذبات کو براہِ نیگتہ کر سکتی ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ نظام میں عورت صرف ایک جہت رکھتی ہے وہ ایک بعدی مخلوق ہے سرمایہ دار عورت کی اس خصوصیت کو جو اس کی جنس سے عبارت ہے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے وہ عورت کو اشتہاری جنس بنا کر معاشرے میں نئے اخلاقی اقدار اور نئی حیات کو اجاگر کرتا ہے وہ معاشرے میں اپنی اشیاء کی مانگ بڑھانے کے لیے مصنوعی زندگی اور معیار زندگی کا راگ الاپتا ہے وہ عورت کو معاشرے میں ایک مصنوعی اور جنس زدہ فضا پیدا کرنے کے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بھی کہ چکے ہیں اس طرح وہ معاشرے کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا دیتا ہے یعنی لوگ اس ظلم اور استحصال کو محسوس نہیں کرتے جو سرمایہ داری کے ہاتھوں ان کی تقدیر بنا ہوا ہے۔

اب عشق کی جگہ جنسیت نے لے لی ہے۔ عورت جو پہلے محبوبہ تھی۔ اب ہوس کا کھلونا ہے۔ وہ پہلے حصارِ محبت میں اسیر تھی اب خود اپنی بے محابہ آزادی میں

مگر قلبہ سابقہ تاریخ اور تمدن اور مذاہب میں اگرچہ عورت کو آج کی طرح سماجی اور اقتصادی آزادی حاصل نہیں تھی مگر الہام، احساس، اور خصوصیات روحانی کے نقطہ نظر کے اعتبار سے اسے ایک نہایت بلند اور محترم مقام حاصل تھا اور اسے پاکیزہ احساسات اور عشق و محبت کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج کے سرمایہ دارانہ نظام میں اسے محض سرمایہ داری کے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اسے معاشرے کی بہت اور کیفیت کوید لئے اور سرمایہ داری کے اقتصادی اور سماجی بہت کو حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اب عورت اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کا سرچشمہ نہیں رہی بلکہ اس کے برعکس اب عورت ایسی تمام اقدار کو نیست و نابود کرنے کا وسیلہ بن گئی اب وہ ایک دوایتی اخلاقی یا مذہبی معاشرہ کو مصرف معاشرہ میں بدلنے کا کام انجام دیتی ہے فنون لطیفہ پہلے نکریش میں تجلی الہی کا پر تو سمجھے ملتے تھے اب عورت کی جنسیت کا استحصال کر کے سرمایہ داری نے فنون کو جنسیت زدہ کر دیا ہے تاکہ ان کے ذریعہ لوگوں کے فکرو احساس کو مغلوب اور دگرگوں کیا جاسکے۔

## مشرق کا معاشرہ اور عورت

اس سیلاب کا رخ مشرق کی طرف ہے جنسیت کے طوفان نے یہیں بھی اپنی پیٹ میں لے لیا ہے۔ ہمارے معاشروں میں یہ کام بہت آسان ہے اس کے لیے بہت زیادہ سازگار حالات مہیا تھے مغرب میں خصوصاً سویڈن، ناروے یہاں تک کہ فرانس اور جرمنی جیسے ممالک میں لڑکوں کے جنسی جذبات دیر میں بیدار ہوتے ہیں ۱۷، ۱۸ سال کی عمر کے لڑکوں میں جنس مخالف کی طرف کوئی کشش یا میلان نظر نہیں آتا جبکہ اسی سن و سال کی لڑکیوں میں جنسی جذبات اور جنس مخالف کی طلب کا جذبہ پورے عروج پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان معاشروں میں لڑکے، لڑکیوں سے دور بھاگتے ہیں جبکہ لڑکیاں لڑکوں کو گھیرنے کی فکر میں

رہتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان معاشروں میں لڑکیوں کے اندر ایک منفی اور غیر صحت مندرجہ رویہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ آخر عمر تک پیچھا نہیں چھڑا سکتے خاندانی زندگی کا ان حالات سے متاثر ہونا بالکل فطری اور ناگزیر ہے۔

اور یہی وہ صورت حال ہے جس کے پیش نظر سٹانی یورپ کے ماہرین برائیت و نفسیات نے بہت سارے ایسے طریقے ایجاد کئے ہیں جن کے ذریعے لڑکوں میں جنسی جذبہ کو بیدار کیا جاسکے ان طریقوں میں مصنوعی تحریکات بھی شامل ہیں اور وہ فطری میلانات بھی ہیں جنہیں عورت کے وسیلہ سے بیدار کیا جاتا ہے۔

لیکن مشرق میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مشرق میں نوجوان لڑکے بلوغت کے سن تک پہنچنے سے قبل ہی جنسی طور پر بیدار ہو جاتے ہیں اور یہی بات یعنی جنسی بلوغت کی زودرسی۔ وہ مسئلہ ہے جس سے مشرق کے معاشروں کا مطالعہ کرنے والے ماہرین سماجیات اور ماہرین نفسیات کے لیے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ کوئی حقیقی مسئلہ پر غور نہیں کرتا۔ اس کے برعکس لوگ صمنی اور غیر ضروری مسائل کو اہمیت دیتے ہیں مشرق میں صورت یہ ہے کہ لوگ نوجوان نسل کے حقیقی مسائل کو پس پشت ڈال کر طرز آرائش و لباس، عادات و اطوار اور سلیف و آداب جیسی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں یہ بحثیں دوسروں کے درمیان ہیں جن میں سے ایک اپنے آپ کو روایت پسند اور دوسرا جدت پسند کہتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان دونوں مکاتب فکر میں سے کوئی مکتب فکر دوسرے پر غالب آئے مگر اس سے اصل مسائل کے حل میں کسی طرح کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا ان میں سے ایک مکتب فکر خود کو متمدن کہتا ہے اور دوسرا متدین، لیکن حقیقت میں دونوں کا دعویٰ غلط ہے ان میں سے کسی کا تمدن سے کوئی ربط ہے اور نہ تدین سے۔ ایک مکتب فکر کا دعویٰ ہے کہ اس کے نزدیک عورت کا مثالی نمونہ جناب فاطمہؑ اور جناب زینبؑ ہیں اور دوسرے گروہ کا دعویٰ ہے کہ وہ مغربی عورت کو آئیڈیل عورت سمجھتا ہے لیکن دونوں کا دعویٰ جھوٹا

ہے یا تو وہ دونوں دانستہ غلط بیانی کرتے ہیں یا پھر اپنے اپنے مثالوں سے ناواقف ہیں۔

یورپ والوں کی خواہش ہے کہ مشرقی معاشروں کے مزاج کو بدل دیں۔ ہماری دولت کو لوٹ لیں۔ ہمارے نکر و احساس پر مسلط ہو جائیں۔ ہماری روٹی ہم سے چھین لیں اور ہمارے شعور، ہماری شناخت، ہمارے ارادے ہماری اصل اور اساس اور ہماری اقدار کو غارت کر دیں اس لیے کہ اس کے بغیر ان کے لیے ہمارے منہ سے لقمہ چھیننا اور ہماری دولت کو اپنی تجویروں میں بھرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔

اس معاشرتی تبدیلی کے عمل کی پہلی ضرورت تخلیق ہے۔ تخلیق کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن و شعور کو بالکل خالی کر لیں۔ اپنی انسانیت کو فراموش کر دیں اپنی قدروں کو بھلا دیں اور اپنی تمام دنیاویات کو جو ہمیں خود اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ یکسر نظر انداز کر دیں ہم اپنے وجود کو خود شکستہ کر لیں اپنے فکر و شعور کو بالکل خالی کر لیں گویا ہماری مثال ایک ایسی خالی لوکری کی سی ہو جائے جس میں جب چاہو کوڑا کرکٹ بھر لو اور جب چاہو اسے پھر خالی کر لو مشرق کی نکر اور مشرق کی روح کے ساتھ یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے جب لوگ داخلی طور پر خود کو خالی کر لیتے ہیں ایمان و اقدار سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں جب وہ اپنی شناخت کھو دیتے ہیں ان کے نزدیک کوئی شے ایسی باقی نہیں رہتی جس پر وہ تکیہ کر سکیں کوئی شخصیت ایسی نہیں رہتی جسے وہ اپنا، میر و سمجھ سکیں وہ اپنے ماضی کو ننگ و عار کا نمونہ سمجھتے ہیں ان کے خیال میں مذہب خرافات بن جاتا ہے وہ مذہب کو قدامت پرستی اور رجعت پسندی کے مترادف خیال کرتے ہیں اور مذہبی زندگی کو قابل نفرت گردانتے ہیں۔ مخفیہ یہ کہ وہ خود اپنے وجود کو اپنی اصل اور نسل کو اور اپنی زندگی کے مقصد اور معنویت کو یا تو بالکل نہیں سمجھتے یا اگر سمجھتے ہیں تو غلط سمجھتے ہیں وہ اندرونی طور پر ایک



ایسے خلاء کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جسے استعمار جس طرح چاہے پر کر سکتا ہے۔ ان کی مثال خالی مشک کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ شدت تشنگی کا شکار ہو کر اپنے اندرونی خلاء کو پر کرنا چاہتے ہیں اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں انہیں مغربی استعمار کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔

صورت یہ ہے کہ مشرق کو تباہ کرنے کے لیے ہر ایک کو خود سے بیگانہ کیا جا رہا ہے، مسلمان، بدھ، ہندو، ایرانی، ترک، عرب، سیاہ، سفید مغرض ہر ایک کے لیے ایک سی وضع تشکیل دی جا رہی ہے۔ ہر ایک کو یکساں سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے، ہر مذہب، ہر قوم، ہر رنگ اور ہر نسل کے شخص کو ایک ہی شکل میں ڈھال کر ایک بعدی شخص بنایا جا رہا ہے یعنی ایسا فرد جو مغرب کے فکری اور اقتصادی مفاد کی خدمت کر سکے اور اپنے بلے میں نہ کچھ سوچے اور نہ اپنے مسائل پر غور کر سکے۔

عصبیت، انسانی اقدار، روایات، اور مذہب وہ موانع ہیں جو مغرب کی یلغار کو روکتی ہیں اور اس یلغار کے مقابلہ میں مشرق کی حفاظت کرتی ہیں۔ عصبیت ایک مستحکم فسیل کی طرح ہے جو اسلام اور آزادی کی حفاظت کرتی ہے اور مغرب کے اثر و نفوذ کی راہ میں ایک سنگ گراں کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلمان اپنے دین پر فخر کرتا ہے اپنی زندگی کی معنویت اور اپنی اقدار کو برتر سمجھتا ہے اسلام کی تاریخ اس کا تمدن اس کی شخصیات اور اس کے ایمان اور مذہب کے اصول انسان کو آزادی، عظمت اور سر بلندی کا احساس عطا کرتے ہیں۔ اپنی عصبیت کے حوالے سے مسلمان جب مغرب پر نگاہ ڈالتا ہے تو وہ اسے نوردولتیا اور تمدنی اعتبار سے اس کی عمر بہت کم پاتا ہے وہ مغرب پر تنقید کرتا ہے اسے اپنے مقابلہ میں حقیر گردانتا ہے۔ مغرب اس عظیم حفاظتی فسیل، عصبیت، پر بڑی عیاری سے حملہ کرتا ہے وہ اس فسیل میں رخنہ پیدا کرتا ہے اور لوگوں کے ذہنوں کو مفلوج کر کے ان کو فکری خلاء سے دوچار کر دیتا ہے رفتہ

رفتہ وہ لوگ جو مغربی حملوں کی بلغار کا پامردی اور توانائی سے مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں نیست و نابود ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان کی جگہ وہ لوگ لے لیتے ہیں جو اندرونی خلل کا شکار ہیں جن میں مغرب سے مقاومت کی تاب نہیں ہے۔ یہ کمزور اور حقیر اور بے مایہ لوگ جو مغرب چاہتا ہے وہ کرتے ہیں جو مغرب سے ملتا ہے اسے قبول کرتے ہیں مختصر یہ کہ وہ اس قالب میں ڈھل جاتے ہیں جس میں انہیں مغرب ڈھالنا چاہتا ہے۔

## مشرقی معاشروں کی تبدیلی میں عورت کا کردار

تمام مسلمان ملکوں میں عورتوں کی حیثیت ایک ایسے طاقتور عامل کی ہے جو معاشرہ کو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ قدیم روایات، آداب و اخلاق، اجتماعی روابط معنوی اقتدار غرض ہر شے کو بدلنے پر قادر ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ضروریات زندگی کا پیما تبدیل کر مغربی مال کے لیے زیادہ سے زیادہ کھپت کے مواقع فراہم کر سکتی ہے دیہاں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اگر عورت معاشرے کو بدلنے پر قادر ہے تو وہ اس کی اقدار، روح اور معنویت کے تحفظ کی قدرت بھی رکھتی ہے مگر ایسا کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ عورت ایک حساس روح رکھتی ہے خصوصاً مشرقی عورت کی حساسیت بہت شدید ہے اس لیے وہ نئی تہذیب و تمدن کی چمک دمک اور اس کے ظاہری حسن سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہوجاتی ہے۔ بالخصوص جب اسے اس مغربی تمدن کے جلووں کے مقابلہ میں دوسری طرف صرف تاریکی اور بد صورتی نظر آئے۔ جب افریقی ممالک میں مغربی استعمار کا دور شروع ہوا تو یورپ کے عیار لوگ افریقی قبائل میں گھوم پھر کر رنگین شیشہ اور نقلی ہیرے جو اصلی ہیروں اور قد رتی جواہر کے مقابلہ میں بہت زیادہ شلوخ رنگ اور ذوق برق اور چمکدار نظر آتے ہیں فروخت کرنے لگے ماہرین نفسیات کے نزدیک یہ ایک مسلم اصول ہے کہ مادہ طبیعت بدروی عموماً ظاہر کی چمک دمک

سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور کسی شے کی اصل قدر و قیمت کے مقابلے میں اس کے ظاہری رنگ و روپ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اگرچہ کہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے دوسرے طبقات بھی اس ظاہری اور مصنوعی چمک دمک کے سحر میں گرفتار ہیں جیسے عرب شیوخ، افریقی قبائل کے سردار، فلم اسٹار وغیرہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسلے قبائل، بڑے امراء اور صاحب جاگیر لوگ اس سحر میں گرفتار ہو گئے اور اجتماعی تقریبات اور شادی بیاہ کے مواقع پر ان رنگین شیشوں اور نقلی ہیروں کے زیورات کی نمائش ثروت مندی اور برتری کا نشان سمجھی جانے لگی مغرب کے عیار تاجران بے قیمت شیشوں کے عوض منہ ملا گئے دام وصول کرتے تھے جیسے بھیڑ بکریوں کا گلہ، یا کوئی زر خیز قطع زمین یا کوئی ایسا علاقہ جہاں سے اصلی بیروں کی کان کنی کی جاسکے یا جہاں قبوہ کاشت ہو سکے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افریقہ کی حالت کو بدلنے میں وہاں کے بدوی قبائل کی سادہ لوح عورتوں نے تجد و پسندی کے جال میں جھنس کر کس قدر زبردست کردار ادا کیا ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی معاشرے میں عورت کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہے اور مذہب اور روایت کے نام پر اس کے لیے جو رسوم اور شعائر وضع کئے گئے ہیں وہ مذہب کی حقیقی روح سے کس قدر مختلف ہیں۔ عورت کو حصولِ علم خواندگی اور بہت سے دوسرے انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے اجتماعی زندگی میں اس کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے اسے ترقی اور کمال کی طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ وہ اپنی عقل، فکر، احساس اور روح کی تربیت اور نشوونما کے مواقع سے محروم ہے۔ حد یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو جو مقام و مرتبہ دیا ہے اور بحیثیت عورت اس کے جو حقوق و فرائض معین کئے ہیں۔ ہم نے خود اسلام کے نام پر ان کی نفی کر دی ہے اور وہ تمام حقوق عورتوں سے چھین لئے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی حیثیت محض ایک کپڑے دھونے کی مشین کی سی ہے۔ اس کی تمام قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ بچوں کی مال ہے۔ ہم نے عورت کو اس کے نام سے

محروم کر دیا ہے۔ ہمیں عورت کا نام زبان پر لائے ہوئے مار محسوس ہوتا ہے اور ہم عورت کو اس طرح موسوم کرتے ہیں کہ یہ فطاس کی ماں ہے۔

## ستم گر اور ستم پذیر

حضرت علی کا ارشاد ہے کہ اگر کسی جگہ ظلم ہو رہا ہے تو اس کی ذمہ داری دو فریقوں پر عائد ہوتی ہے ایک وہ جو ظالم ہے اور دوسرا وہ جو ظلم کو قبول کر رہا ہے یعنی اس کے خلاف کوئی احتجاج یا مزاحمت نہیں کرتا، ان دو فریقوں کے تعاون ادا مشترک کے نتیجے میں ظلم وجود میں آتا ہے ورنہ ظلم کا وجود ممکن نہیں ہے ظلم ہوا میں ظلم کے پاؤں نہیں جما سکتا۔ یہ دو طرفہ عمل ہے ایک شخص ظلم کرتا ہے اور دوسرا اس ظلم کو قبول کرتا ہے ظلم کے لیے یہ دونوں شخص ذمہ دار ہیں۔ دونوں مسرور ہیں۔ ظلم کی ذمہ داری تنہا ظالم پر عائد نہیں ہوتی۔ اگر کوئی معاشرے سے دوچار ہوتا ہے تو اس شکست کی ذمہ داری اس معاشرے پر بھی ہوتی ہے۔ کوئی فاتح کسی معاشرے پر فتح نہیں پاسکتا جب تک کہ خود اس معاشرے میں ایسے حالات نہ ہوں جو فاتح کی فتح کے لیے راہ ہموار کر سکیں، مثلاً ساتویں صدی ہجری میں ہمیں چنگیز خان کے ہاتھوں ذلت اور شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہماری شکست محض چنگیز خان کی ہم جوئی کا نتیجہ تھی نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم خود ایسے حالات پیدا کر رہے تھے کہ ہمیں شکست سے دوچار ہونا پڑے پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ہم نے خود کو اس قدر بوسیدہ اور رختہ کر لیا تھا ہم اندرونی طور پر اس قدر کمزور پڑ چکے تھے کہ چنگیز کی فقط ایک ضرب سے ہم ریت کی دیوار کی طرح گر پڑے ہم ایک ایسے درخت کی طرح تھے جسے دیگ نے اندر سے چاٹ لیا ہو جب کسی درخت کو دیگ کھوکھلا کر دیتی ہے تو اس کی جڑیں زمین میں قائم نہیں رہ سکتی وہ درخت زندگی اور توانائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ کھوکھلا اور کمزور پڑ جاتا

ہے۔ وہ ہوا کے معنوی سے جھونکے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دراصل یہ طوفانی ہوا نہیں ہے جو درختوں کو اکھاڑ پھینکتی ہے بلکہ یہ خود درخت کی کمزوری اور اس کا کھوکھلا پن ہے جو اس کے زمین بوس ہونے کا سبب بنتا ہے کون نہیں جانتا کہ تند و تیز ہوائیں جنگل میں ہمیشہ چلتی رہتی ہیں پھر کیا سبب ہے کہ سب درخت نہیں گرتے بلکہ وقتاً فوقتاً ایک یا دو درخت زمین پر گر جاتے ہیں۔

اگر آج کی عورت دیوانہ وار رنگ بدل رہی ہے۔ تیزی سے مغرب زدگی کا شکار ہو رہی ہے اگر وہ خود کو مغرب کی گھٹیا عورتوں کے رنگ میں رنگ رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرتی مسائل سے غفلت برت رہے ہیں، ہم یورپ کے استعماری اور اقتصادی نظام اور اس کے اثرات کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں اس لحاظ سے ہم خود مغرب کے استعماری نظام کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ ہم عورت کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ہماری قید و بند سے فرار حاصل کرے اور پھر مغرب اس مفروضہ قیدی کا آسانی سے شکار کر لیتا ہے ہم نے اس کو حقیر، کمزور، شکستہ پا، شوہر کی کنیز، بچوں کی ماں، (یہ عہد غلامی کی اصطلاح ہے جب عورتوں کو ام ولد کہا جاتا تھا) حتیٰ کہ بے ادبی اور بزدل جیسے القاب سے نوازا۔ ہم نے اس کی خلقت کو انسانی خلقت سے جدا کر دیا ہے اور ہم اس طرح کی بحثیں کرنے لگے کہ کیا عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا جائز ہے یا نہیں۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ اگر عورت لکھنا سیکھ جائے تو ممکن ہے کہ وہ نامحرموں سے حفاظت و کتابت کرنے لگے۔

ہم عورت کی عفت اور تقویٰ کی حفاظت کس طرح کرتے ہیں؟ اسے چار دیواری میں مقید کر کے۔ ہم عورت کو انسان نہیں سمجھتے کہ جس کے فکر و شعور کی تربیت کی جائے جو خود برے اور پھلے میں تیز و انتخاب کر سکے بلکہ ہم اسے ایک حیوان سمجھتے ہیں ایک ایسی وحشی اور غیر عقلی مخلوق سمجھتے ہیں جو فکر و شعور کے جوہر سے عاری ہے اور جس کی تہذیب و تربیت ممکن نہیں ہے۔ ہمارا انداز

روایات اور جنابِ خاطرہ کی بیرونی کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ عورت کی پردہ نشینی کو اس کی عفت کی علامت خیال کیا جاتا ہے اسے گھر کی جہاد دیوار بند میں پردہ نشین بنا کر بیٹھا دیا جاتا ہے اور اسے یہ سمجھایا جاتا ہے کہ اس کا اصل کام بچوں کی پرورش اور تربیت ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی عورت جو خود ناقص اور نااہل ہے جس میں صلاحیت اور استعداد کی کمی ہے جس کا ذہن تربیت یافتہ نہیں ہے جو نوشت و خواند، تعلیم، کتاب، تربیت، تفکر، تمدن، ثقافت اور معاشرتی ضروریات سے بے بہرہ ہے کس طرح آئندہ نسل کی تربیت و تعلیم کے فریضہ کو انجام دے سکتی ہے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ایسی پردہ نشین عورتیں آئندہ نسل کی پرورش کنندہ ہیں ان کے نزدیک بچوں کی پرورش کا مقصد صرف ان کا جسمانی تغذیہ ہے اس لیے کہ وہ عورت جو خود ناقص اور غیر تربیت یافتہ ہو جو خود علم و تمدن و ثقافت سے بے گانہ ہو بچوں کی فکری اور ذہنی بالیدگی اور ان کی روحانی اور جمالیاتی تربیت میں کیسے حصہ لے سکتی ہے وہ بچوں کی نفسیات اور ان کی نزاکتوں سے بالکل واقفیت نہیں رکھتی اس لیے وہ ان کی تربیت کے مشکل اور اہم فریضہ کو پورا کرنے سے معذور ہے اس کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ بچوں کو دودھ دیا کرے اور ان کے کپڑے، پتھرے، بدلتی رہے وہ بچہ کی تربیت کس طرح کرتی ہے بس یہ کہ اسے ڈانٹے، ڈپٹے، برا بھلا کہے، ڈر لائے دھمکائے اور اگر بس چل سکے تو اسے زد و کوب کرے اور اگر بچہ پر بس نہ چلے تو خود اپنا سینہ پیٹے ان سب باتوں کا بھی اگر بچے پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو وہ اسے کسی خیالی اور روایتی بابا سے ڈراتی ہے اس کے بعد جن، ملک الموت اور دیگر نادیدہ قوتوں سے ڈرنے کی باری آتی ہے پھر بھی اگر یہ بچہ قابو میں نہیں آتا تو اسے جن بھوت، دیو، لولو وغیرہ سے ڈرایا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی بچہ کو برا بھلا کہنے، کو سننے دینے اور اسی طرح کی دیگر لغویات اور خرافات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس نظام تعلیم و تربیت میں بچوں کی تربیت

کا واحد مقصد گریہ و بکا سمجھا جاتا ہے ذاکر و خطیب (دو منہ خوان) اپنی تقریر کے ابتداء میں بزمِ خود جو علمی گفتگو کرتا ہے اس کے مخاطب صرف مرد ہوتے ہیں اس لیے کہ عورت اتنا شعور و علم نہیں رکھتی کہ وہ علمی مطالب کو سمجھ سکے یا ان باتوں کا ادراک کر سکے جو عوامی سطح سے بالاتر ہیں۔ ان مجالس میں اگر عورتوں سے خطاب کیا جاتا ہے تو وہ کچھ اس طرح کا ہوتا ہے ”اے ضعیفہ خاموش ہو جاؤ ٹھیک سے بیٹھو اپنے بچوں کو چپ کراؤ“ گویا عورتوں کو صرف سرزنش کی جاتی ہے تمام گفتگو کا مخاطب صرف مرد ہوتے ہیں البتہ پڑھنے والا جب مصائب کی طرف گزیر کرے تو پھر وہ عورتوں کو مخاطب کرتا ہے اب وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے ذریعے عورتوں کو گریہ و بکا پر زیادہ سے زیادہ آمادہ کیا جاسکے مقصد یہ ہوتا ہے کہ عورتیں اپنے نالودھیوں اپنے شور و بکا اور شور مارتے سے مجلس کی رونق بڑھا سکیں اور ذاکر زیادہ... کا میاب قرار دیا جاسکے۔

عورت جس کا کام محض اتنا ہے کہ وہ گھر میں ”تولید بچہ“ کا فریضہ انجام دے اور معاشرے میں اس کا کام صرف تولید اشک ہو تو ایسی عورت کو جناب فاطمہؑ یا جناب زینبؑ کے کردار سے کیا نسبت ہے ہمارے معاشرے میں کس قسم (TYPE) کی عورتیں بنائی جاتی ہیں اور اس کے باوجود ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا آئیڈیل (IDEAL) جناب فاطمہؑ ہیں۔ مگر ہم اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ یہ وہ اعلیٰ اور مقدس ہستی ہے جنہوں نے زینبؑ جیسی بیٹی کی تربیت فرمائی۔ زینبؑ جو چند دن قبل کربلا میں اپنے بھرے گھر کو اچڑتے دیکھ چکی تھیں جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے عزیزوں کو قتل کیا گیا تھا جن کے اپنے قابلِ فخر بیٹے ان کے سامنے دم توڑ چکے تھے ایک آدمی جابر کے دربار میں کس وقار اور دبہ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ جو بنی امیہ کی ظالم اور وحشی حکومت کے جبر و تشدد سے مطلق ہر اسان نہیں تھیں بلکہ سلطانِ جابر کے سامنے خود اس کے دربار میں کھڑے ہو کر نہایت جرأت اور استقامت کے ساتھ کلمہ حق کا

اعلان ان الفاظ میں کر رہی تھیں کہ ”اس خدا کی حمد جس نے ہمارے خاندان کو  
کو ہر طرح کی عزت و افتخار سے سرفراز فرمایا اور ہمیں اپنی بے پایاں رحمت  
کے لیے منتخب کیا۔“

بھلا ہمت و استقلال کے اس پیکر کو ہماری ان عورتوں سے کیا نسبت  
ہے جو ایک گھریلو چوہے سے خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔

ہم نے عورت کو ہر چیز سے محروم کر دیا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے دین و مذہب  
کے شعور سے بھی محروم ہے وہ اسلام کو نہیں سمجھتی ایمان کے تقاضوں سے نا آشنا ہے  
مذہب کی روح سے بے خبر ہے وہ نہ اپنے مذہب کی شناخت رکھتی ہے نہ اس کی اپنی  
کوئی شناخت ہے۔ چونکہ اسے علم سے بے گانہ رکھا گیا ہے اس لیے اس کا مجموعی مشغلہ  
صرف غیبت کرنا ہے اس کا زیادہ تر وقت غیبت کرتے گزرتا ہے چونکہ اس کا کوئی  
علمی اور فکری مشغلہ نہیں ہے اس لیے اس کا کام محض کھانا پکانا ہے اور چونکہ  
اس کا علم، کتاب، مجالس، منبر اور دیگر اجتماعی امور سے کوئی تعلق نہیں قائم  
ہو سکا اس لیے اب یہ کہا جاتا ہے کہ عورت، مردوں کی برابری کس طرح کر سکتی ہے  
اس میں اس بات کی اہلیت ہی نہیں ہے کہ اسے علمی، فکری، یا دینی مشاغل میں  
شرکت کا موقع دیا جائے یہ ایسی ہی بات ہے کہ پہلے ہم کسی کو مغلوب بنا دیں اور  
پھر یہ استلال کریں کہ چونکہ یہ مغلوب ہے اس لیے یہ سرگرمی سے شرکت سے  
محروم ہے۔

سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ تمام خرافات، جہالت تنگ نظری  
اور پسماندگی اور اس قوی روایت کی پیروی جو ماضی کے کہنہ اور فرسودہ نظاموں کی  
یادگار اور بددی، خلائی اور پیر سالاری کے دور کی میراث ہے مذہب کے نام  
پر کی جا رہی ہے یہ تمام عوامل جو ہمارے دور از کار ماضی کا ورثہ ہیں ایک مکئی  
کے جلنے کی طرح عورت کو اپنے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں۔ عورت جہالت، بے باکی  
اور قدیم روایات کے جال میں گرفتار ہے اور یہ سب کچھ مذہب اسلام اسلامی



نظریہ ہے کہ عورتوں کی حفاظت کا واحد طریقہ انہیں نفس میں قید کر دینا ہے گویا وہ کوئی ایسا پرندہ ... ہے کہ اگر نفس کا در کھل جائے گا تو وہ فوراً اڑ جائے گا عورت کی عفت کو ہم شبہم کی طرح سمجھتے ہیں جو آفتاب کی لگا ہوں کی تاب نہ لا کر غوراً اڑ جاتی ہے۔ عورت ہماری قید میں ایک ایسی مخلوق ہے جو گھر کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتی اسے اسکول، لائبریری، کالج یا یونیورسٹی میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کالج یا یونیورسٹی میں غیر مسلم طلباء بھی پڑھتے ہیں یہ اقوام ہمارے خیال میں نجس ہیں بلکہ یہ لوگ انسان ہی نہیں ہیں اس لیے کہ یہ انسان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اس لیے ہم ان انسان نما حیوانوں کے درمیان اپنی لڑکیوں کو کیسے بھیج سکتے ہیں؟ نتیجہ یہ کہ ہماری لڑکیاں تعلیم سے محروم رہتی ہیں اگرچہ کہ یہ ہمارا اعتقاد ہے کہ "تحصیل علم ہر مسلمان عورت اور ہر مسلمان مرد پر واجب ہے" اور تحصیل علم کا یہ فریضہ مسلسل اور جاری ہے یہ جہد سے لحد تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم منبروں سے اس حدیث پیغمبرؐ کی تبلیغ کرتے ہیں رمضان کے پورے مہینہ وعظ وپند کی محفلیں سجائی جاتی ہیں لیکن ان محافل میں صرف مرد شریک ہو سکتے ہیں انہیں عورتیں کبھی شریک نہیں کی جاتی صرف متمول گھرانے کی عورتیں جو اپنے گھروں پر استاد سے پڑھنے کا خرچہ برداشت کر سکتی ہیں تعلیم حاصل کر سکتی ہیں باقی تمام خورتیں تحصیل علم کی سہولت سے محروم ہیں وہ اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ تحصیل علم کے دینی فریضہ کو پورا کر سکیں۔

مذہبی مجالس و محافل ہوں، دینی معاملات ہوں، تبلیغی امور ہوں یا قرآن، حدیث، فلسفہ تاریخ عرفان کا درس ہو عورت کے لیے کہیں جگہ نہیں ہے وہ ان میں سے کسی کام میں شریک نہیں ہو سکتی۔ اسے صرف مجالس عزائم شریعت کی اجازت ہے اور وہ بھی پردے کے پیچھے۔ ان مجالس میں عورت کی شرکت

اسی طریقہ سے ہوتی ہے اس لیے کہ اس نظام میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورت اگر اپنی فکری اور روحانی تربیت پر وقت صرف کرے گی تو اس سے اس کے فزینہ۔ بچوں کی پرورش کو نقصان پہنچے گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے قدیم روایتی معاشرے میں عورت کسی بے چارگی کا شکار ہے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم نے ان اخلاط پذیر روایات پر مذہب کا جھوٹا غلاف بڑھا رکھا ہے اس معاشرے میں عورت کی زندگی کس طرح گزرتی ہے ابتداً وہ باپ کے گھر میں ایک ناپسندیدہ فرد اور ایک ایسے قیدی کی طرح رہتی ہے جیسے تازہ ہوا بھی نصیب نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ جوانی کی منزلوں میں قدم رکھتی ہے ایک مقررہ رقم کے عوض جس پر بیچنے والا (اس کا پہلا مالک، والد) اور خریدنے والا (اس کا دوسرا آقا شوہر) راضی ہو جاتے ہیں وہ شوہر کے گھر منتقل ہو جاتی ہے شوہر کے گھر منتقل ہوتے وقت دستاویز بالفاظ دیگر قبائلی ملکیت تحریر کی جاتی ہے اس میں اس کا کام اور اس کی قیمت دونوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ اپنے نئے آقا (شوہر) کے گھر میں وہ ایک باعزت ملازم کی حیثیت رکھتی ہے جو خانگی امور کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھانا تیار کرتی ہے۔ بچوں کو دودھ پلاتی ہے اور اولاد کی نگہداری کا فریضہ انجام دیتی ہے غرض خانگی زندگی کے تمام امور انتظامات اور تمام داخلی معاملات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے وہ ایک ملازم ہے اور ایک دایہ ہے لیکن کیونکہ وہ بغیر اجرت کے ملازمت کرتی ہے اس لیے اسے کوئی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ چونکہ وہ رسم و شریع و قانون کے نام پر یہ خدمت انجام دیتی ہے اور چونکہ اسے ملازم کہنا رسم و رواج کے خلاف ہے اس لیے اسے گھر کی مالک کا نام دیا جاتا ہے اور چونکہ اس کا آقا اس کا شوہر ہے اس لیے وہ بیگ کہلاتی ہے اور چونکہ وہ اپنے شوہر کے بچوں کی دایہ گیری کرتی ہے اس لیے اسے ماں کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ہماری گھریلو عورتیں تمام عمر جو کام کرتی ہیں ان کی نوعیت ایک ملازم اور ایک دایہ کے کام سے کسی طرح مختلف نہیں ہوتی اس لیے کہ انہیں اس کے علاوہ اور

کسی کام کی تربیت نہیں دی گئی۔ وہ علم و شعور کی دولت سے بے بہرہ ہیں۔

اس مرحلہ پر ہم صاحبِ ثروت والدین اور شوہروں کی قوت پر اس امر کی جانب خصوصی طور پر منقطع کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں اور بیویوں کو محض اس وجہ سے کہ وہ عورت ہیں تحصیل علم و کسبِ کمال سے محروم نہ رکھیں اور اپنی اس روش کو دینداری اور شفاء اسلام سے منسوب نہ کریں اس لیے کہ تاریخ اسلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ عورتیں تحصیل علم کے بعد درجہ اجتہاد تک پہنچیں اور انہوں نے مدارس میں معلمی کا فریضہ انجام دیا بہت سی خواتین نے نہایت مفید علمی اور اخلاقی کتابیں تالیف کیں۔

وہ عورتیں اور لڑکیاں جو تحصیل علم سے اس لیے محروم رہتی ہیں کہ ان کے پاس مزدوری معاشی وسائل نہیں ہیں لیکن وہ اپنے والد اور شوہروں کے گھروں میں محنت اور مشقت سے کام کرتی ہیں نہایت قابلِ تعریف و تحسین ہیں۔ یہ قبائلی یاد دہاتی ، لڑکیاں تمام اجتماعی امور میں حصہ لیتی ہیں اور دولت پیدا کرنے کے کام میں پوری طرح ہاتھ بٹاتی ہیں۔ یہ گھر کے باہر گلہ بانی اور گھیتی باری میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی گھر کے اندر کے تمام کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں گو یا یہ دولت پیدا کرنے کے اجتماعی عمل میں بھی شریک ہیں اور درونِ خانہ تمام امور کی دیکھ بھال بھی کرتی ہیں۔ یہ باغیچوں میں بیج ڈالتی ہیں، کھیتوں میں مضافی ستھرائی کرتی ہیں، میوہ چنتی ہیں درختوں سے پھل جمع کرتی ہیں۔ جانوروں کو آب و دانہ دیتی ہیں۔ ان کا دودھ دوتی ہیں پھر اس دودھ سے مکھن، دہی اور پنیر تیار کرتی ہیں جسے گھر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور بازار میں فروخت بھی کیا جاتا ہے یہ روٹی دھنتی ہیں، سورت کاتتی ہیں کپڑا بناتی ہیں، کپڑے سیتی ہیں اور ان سب کاموں کے ساتھ ساتھ یہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال بھی کرتی ہیں۔ گھر کا کھانا بھی پکاتی ہیں اور گھر کی مضافی ستھرائی بھی کرتی ہیں انہیں سے کچھ وہ بھی ہیں جو دست کاری اور حرفت سے بھی واقف ہیں اور گھریلو منعقوں کا کام کرتی ہیں

ایسی عورت بیک وقت بیوسی، دایہ، ماں، کارکن اور دستکار ہوتی ہے وہ نہالی گلستان کی طرح آزادی سے نشوونما پاتی ہے محراب کی قیروں کی طرح پاکیزہ محبت سے سرشار ہوتی ہے آہوان دشت کی طرح عشق و محبت سے بچے پیدا کرتی ہے اوراں بچوں کو ماں کی ماتا سے نوازی ہے۔ مادہ کی برتری کی طرح وہ اپنے شوہر اور اپنے گھر سے خلوص اور وفا دار ہوتی ہے وہ اس گھریں جو قید و بند کی سختیوں سے آزاد ہے اپنے خلوص اور وفا کے پھول مہکاتی ہے۔ اس پر کوئی جبر نہیں ہے مگر اس کے عشق کی شدت اور خلوص اسے اپنے گھر سے وفادار رہنے پر مجبور کر دیتا ہے وہ اپنے گھر کو اپنے تمام خاندان کو عشق و وفا کے خلوص سے نوازی ہے اور یہ سب کچھ اس آزادی کا کرشمہ ہے جو اسے حاصل ہوتی ہے۔ وہ آزاد ہے اس لیے وہ اپنے عشق و خلوص کو اپنی مرضی سے استعمال کرتی ہے بالآخر وہ اپنے ہاتھوں سے کھیتوں کی زمین کو سنوارتی ہے گھریں اپنے بچوں کو پیار اور محبت سے پالیتی ہے اور خواب گاہ میں اپنے شوہر کی خوشی کو درد کرتی ہے اور بازاروں میں اس کے ہاتھ کے تیار کئے ہوئے دستکار کے بہترین نمونے فروخت کئے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس سب سے ناکارہ اور بیچ عورت وہ ہے جو خاتون خانہ کلماتی ہے یہ ایک خوفناک مخلوق ہے جسے نہ مشرق کی روایتی عورت کہہ سکتے ہیں اور نہ جس میں مغرب کی جدید عورت کی کوئی خوبی پائی جاتی ہے یہ مغرب کی وہ جدید عورت نہیں ہے جو ایک ایسے گھر کی فرد ہوتی ہے جو دو افراد سے مل کر بنتا ہے۔ یہ دو افراد جو باہم شریک کار کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی حیثیت یکساں اور مساوی سمجھی جاتی ہے اور دونوں دولت کمانے کے لیے گھر کے باہر کام کرتے ہیں۔ گھر کے اندر بھی لڑکی کو لڑکے کی طرح ہر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے اور گھر کے باہر بھی لڑکی ہر طرح کی اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے آزاد ہوتی ہے وہ مسائل کو تجربے کے ذریعہ سمجھتی ہے اور سمجھتی ہے وہ ہر چیز کو دیکھتی ہے۔ ہر بات سے واقف ہوتی ہے زندگی اور اس کے تمام معاملات اور مسائل کو سمجھتی ہے۔ وہ اپنے تجربات اور حادثات کے نتیجے میں

برائی بھلائی، نیکی بدی، صلاح فساد، غرض زندگی کے تمام رنگ، تمام جلوؤں تمام معاملات اور مسائل کو عملی طور پر سمجھ سکتی ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کی تمام نیرنگیوں کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے غرض وہ ہر اس بات سے باخبر ہے جس کا اس سے کسی طرح کا کوئی تعلق ہے اسے لوگوں کی طرح تعلیم حاصل کرنے کی آزادی ہے وہ علم حاصل کرتی ہے مطالعہ کرتی ہے اپنے فکر و شعور کی تربیت کرتی ہے اپنے ذہن کو نشوونما دیتی ہے اپنے شعبہ میں تخصص تک پہنچ جاتی ہے بالآخر اعلیٰ معاشرے میں اقتصادی اور سماجی آزادی حاصل ہے وہ اپنے رفیق حیات۔ اپنے شوہر کے انتخاب میں مطلق آزاد ہوتی ہے۔

مشرق کی ناکارہ ترین اور بیچ اور لوچ عورت وہ ہے جو نہ مغربی عورت کی طرح اقتصادی اور نہ مشرقی قبائلی اور دیہاتی عورت کی طرح سرگرم عمل نظر آتی ہے یہ وہ خاتونِ خانہ ہے جو اپنے گھر کے کام کاج اور گھریلو زندگی کے امور سے بھی بے نیاز نظر آتی ہے۔ چونکہ اس کے پاس مالی وسائل ہیں اس لیے اس کے گھر میں ماورچی دایہ نوکر اور دوسرے خدمت کار موجود ہیں جو گھر کے مختلف کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اب اس عورت کی صورت کیا ہے؟ کیونکہ یہ دیہاتی عورت نہیں ہے اس لیے کھیتوں میں کام نہیں کرتی کیونکہ اس کا تعلق اہلِ حرہ سے نہیں ہے اس لیے اپنے شوہر کے ساتھ کام نہیں کرتی، چونکہ یہ یورپی عورت نہیں ہے۔ اس لیے گھر سے باہر دفاتروں میں کام نہیں کرتی، کیونکہ یہ تعلیم یافتہ نہیں ہے اس لیے کسی قسم کے خور و فکر سے عاجز ہے۔ کیونکہ اسے پڑھنا نہیں آتا اس لیے یہ کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتی چونکہ اس نے کوئی تربیت حاصل نہیں کی اس لیے اسے کوئی فن یا ہنر نہیں آتا چونکہ اسکے پاس دایہ ملازم ہے اس لیے یہ بچوں کو دودھ دینے کا کام بھی نہیں کرتی چونکہ نوکر موجود ہے اس لیے گھریلو سامان کی خرید و فروخت نہیں کرتی چونکہ خانگی نوکر رکھ سکتی ہے اس لیے امورِ خانہ داری انجام نہیں دیتی۔ چونکہ ماورچی موجود ہے اس لیے کھانا پکانے کی ذمہ داری سے بے نیاز ہے اور چونکہ اس کے گھر میں

خود کار مشینی نظام موجود ہے اس لیے ملاقاتیوں کے لیے گھر کا دروازہ کھولنے کی تکلیف بھی نہیں کرتی سوال یہ ہے کہ پھر یکس مرض کی دوا ہے آخر اس... کی زندگی کا مقصد کیلئے یہ زندہ ہے مگر اس کی زندگی کی دلیل اور جواز کیا ہے لوحِ وجود پر یہ کس قسم کا نقش ہے دیا۔ میں اس عورت کی حیثیت کیا ہے نہ یہ حقیقی معنوں میں مغربی عورت ہے اور نہ مشرقی۔ نہ عید ہے نہ قدیم، نہ دیہاتی ہے نہ مہمراں نہ یہ دفاتروں میں کام کرتی ہے نہ کارخانوں میں۔ نہ اس کا تعلق مدرسوں سے ہے نہ ہسپتال سے اسے نہ کوئی ہنر آتا ہے اور نہ کوئی فن۔ نہ اس کا تعلق قلم سے ہے نہ کتاب سے یہ نہ خانہ داری کے کام کرتی ہے اور نہ بچوں کی دیکھ بھال کا فریضہ انجام دیتی ہے اور پھر یہ کہ یہ زن بازاری بھی نہیں۔ اگر اس عورت کو کوئی نام دیا جاسکتا ہے تو وہ یہ کہ یہ زن شہب جمعہ ہے۔ آخر ایسی عورتوں کا کام کیا ہے؟ یہ خاتونِ خانہ ہیں۔ بیگم صاحبہ ہیں۔ ان کا مشغلہ کیلئے؟ زیادہ سے زیادہ اشیائے صرف کا استعمال۔ یہ اپنا وقت کیسے گزاری ہیں ایک لحاظ سے یہ بہت معروف رہتی ہیں۔ دن رات اپنی، معروفیات میں گرفتار رہتی ہیں مگر یہ کرتی کیا ہیں۔ ان کے بہت سے کام ہیں۔ مثلاً غیبت، حسد، دوسروں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کا اظہار اپنی شان و شوکت کی جھوٹی نمائش، دوسروں سے رقابت، تہمت، تنکیر، بڑے بول، خود نمائی، ناز، ادا، اطوار، عشوہ، غمزہ، جھوٹ، دھاتی جھگڑہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔

یہ خاتونِ خانہ اپنے طریقِ زندگی اور اپنے شعائرِ قدیم کو نبھائے جا رہی ہے وہ اپنی قسم کی دیگر عورتوں کے ساتھ ہمیشہ رقابت، حسد اور تصادم میں مبتلا ہے وہ اپنی مخصوص سرگرمیوں میں ہر تن غرق ہے اور اس طرح وہ اپنی زندگی کے بھیانک غلام اور اپنے وجود کی سنگین بے معنویت کو پر کرنا چاہتی ہے پر لے زمانہ میں زمانہ حرام ہو کر تھے جہاں ہفتہ میں ایک بار اس قسم کی بے کار اور متمول عورتیں جمع ہو کر ایک دوسرے کو اپنی حکایت سنایا کرتی تھیں۔ گویا ان زمانہ حراموں کی حیثیت ایک سینار کی سی ہوتی تھی جہاں ہر عورت اس ہفتہ کا کوئی اہم کام اور بڑا واقعہ

دوسروں کو سنا کر ان کو مبتلائے حیرت کرتی اور ان سے داد وصول کرتی۔ یہ واقعات کچھ سچ ہوتے اور کچھ من گھڑت۔ انہیں وہ محترم خواتین اپنے اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتیں اور اپنے اس بیان میں اپنی خیال بردازی کے جوہر دکھاتیں تاکہ ان کی کہانی میں صداقت کا خلاء تخیل سے پر کیا جاسکے اس حکایت کا مقصد اپنی بڑائی کا اظہار اور اس کے ساتھ ہی یہ خواہش ہوتی کہ دوسری عورتیں ان کے بیان سے مرعوب و متاثر بلکہ مبہوت و متحیر ہو سکیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ خواتین جنہیں یہ حکایت سنائی جاتی ہے وہ اس بات کو سمجھنے کے باوجود کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے اس میں بہت کچھ محض جھوٹ، غریب اور اختراع ہے اس بیان کو پوری دلچسپی سے سنتیں اور اپنی پسندیدگی اور حیرت کا اظہار بھی کرتیں اس لیے کہ ان کے پاس بھی اسی قسم کی کوئی نہ کوئی حکایت ہوتی جسے وہ دوسروں کو سنا کر انہیں حیرت زدہ کرنے اور ان سے داد وصول کرنے کی آرزو مند ہوتیں۔ اس طرح یہ بے چاری اور معزز خواتین ہفتہ میں ایک بار اپنے لیے ایک دلچسپ مصروفیت تلاش کرتی تھیں جس کے ذریعہ وہ اپنی ہفتہ بھر کی بے کاری، اپنے بے مقصد اور بیچ زندگی اپنے جہل اور محنت، اپنے وجود کے اندرونی خلاء اور اپنی اجتماعی زندگی کی بے معنویت کا مداوا کرنا چاہتی تھیں۔

مگر آج کے دور میں معمول طبقہ کے لیے زنا نہ حمام، بند ہو گئے ہیں اور جدید تمدن نے ان معوز، خواتین کو اس اجتماعی منفویت اور مصروفیت سے بھی محروم کر دیا ہے۔ جو ہفتہ میں ایک دن ایسی خواتین کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دیتی تھی اب زنا نہ حمام کی جگہ، عورتوں کی مختلف انجمنوں نے لے لی ہے۔ کلب قائم ہو گئے ہیں جہاں یہ ثروت مند خواتین اپنی دلچسپیاں تلاش کرتی ہیں۔ مگر یہ کلب، یہ جدید ازلے بے روح اور بے رنگ ہیں اور ان میں تو وہ گرمی اور حرارت بھی نہیں ہے جو سابقہ دور کے ننانہ حمام میں پائی جاتی تھی۔

مذہبی یا نیم مذہبی اجتماعات، محافل، مجالس، نذر و نیاز، حقیقہ اور قربانی اور معاشرتی تقریبات جیسے شادی بیاہ اور اس سے متعلقہ رسوم عورتوں کے

یہ اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مختلف مواقع تھے۔ جن میں عورتیں مذہب، رسم و رواج اور معاشرت کے نام پر شرکت کر کے اپنی تنہائی اور بے کاری کا مداوا کرتی تھیں اپنی اہمیت اور فعالیت کو اجاگر کرتی تھیں اور اپنی شخصیت، انفرادیت، حسن، زیبائی، آرائشی لباس اور زیورات اور اپنی خاندانی ثروت و دولت کا اظہار کرتی تھیں۔ لیکن اس قسم کی تقریبات آج کل کی موجودہ نسل کی نوجوان عورتوں کے لیے دلچسپی اور کشش نہیں رکھتی، نوجوان عورت ایسی تقریبات میں بہرہ ورا کرنا شرکت کرتی ہے۔ ان محفلوں میں وہ خود کو بے گانہ اور تنہا محسوس کرتی ہے۔ لہذا وہ ان اجتماعات سے فرار کرتی ہے۔

یہ نوجوان لڑکی جو اپنی ماں کے مقابلہ میں ایک دوسرے عہد اور دوسری نسل سے تعلق رکھتی ہے اور اپنی زندگی عالم برزخ میں گزار رہی ہے۔ نکری اعتبار سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی وہ ایک برزخ میں ہے۔ اس کے لیے خام بزرگ بجائے خود ایک عالم جبل و محافت ہے۔ وہ رسم و رواج کی ایک ایسی دنیا ہے جو ناروا اور مبنی پر جبل پابندیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ بزرگ خواتین اجتماعی زندگی کو پرانے ڈھرے پر قائم رکھنا چاہتی ہیں وہ اپنے رسوم و رواج کے بندھنوں میں اس طرح جکڑی ہوئی ہیں کہ انہیں وقت بدل جانے کی فکر تک نہیں ہے لیکن نوجوان نسل کی عورت جو علم سے آشنا ہے جس کا کتاب سے تعلق قائم ہو چکا ہے جو مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم پڑھ چکی ہے، جو اب، ناول، فن، اور ثقافت سے واقف ہے، جو تمدن جدید اور ثقافت مغرب سے آگاہ ہے۔ جو درس گاہوں میں تعلیم حاصل کر کے علم و دانش کی ترقی کی خوشبو سونگھ چکی ہے اس کے لیے زمانہ ماضی یا محاسن جس میں عموماً ایسے لوگ خطاب کرتے ہیں۔ جو ناخواندہ یا نیم خواندہ ہیں کوئی کشش نہیں رکھتیں وہ اس طرح کی سرگرمیوں کو برداشت نہیں کر سکتی وہ چاہتی ہے کہ اپنے فرسودہ اور خستہ ماحول سے فرار کرے۔ مگر وہ فرار کر کے جائے کہاں؟ اس عالم کے مقابل جو عالم اس کے سامنے ہے اور جو اسے بڑے شائستہ



اور دلکش جیلوں سے بلارہا ہے وہ مغرب کی ثقافت کا عالم ہے یہ وہ دنیا ہے جہاں رقص گاہیں ہیں شراب خانے ہیں۔ شینہ کلب ہیں۔ کثیف کیفے ٹیریا ہیں۔ یہ دنیا اس کے انتظار میں ہے کہ اسے اپنے جال میں پھنسلے اسے ایک جہنی شکار بنالے لیکن وہ چاہتی ہے کہ وہ اپنی انسانی شخصیت، ایمان اور اخلاق سے وفادار رہے۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ ماں، باپ، چچا، دیگر اعزاء اور مذہبی ٹھیکیدار، مذہب، اخلاق اور تحفظ شخصیت کے نام پر اس کے سامنے جو کچھ پیش کر رہے ہیں۔ وہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہے اور وہ الفاظ یہ ہیں۔ نہ کرو، نہ جاؤ، نہ بولو، نہ دیکھو، نہ چاہو، نہ لکھو، تم نہیں سمجھتے، تم نہیں جانتے وغیرہ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عورت جس کا تعلق قدیم نسل سے ہے جو ماں ہے وہ ایک ایسی دنیا میں رہتی ہے جو پیچ و پوچ ہے، بے کار اور بے معنی ہے نہ اس کی زندگی میں کوئی ہدف ہے نہ کوئی مسألہ، نہ اس کی زندگی کا کوئی فلسفہ ہے اور نہ معنویت اس کے پاس دولت کی فراوانی ہے اس لیے اس کی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں ہے کوئی دکھ درد نہیں ہے اس کی زندگی میں ایک ایسا غلام ہے جو اس کی گھر بیوی زندگی کے روز و شب کے معاملات کی طرح پر نہیں کر سکتے، مجبوراً وہ گھر سے نکل کر بازار جاتی ہے۔ وہاں اشیاء کی خریداری کے ذریعہ اپنی زندگی کے تنکڑے کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیورات اور جواہر کی خرید کے ذریعہ، مختلف گراں قدر قیمت اشیاء کی خرید کر کے لوگوں کو مبہوت اور متحیر کر دے اور اس طرح اپنے لیے یک گونہ مسرت اور انتحار حاصل کر سکے لیکن اس ماں کی بیٹی اس قسم کی باتوں سے اثر قبول نہیں کرتی۔ وہ دوسری ہواؤں میں سانس لیتی ہے وہ گویا ایسی گزلیہ ہے جس کا ذکر مدرسہ کی کتاب دوم میں ملتا ہے جو دوبار لیش بچوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ یہ بچے نادان ہیں اور کوئی بات نہیں سمجھتے۔ ان میں سے ہر ایک اس گزلیہ کو اپنی طرف پوری قوت سے کھینچ رہا ہے۔ اس کھینچ جان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گزلیہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ

نوجوان عورت ٹوٹ رہی ہے بکھر رہی ہے۔ بلکہ ریزہ ریزہ ہو چکی ہے۔  
 عہد جوانی میں اس کا دل روانوی خیالات کی آماجگاہ ہے۔ وہ رنگین  
 فضاؤں میں پرواز کر رہی ہے۔ جوانی کی رنگینیاں، آزادی اور عشق کے جلوے جیسی  
 جذبات کا طوفان، نوجوانی کے ارمان اور آرزوؤں کا بحران اسے گھیرے ہوئے ہے  
 وہ ایک نئی اور رنگین دنیا کی تصویر دیکھ رہی ہے۔ وہ قدیم دنیا کی طرف لپٹنے کے  
 اپنے گرد گھڑے کئے گئے حصار میں کہیں کوئی روزن یا شکاف تلاش کرتی ہے تاکہ  
 اس کے ذریعہ وہ نئی اور رنگین دنیا کا چوری چھپے نظارہ کر سکے۔ وہ اپنی خیالی دنیا میں  
 غرق ہے مگر ظاہری اندجسانی طوط پر وہ قدیم دنیا کی قیدی ہے وہ اپنے ماں باپ کے  
 احکام میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک مکھی ہے جو مکڑی کے جال میں گرفتار ہے  
 اور مکڑی کا یہ جال، نہ، نہ، نہ کے تاروں سے بنا گیا ہے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ  
 اس کا وجود محض اس قصور کی بنا پر ہے کہ وہ ایک لڑکی ہے، نہایت ناپسندیدہ  
 اور خطرناک سمجھا جاتا ہے اسے گھر کے گوشوں میں چھپا کر رکھا جاتا ہے یہاں  
 تک کہ اسے قانونی اور رسمی طور پر کسی ایسے شخص کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اسے اپنی حرم  
 سرا میں لے جاتا ہے شوہر کے گھر میں اس کا دائرہ عمل محض مطبخ اور بستر کے درمیان  
 محدود رہتا ہے اس کے وجود کا اثبات اس کی معنویت اور اہمیت اس کے شوہر کے  
 شکم اور زیر شکم پر منحصر ہوتی ہے اسے مذہبی جلسوں اور دینی اجتماعات تک میں  
 بھی شرکت کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس نظام فکر میں مذہب بھی زنانہ اور مردانہ شعبوں  
 میں تقسیم ہو گیا ہے نوحہ خوانی، مجلس، ماتم، اور نذر و نیاز عورتوں کا مذہب ہے جبکہ  
 حوزہ علمی، منبر، مدرسہ لائبریری، درس، بحث و گفتگو مردوں کا مذہب ہے

## فریاد استعمار

آخر یہ زمین کیسے ہموار ہوئی، کسی نے ہموار کی جو استعمار کو یہ نعرہ بلند کرنے  
 کا موقع مل سکا کہ آزاد ہو جاؤ۔ آزادی مگر کسی چیز سے۔ عورت کسی چیز سے آزاد

حاصل کرے کون سی ایسی بات ہے جس سے آزادی حاصل کی جائے۔ مگر یہ کون سوچے۔ استعمار نعرہ بلند کر رہا ہے تمہارا سانس گھٹ گیا ہے۔ تم محرومی کا شکار ہو آزاد ہو جاؤ۔ ہر چیز سے آزاد ہو جاؤ۔ ہر قید سے آزادی حاصل کر لو۔

وہ کہ جو سنگین ترین بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ جس کا سانس تنگ گھٹ چکا ہے اب فقط یہ سوچ رہی ہے کہ وہ آزادی کی فضا میں سانس لے سکے اور وہ اس قید اور فشار سے آزاد ہونا چاہتی ہے اور اسے یہ سوچنے کی ہمت نہیں ہے کہ وہ آزادی کس طرح حاصل کرے غلامی کا جوا اپنی گردن سے کس طرح اتارے۔

عورت آزاد ہو گئی۔ مگر یہ آزادی علم و دانش، تخلیق و تہذیب اور روشن خیالی کا نتیجہ نہیں ہے یہ آزادی فکر و نظر کی بلندی، سطح شعور، احساس کی تبدیلی کا ثمر نہیں ہے۔ جہاں بیٹی کی سطح نہیں بدلتی، عورت فکر و شعور کے اعتبار سے اسی طرح پست ہے۔ مگر وہ آزاد ہو گئی ہے۔ یہ آزادی قبیحی کا ثمر ہے۔ قبیحی نے اس کی چادر کو قطع کر دیا اور چادر سے آزادی حاصل کر کے عورت یہ سمجھ رہی ہے کہ وہ آزاد ہو گئی۔ روشن خیال بن گئی۔

مسلمان اور مشرقی عورت کے مسائل پر نفسیات دانوں اور ماہرین عمرانیات کے نظریات استعمار اور استعمار کے ہاتھوں میں ایک زبردست حربہ ہیں۔ جسے وہ اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں ان ماہرین کے نزدیک عورت کی تعریف یہ ہے کہ عورت وہ حیوان ہے جو اشیاء کو خریدتی ہے۔

ارسطو نے انسان کی نہایت جامع اور مانع تعریف اس طرح کی تھی کہ انسان جو ان ناطق ہے۔ اب عورت کے حوالے سے اس تعریف کو یوں تبدیل کر لیا گیا ہے کہ ”انسان ایک ایسا حیوان ہے۔ جو اشیاء کو خریدتا ہے“ اس کے علاوہ عورت کا نہ کوئی کام ہے اور نہ وہ کسی بات سے دلچسپی رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا نہ کوئی ایسا بلبل ہے نہ کوئی قدر، نہ کوئی نقش ہے اور نہ کوئی معنی۔

عورتوں کے متعلق ایک رسالہ نے یہ اعداد و شمار دیے ہیں کہ ۱۹۵۶ء اور

۱۹۶۶ء کے درمیان تہران میں عورتوں کی آرائش و زیبائش کے سامان کی کچیت میں ۵۰۰ گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ حیرت ناک ہے۔ اقتصادی دنیا میں ایک معجزہ ہے۔ پوری تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے عام طور پر اشیاء صرف کی کچیت میں ۸ فیصد، ۹ فیصد، ۱۰ فیصد یا حد سے حد ۲۰ فیصد اضافہ ہوتا ہے۔ مگر ۵۰۰ فیصد اضافہ کی مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دس سال قبل تہران میں سرجی پوڈرا اور دیگر سامان آرائش پر دس ہزار تومان خرچ ہو رہے تھے تو اب ۵۰ ملین تومان کی خاطر رقم خرچ کی جا رہی ہے۔

معاشرے میں کسی ایک شے کا صرف بہت سی دوسری اشیاء کا استعمال کی راہ ہموار کرتا ہے۔ مثلاً جب قبائلی جگہ کوٹ پتلون کا استعمال شروع ہوتا ہے تو ساتھ ہی پرانی وضع کے جوتوں کی جگہ جدید وضع کے بوٹ، قدیم وضع کی ٹوپوں کی جگہ جدید وضع کے ہیٹ استعمال ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ گھروں میں قالین کی جگہ نیا فرنیچر آتا ہے، غرض بہت سی پرانی چیزیں نئی چیزوں سے بدل جاتی ہیں۔

پس جب یورپ ہمارے معاشرے میں اشیاء صرف میں سے کوئی نئی شے بھیجتا ہے تو اس کے ساتھ ہی بہت سی دیگر اشیاء اور مصنوعات کے لیے راستہ کھل جاتا ہے اور جب اشیاء صرف بدل جاتی ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان اشیاء کو استعمال کرنے والے انسانوں میں بھی تبدیلی واقع ہو رہی ہے اس لیے کہ اشیاء صرف اور معروف کنندہ میں ایک بنیادی تعلق پایا جاتا ہے۔ جب معاشرے میں اشیاء صرف کی نوعیت بدلتی ہے تو مصرف کنندگان کے عقیدہ، رسم و رواج، روایت، تاریخ، ثقافت اور مذہب پر اس کے اثرات کا مرتب ہونا ناگزیر ہے۔

اسلامی ممالک میں جب عورت ایک ایسے مصرف کنندہ میں تبدیل ہو جاتی ہے جو مشرقی اشیاء کی بجائے یورپی اور امریکی مصنوعات استعمال کرنے لگتی ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ خاندانی اور اجتماعی زندگی میں تبدیلی کا ایک مؤثر عامل بن جاتی ہے وہ نسل امروز و فردا کے انکار و خیالات اور معاشرے کے مزاج کو متاثر کرنے کی

مصلحت رکھتی ہے، وہ اخلاق، اقدار، ادب، فن، عقیدہ غرض ہر چیز پر گہرے انقلابی اثرات مرتب کر سکتی ہے۔ مغربی استعمار اسے اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

موجودہ دور کے اقتصادی، اصول، تمدن اور ثقافت اجتماعی امکانات، معاشرتی روابط کا تغیر، فکر جدید وغیرہ وغیرہ اسلامی معاشرے پر ایک ناگزیر اثر ڈال رہے ہیں اور لوگوں کی فکر، ان کی وضع، ان کی روایت اور ٹائپ دیگر گون ہورہی ہے۔ لامحالہ عورت داخلی اور ظاہری ہر دو اعتبار سے تبدیل ہونے پر مجبور رہے اس کا ظاہر بھی بدل رہا ہے اور باطن میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے اس لیے کہ آج کی عورت کے لیے پرانی وضع، روایت قدیم، ناموزوں اور نامناسب ہے۔

اب کہ تبدیلی کا عمل ناگزیر ہے اور معاشرہ کے اہل فکر و اہل خبر و نظر اس تبدیلی کا پورا اشعہ نہیں رکھتے اور اس کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں۔ سرمایہ داروں کے لیے یہ اچھا موقع ہے کہ وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھائیں اپنے تیار کردہ قالب کو زیادہ سے زیادہ دلکش اور موثر بنائیں تاکہ عورت جب روایتی اور قدیم قالب کو توڑ کر آزاد ہو تو اس پر اپنا قالب مسلط کر دیں اسے اپنے وضع میں ڈھال لیں اسے ایک ایسی ٹائپ میں تبدیل کر دیں جو ان کے مفادات کے مطابق ہو اور جو معاشرے میں پانچویں کامل، کا کام انجام دے یعنی داخلی طور پر خارجی دشمن کے لیے ناہ ہوا کرے۔

## ہمیں کیا کرنا چاہیئے

اس ذہنی اور فکری یلغار کے مقابلہ میں ہم کیا کریں۔ کون ہے جو اس استعماری حملہ کے خلاف ہمارا دفاع کر سکتا ہے۔ وہ جو اس فکری یلغار کا مقابلہ کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکتی ہے وہ نہ روایتی عورت ہے نہ جو کبھی اور درماندگی کا شکار ہے۔ جو ماضی کے قالب میں آرام اور اطمینان سے ہے اور اس قالب کو بدلنے

کی کوئی تڑپ محسوس نہیں کرتی اور نہ وہ جدید عورت ہے جس کی مثال ایک چابی کی گڑیا کی سی ہے جو دوسروں کے اشارے پر ناچ رہی ہے اس نے مغربی قالب کو اپنا لیا ہے بلکہ اس ندری حملہ کا مقابلہ کرنے کی اہل وہ عورت ہے جو ان روایات قدیم کو جو متحجر ہو چکی ہیں، بے روح اور بے جان ہو چکی ہیں۔ شکست کھانے کی مصلحت اور ہمت رکھتی ہے۔ یہ روایات جہنیں دین سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل ان کا تعلق دین سے نہیں ہے بلکہ یہ ملاقاتی اور قومی روایات ہیں یہ وہ رجعت پسندانہ رسوم ہیں جو ہماری خواتین کے دل و دماغ اور ان کی اجتماعی زندگی کے طور طریقوں پر پوری طرح حکمران ہیں وہ عورت جو ان روایات کے شکنجوں کو توڑ کر اپنی انسانی کونٹے سرے سے دریافت کر سکتی ہے جو نہ عہد ماضی کی میراث کو گزشتہ لوگوں کے پسند و نفاق کو بغیر چون چرائی تسلیم کرتی ہے اور نہ جدید طور طریقوں کے فریب میں پھنستی ہے۔ بلکہ مغرب کے لغو آزادی کے پس پردہ اس عورت کے چہرے کو دیکھنے کی مصلحت رکھتی ہے جو کرب اور وحشت کی علامت ہے یہ ایک ایسی عورت کا کرب چہرہ ہے جو معذرت اور انسانیت سے عاری آزادی اور حرمت انسانی سے محروم اور بر قسم کی حقیقی آزادی سے دور ہے۔

یہی وہ خواتین ہیں جو اس بات کا شعور رکھتی ہیں کہ ہمارے قلب و دماغ پر جن چیزوں کو مسلط کیا جا رہا ہے وہ کہاں سے آ رہی ہیں ان افکار و خیالات کے پیچھے کون سے دماغ کا فرما، ہیں ان تبدیلیوں کے پس پردہ کون سے خفیہ ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ یہ کیسی اشیاء ہیں جنہیں باندوں میں بھیجا گیا ہے۔ بے احساس بے شعور، بے درد، بے عقل جن میں کوئی مسکولیت کا احساس نہیں ہے۔ جو انسانیت کے جذبات و احساسات اور شعور سے عاری ہیں۔ یہ خوش نما گدیا ہیں۔ تروتازہ اور شائستہ خواتین، مگر ان کی شائستگی کا مقصد اور مطلب کیا ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے شائستگی کا یہ تصور، تہذیب و ثقافت کا یہ لغو کہاں سے آیا ہے اور کیوں آیا ہے ہماری خواتین پر یہ نیا قالب کیوں اور کس مقصد کے تحت مسلط کیا جا رہا ہے۔

وہ خواتین جو ان حقیقتوں کا شعور رکھتی ہیں۔ ان کے لیے ”چگونہ باید شد“  
یعنی ہم کون ہیں اور ہمیں کیا ہونا چاہیے کا سوال اہم اور مزوری ہے۔ یہ وہ خواتین  
ہیں جو نہ اس روایتی قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں اور نہ اس رمغری قالب میں  
ڈھلنا پسند کرتی ہیں وہ بے ارادہ اور بغیر اپنی رائے سے انتخاب کئے کسی  
سانچے میں ڈھلنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ آزادی اور انتخاب کا حق چاہتی ہیں۔  
حقیقی آزادی، حقیقی انتخاب۔

ان کو ایک مثال کی تلاش ہے

اور یہ مثال کون ہے؟

(جناب فاطمہ)



1998, 1999, 2000, 2001, 2002, 2003, 2004, 2005, 2006, 2007, 2008, 2009, 2010, 2011, 2012, 2013, 2014, 2015, 2016, 2017, 2018, 2019, 2020, 2021, 2022, 2023, 2024, 2025, 2026, 2027, 2028, 2029, 2030, 2031, 2032, 2033, 2034, 2035, 2036, 2037, 2038, 2039, 2040, 2041, 2042, 2043, 2044, 2045, 2046, 2047, 2048, 2049, 2050, 2051, 2052, 2053, 2054, 2055, 2056, 2057, 2058, 2059, 2060, 2061, 2062, 2063, 2064, 2065, 2066, 2067, 2068, 2069, 2070, 2071, 2072, 2073, 2074, 2075, 2076, 2077, 2078, 2079, 2080, 2081, 2082, 2083, 2084, 2085, 2086, 2087, 2088, 2089, 2090, 2091, 2092, 2093, 2094, 2095, 2096, 2097, 2098, 2099, 2100, 2101, 2102, 2103, 2104, 2105, 2106, 2107, 2108, 2109, 2110, 2111, 2112, 2113, 2114, 2115, 2116, 2117, 2118, 2119, 2120, 2121, 2122, 2123, 2124, 2125, 2126, 2127, 2128, 2129, 2130, 2131, 2132, 2133, 2134, 2135, 2136, 2137, 2138, 2139, 2140, 2141, 2142, 2143, 2144, 2145, 2146, 2147, 2148, 2149, 2150, 2151, 2152, 2153, 2154, 2155, 2156, 2157, 2158, 2159, 2160, 2161, 2162, 2163, 2164, 2165, 2166, 2167, 2168, 2169, 2170, 2171, 2172, 2173, 2174, 2175, 2176, 2177, 2178, 2179, 2180, 2181, 2182, 2183, 2184, 2185, 2186, 2187, 2188, 2189, 2190, 2191, 2192, 2193, 2194, 2195, 2196, 2197, 2198, 2199, 2200, 2201, 2202, 2203, 2204, 2205, 2206, 2207, 2208, 2209, 2210, 2211, 2212, 2213, 2214, 2215, 2216, 2217, 2218, 2219, 2220, 2221, 2222, 2223, 2224, 2225, 2226, 2227, 2228, 2229, 2230, 2231, 2232, 2233, 2234, 2235, 2236, 2237, 2238, 2239, 2240, 2241, 2242, 2243, 2244, 2245, 2246, 2247, 2248, 2249, 2250, 2251, 2252, 2253, 2254, 2255, 2256, 2257, 2258, 2259, 2260, 2261, 2262, 2263, 2264, 2265, 2266, 2267, 2268, 2269, 2270, 2271, 2272, 2273, 2274, 2275, 2276, 2277, 2278, 2279, 2280, 2281, 2282, 2283, 2284, 2285, 2286, 2287, 2288, 2289, 2290, 2291, 2292, 2293, 2294, 2295, 2296, 2297, 2298, 2299, 2300, 2301, 2302, 2303, 2304, 2305, 2306, 2307, 2308, 2309, 2310, 2311, 2312, 2313, 2314, 2315, 2316, 2317, 2318, 2319, 2320, 2321, 2322, 2323, 2324, 2325, 2326, 2327, 2328, 2329, 2330, 2331, 2332, 2333, 2334, 2335, 2336, 2337, 2338, 2339, 2340, 2341, 2342, 2343, 2344, 2345, 2346, 2347, 2348, 2349, 2350, 2351, 2352, 2353, 2354, 2355, 2356, 2357, 2358, 2359, 2360, 2361, 2362, 2363, 2364, 2365, 2366, 2367, 2368, 2369, 2370, 2371, 2372, 2373, 2374, 2375, 2376, 2377, 2378, 2379, 2380, 2381, 2382, 2383, 2384, 2385, 2386, 2387, 2388, 2389, 2390, 2391, 2392, 2393, 2394, 2395, 2396, 2397, 2398, 2399, 2400, 2401, 2402, 2403, 2404, 2405, 2406, 2407, 2408, 2409, 2410, 2411, 2412, 2413, 2414, 2415, 2416, 2417, 2418, 2419, 2420, 2421, 2422, 2423, 2424, 2425, 2426, 2427, 2428, 2429, 2430, 2431, 2432, 2433, 2434, 2435, 2436, 2437, 2438, 2439, 2440, 2441, 2442, 2443, 2444, 2445, 2446, 2447, 2448, 2449, 2450, 2451, 2452, 2453, 2454, 2455, 2456, 2457, 2458, 2459, 2460, 2461, 2462, 2463, 2464, 2465, 2466, 2467, 2468, 2469, 2470, 2471, 2472, 2473, 2474, 2475, 2476, 2477, 2478, 2479, 2480, 2481, 2482, 2483, 2484, 2485, 2486, 2487, 2488, 2489, 2490, 2491, 2492, 2493, 2494, 2495, 2496, 2497, 2498, 2499, 2500, 2501, 2502, 2503, 2504, 2505, 2506, 2507, 2508, 2509, 2510, 2511, 2512, 2513, 2514, 2515, 2516, 2517, 2518, 2519, 2520, 2521, 2522, 2523, 2524, 2525, 2526, 2527, 2528, 2529, 2530, 2531, 2532, 2533, 2534, 2535, 2536, 2537, 2538, 2539, 2540, 2541, 2542, 2543, 2544, 2545, 2546, 2547, 2548, 2549, 2550, 2551, 2552, 2553, 2554, 2555, 2556, 2557, 2558, 2559, 2560, 2561, 2562, 2563, 2564, 2565, 2566, 2567, 2568, 2569, 2570, 2571, 2572, 2573, 2574, 2575, 2576, 2577, 2578, 2579, 2580, 2581, 2582, 2583, 2584, 2585, 2586, 2587, 2588, 2589, 2590, 2591, 2592, 2593, 2594, 2595, 2596, 2597, 2598, 2599, 2600, 2601, 2602, 2603, 2604, 2605, 2606, 2607, 2608, 2609, 2610, 2611, 2612, 2613, 2614, 2615, 2616, 2617, 2618, 2619, 2620, 2621, 2622, 2623, 2624, 2625, 2626, 2627, 2628, 2629, 2630, 2631, 2632, 2633, 2634, 2635, 2636, 2637, 2638, 2639, 2640, 2641, 2642, 2643, 2644, 2645, 2646, 2647, 2648, 2649, 2650, 2651, 2652, 2653, 2654, 2655, 2656, 2657, 2658, 2659, 2660, 2661, 2662, 2663, 2664, 2665, 2666, 2667, 2668, 2669, 2670, 2671, 2672, 2673, 2674, 2675, 2676, 2677, 2678, 2679, 26

1. *Pharmaceutical industry* – The pharmaceutical industry is the largest of the three industries, with sales of \$10.5 billion in 1997. It is the only industry that has a significant presence in all three markets.

Figure 1. The effect of the concentration of the *Agaricus bisporus* spores on the growth of *Agaricus bisporus* and *Agaricus bisporus* spores on the growth of *Agaricus bisporus*.

1. *Journal of the American Medical Association*, 1997; 277: 1001-1005.



حصہ دوم



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فاطمہ

جناب فاطمہ اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کی چوتھی اور سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ یہ ایک ایسے خاندان کی سب سے آخری بیٹی تھیں جس میں کوئی اولاد زیرِ زندہ نہ تھی، اور آپؐ کی ولادت عرب کے اس معاشرے میں ہوئی جہاں ہر باپ اور ہر خاندان بیٹے کے لئے آرزو مند ہو کرتا تھا۔

عرب کا قبائلی نظام مادری عہد سے نکل چکا تھا۔ زمانہ قبلِ لیث میں عرب جاہلیت کا معاشرہ پندرہ سالاری کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ ان کے خدام ذکر تھے جبکہ ان کے نزدیک بت اور فرشتے تدمونٹ ہو کر تے، گویا یہ اللہ کی بیٹیاں تھیں، قبیلہ کا سردار مرد ہوتا تھا، کوئی سفید ریش بزرگ، گھر کی حاکمیت باپ کے لیے وقف تھی۔ اصل میں ان کے نزدیک تمام مذہب کی بنیاد ان کے آباؤ اجداد کی سنت تھی۔ ان کا ایمان و عقیدہ وہی تھا جو ان کے "آبار" کا ایمان اور عقیدہ تھا۔ اللہ نے جو برگزیدہ پیغمبر بھیجے وہ اسی مذہب "آبار و اجداد" کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ مگر عربوں کی قوم پیغمبروں کے انقلابی پیغام کے علی الرغم اپنی روٹ پر قائم رہی ان کا مذہب سنت آبار کا تحفظ اور اساطیر الاولین کی پیروی رہا۔ یہ تقلیدی اور موروثی مذہب اصل میں پدر پرستی کے جذبہ کا شاخسانہ ہے جبکہ پیغمبروں کی دعوت کی اساس خدا پرستی کا عقیدہ ہے جو ایک انقلابی، خواگاہانہ اور فکری عقیدہ ہے۔

علاوہ ازیں قبائلی زندگی، خصوصاً صحرا کی بدوی زندگی سخت کٹھن اور دشوار ہوتی ہے قبیلوں کی باہمی رقابت اور محاسمت اس زندگی کی ایک لازمی

۱۔ مصنف نے تاریخی حوالوں کے انتخاب میں اہل تسنن کے منابع کو ترجیح دی ہے۔  
 مترجم یا ناشر کا مصنف سے ہر معاملہ میں متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔  
 ۲۔ کلام پاک میں خصوصاً سورہ اسراء کی ۵۴ ویں آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے

حقیقت ہے اس طرح کی زندگی دفاع اور حملہ اور معاہدہ اور پیمانہ کے اصولوں پر منحصر ہوتی ہے اس زندگی میں بیٹے کی اہمیت بڑی اہم ہے اور بیٹا اپنے خاندان کے لیے طاقت اور عزت کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ بیٹے کی یہ اہمیت نانہ اور احتیاج کے اصول پر منحصر ہوتی ہے مگر معاشرتی تبدیلیوں کے نتیجہ میں جب افادیت (سود) ہی قدر بن جاتی ہے تو پھر بیٹا بجائے خود عزت و وقار، عظمت اور دیگر اخلاقی اور معنوی خوبیوں کا مظہر اور اجتماعی زندگی میں عظمت اور طاقت کا نشان بن جاتا ہے اور اس پس منظر میں لڑکی ہونا حقارت کی بات سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کے فطری ضعف کو اس کی ذلت کا سبب بنا دیا جاتا ہے اور اس ذلت کے نتیجہ میں اس کی حیثیت غلام اور کنیز کی سی ہو جاتی ہے اس غلامی کی وجہ سے اس کی انسانیت مجروح ہوتی ہے اس کے اندر جو انسانی جوہر ہے وہ ماند پڑ جاتا ہے اور بالآخر وہ ایک ایسی مخلوق بن جاتی ہے جو مرد کی ملکیت ہے۔ ننگ پد ہے۔ مردوں کی ہوس کا کھلونا ہے اسی لیے اس کا وجود جاہلیت عرب میں مردوں کی غیرت کا سوال بن گیا تھا کہ ان کے نزدیک خاندان کی عزت اور وقار کی خاطر لڑکیوں کو کم سنی ہی میں زندہ دفن کر دینا ایک سخت روایت تھی مشہور شاعر فردوسی نے شاہنامہ میں ایک شعر لکھا ہے

زن و آژدہا ہر دو در خاک بہ جہاں پاک ازیں ہر دو ناپاک بہ

اس شعر میں عورت اور آژدہ ہے کو ایک ہی سطح پر دیکھا گیا ہے مگر یہ انداز نظر فردوسی تک محدود نہیں ہے بلکہ فردوسی کی فکر کا مآخذ تو عرب کے شاعر کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ مرد و باپ جن کے کوئی بیٹی ہے جب کبھی اپنے داماد کے متعلق سوچتا ہے تو اس کے سامنے تین باتیں آتی ہیں اس کے نزدیک ایک داماد تو گھر ہے جہاں اس کی بیٹی سر چھپائے رکھتی ہے دوسرا داماد اس کی بیٹی کا شوہر ہے جو اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کا فریضہ انجام دیتا ہے اور داماد کی تیسری شکی قبر ہے جو اسے پوری

طرح چھپا لیتی ہے اور تینوں میں سب سے زیادہ بہتر یہی قبر ہے۔

یہ مقولہ کہ قبر ہی سب سے بہتر داماد ہے تمام مردان جاہلیت پسند کے نزدیک ایک سنہرا اصول ہے۔ ہر باپ اور ہر بھائی اپنے خاندان کی جمہوری حمیت اور عزت کی خاطر اور اپنے ننگ و نام کے تحفظ کے لیے لڑکی کی موت کی آرزو یا انتظار میں رہتے ہیں تاکہ اس سے قبل کہ ان کی بیٹی یا بہن کے لیے کوئی اور خواہگار کرے وہ خود اس کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار دیں اس لیے کہ ان کے نزدیک عورت کا بہترین برہمی قبر ہے وہ قبر کو اپنا بہترین داماد سمجھتے ہیں اسی لیے شاعر اپنی بیٹی کے لیے بہترین رشتہ قبر کو سمجھتا ہے اور یہی وہ رویہ ہے کہ جس کے تحت فارسی شاعر ثن واثدھا مرد و در خاک بہ کہتا ہے اور یہی وہ انداز نظر ہے جس کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ دفن البنات من المکرمات یعنی لڑکیوں کو قبر میں دفن کرنا خاندانی عزت کے تحفظ کا ذریعہ ہے۔

جاہلیت عرب کا عورتوں کے متعلق یہی وحشی رویہ تھا جس کا کلام پاک میں سرزنش آمیز اور موثر لہجہ میں ذکر کیا گیا ہے کلام پاک میں اس کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خبر سنائی جاتی ہے تو غم و غصے کی زیادتی سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

ایک اہم نقطہ جس کی طرف ڈاکٹر عائشہ عبد الرحمن "بنت الشاطی" نے قرآن کے حوالہ سے توجہ دلائی ہے یہ ہے کہ لڑکیوں کی طرف نفرت اور نا پسندیدگی کے رویہ کی جڑ اصل میں اقتصادی مسئلہ ہے۔ عرب جاہلیت کا معاشرہ فقر و ناداری کے خوف سے لڑکیوں کو نا پسند کرتا تھا اور انہیں ایک بوجھ سمجھتا تھا اور یہی وہ بنیادی اقتصادی مسئلہ تھا جس نے وقت اور ماحول کے اعتبار سے بہت سی تعمیرات اختیار کر لیں۔ آج بہت سے ماہرین عمرانیات اور سماجیات اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کے مسئلہ کا بہت سے عقائد، عادات اور احساسات جن کا تعلق اخلاق اور روحانیت سے ہے۔ اقدار معنوی کی بجائیں اور یہ انداز نظر

کہ بیٹا فضیلت و شرافت و افتخار کی علامت ہے جبکہ بیٹی ذلت اور خواری کی علامت ہے اس کے ساتھ ہی مستقبل کے اندیشوں اور خوف کے تحت لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی مذموم رسم اور اس رسم کی یہ توجیہ کہ لڑکی بڑے ہو کر خاندان کی ذلت اور رسوائی کا سبب بن سکتی ہے ممکن ہے کہ وہ کسی جنگ کے نتیجہ میں قید ہو کر غیر لوگوں کی کینز بنائی جائے یا وہ کسی نامزدوں مرد کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائے یہ اور اسی قسم کی دیگر تمام باتیں، بخشیں اور نظریات ثانوی اور ظاہری باتیں ہیں۔ عورت کی طرف حقارت اور ذلت کے رویہ کا اصل سبب اقتصادی مسئلہ ہے جیسا کہ ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں کہ قبائلی نظام زندگی سخت حوادث اور مقابلہ سے عبارت ہوتا ہے اور لوگوں کو اپنی روٹی حاصل کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ ہی مختلف قبیلوں کے درمیان باہمی رقابت اور مقابلہ کا ایک مسلسل سلسلہ جاری رہتا ہے۔ خصوصاً عرب کی قبائلی معاشرت پر یہ باتیں بہت زیادہ صادق آتی ہیں اس معاشرتی پس منظر میں بیٹا سماجی اقتصادی اور دفاعی ہر اعتبار سے خاندان یا قبیلہ کی ناگزیر ضرورت ٹھہرتا ہے بیٹا روٹی فراہم کرتا ہے جبکہ بیٹی گھر میں بیٹھ کر روٹی کھاتی ہے اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان جنس کا اختلاف طبقاتی اختلاف میں بدلتا ہے۔ مرد مالک اور حاکم طبقہ بنالیتے ہیں اور عورت محکوم اور مملوک طبقہ ہو جاتی ہے عورت اور مرد ایک دوسرے کے بیٹھے نہیں رہتے بلکہ انہیں آقا اور غلام کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اس اقتصادی تقسیم کے لحاظ سے انسانوں کی ان دونوں انواع میں اختلاف محض جنس کا اختلاف نہیں رہتا بلکہ یہ دو الگ الگ طبقہ بن جاتے ہیں۔ مرد چونکہ اقتصادی لحاظ سے طاقتور اور حاکم ہوتا ہے اس اعتبار سے تمام خوبیاں، اچھائیاں اور بزرگیاں اس کے حصہ میں آتی ہیں جبکہ عورت حقارت، صغیر پستی اور ذلت کی نشانی بن جاتی ہے۔ مرد اور عورت کے مختلف طبقات کے لیے اجتماعی اقدار بھی الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ مرد اقتصادی برتری کی وجہ

سے قبیلت اور عورت اقتصادی پستی کے سبب سے ذلت کی مستحق سمجھی جاتی ہے  
 یہی وجہ ہے کہ دفتر کی ولادت یا کسی کا صاحب دفتر ہونے کے عزتی اور شرم کی بات سمجھا  
 جاتا تھا اور لڑکی کو خاندان کی بے عزتی اور بے آبروی کا سبب گردانا جاتا تھا اس  
 لیے کہ لڑکی کے باپ کو ہمیشہ پر اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں وہ کسی ایسے شخص سے شادی نہ  
 کر لے جو نسلی یا اقتصادی اعتبار سے اس کا ہم شان یا ہم کفو نہ ہو۔ میں سمجھتا  
 ہوں کہ یہ خوف و اندیشہ جو بظاہر ایک اخلاقی مسئلہ نظر آتا ہے درحقیقت اقتصادی  
 مسئلہ سے پیدا ہوتا ہے۔ قبائلی نظام میں حفظ ملکیت اور دولت کی مرکزیت کا تقاضا  
 ایک زبردست اقتصادی تدبیر کی حیثیت رکھتا ہے اسی اقتصادی قدر کے تہیہ میں  
 پدرسالاری نظام میں باپ کی تمام میراث سب سے بڑے بیٹے کو ملتی ہے تاکہ خاندانی  
 دولت اکٹھی رہے اس وراثت میں ہر چیز یہاں تک کہ وہ خواتین جو باپ کے تصرف میں  
 تھیں شامل ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ بیٹیوں کو میراث سے محروم کر دیا جائے تاکہ باپ  
 کی دولت اس کی موت کے بعد تقسیم نہ ہو سکے اس کے سبب سے ایک خاندان کی عورتیں  
 دوسرے خاندان میں بیاہی نہیں جاتیں یہ رسم آج بھی جاری ہے قدامت پسند  
 خاندانوں میں اب تک اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ لڑکیوں کے رشتہ اپنے  
 خاندان سے باہر نہ کئے جائیں ہمارے لوگ اب بھی یہ کہتے ہیں کہ عم زادوں کا عقد  
 آسان پر ہو جاتا ہے اس لیے زمین پر بھی لڑکیوں کے رشتہ انکے چچا کے بیٹوں  
 کے ساتھ ہی ہونا ضروری ہیں تاکہ لڑکیاں اپنی میراث خاندان سے باہر نہ لے جاسکیں  
 اور خاندان کی دولت خاندان ہی میں رہے۔

تاریخ مذاہب کے مورخان قدیم اور جدید محققین لڑکیوں کے زندہ درگور  
 کرنے کے بارے میں مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں جیسے کہ ننگ و نام کا خوف  
 یا اس بات کا اندیشہ کہ لڑکی کسی نامناسب اور ناموزون شخص سے رشتہ ازدواج  
 میں منسلک نہ ہو جائے بعض مستشرقین نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ عربوں  
 میں دفتر کشی کی رسم قدیم مذاہب میں دیوی یا دیوتا کے حضور لڑکیوں کی قربانی

کے عقیدہ کا تسلسل ہے لیکن قرآن نے نہایت صاف اور صریح لہجہ میں اس بات کی وضاحت یہ کہہ کر دی ہے کہ یہ ننگدستی کے خوف سے اپنی لڑکیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ یعنی اصل سبب اقتصادی ہے نہ کہ اعتقادی اور اخلاقی بقیہ جتنی باتیں اس بارے میں کہہ دی جاتی ہیں ان کی حیثیت زبانی جمع خرچ کی سی ہے ان باتوں میں کوئی حبان نہیں ہے۔

پہری نظر میں قرآن نے اقتصادی عامل کی نشاندہی کر کے نہ صرف اس مسئلہ کے اصل سبب اور محرک کو واضح کر دیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی تحقیر اور سزائش اور رسوائی کا سامان بھی فراہم کر دیا ہے جو اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کے مذموم فعل کی توجیہ کے لیے اخلاقی توجیہات پیش کرتے ہیں اور اسے اپنے تنگ و ناموس کے مسئلہ کا روپ دیتے ہیں حالانکہ ان کے اس ظالمانہ اور غیر انسانی عمل کا واحد سبب ان کا عزت اور ننگدستی کا خوف اور مال و دولت کی لالچ اور عبرت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ قرآن کی آیات ان تمام فریب کے پردوں کو ہٹا کر کے جنہیں شرافت، حمیت، عزت اور ناموس کا نام دیا گیا ہے ایسے تمام بہت فطرت اور کینہ انسانوں کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس ضمن میں دو آیتوں میں صریح تینہ موجود ہے

”اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کیا کرو۔ ہم تمہیں بھی

رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی رزق عطا کرتے ہیں۔“

”اور اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی انہیں

رزق عطا کرتے ہیں اور تم کو بھی رزق دیتے ہیں۔ بے شک ان کو

قتل کرنا بہت بڑے گناہ کی بات ہے۔“



اس بارے میں میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن بار بار اور بہ اصرار و تاکید اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ ہم تمہیں بھی اور تمہارے بچوں کو بھی روزی فراہم کرتے ہیں۔ پس انہیں احتیاج اور تنگدستی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ قرآن کا یہ اعلان اولاً اس حادثہ ناپسندیدہ کے اصلی سبب کی نشاندہی کرتا ہے اور ثانیاً ان تمام توجیہات کی نفی کرتا ہے جن کے ذریعے اس مذموم عمل کی اخلاقی توجیہ کر کے اسے جاہلیت عرب کی غیرت اور حمیت کے نتیجہ کے بطور پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن اس جھوٹ کا اور فریب کا پردہ چاک کر کے یہ مباف اور صریح اعلان کرتا ہے کہ اس قہینہ کا سو فیصد سبب اقتصادی ہے اور یہ مال و دولت کی حرص اور تنگدستی کے خوف کا نتیجہ ہے اس قرآنی تصریح سے قبل عام طور پر لوگ اس واقعیت کے اصل سبب سے ناواقف تھے۔ محروم اور کمزور طبقہ کے علاوہ ہر جگہ اسے عمومی اور عوامی وجدان و احساس کا ردِ عمل اور حمیت و شرافت خاندان کے تحفظ کی علامت اور ایک ہمت اور مردانگی کا کام سمجھا جاتا تھا کیونکہ عرب کے قبائلی نظام میں عام طور پر تمام انسانی نصیلت اور شرف بیٹے کے ساتھ مخصوص کر دیئے گئے تھے اور پیشوں کو تمام انسانی اقدار سے تہی اور محروم سمجھا جاتا تھا۔

بیٹا نہ صرف یہ کہ کسبِ دولت کے عمل میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اپنے خاندان کا محافظ اور قبیلوں کا باہمی جگم میں اپنے خاندان اور قبیلہ کے لیے باعثِ طاقت و افتخار ہے بلکہ تمام خاندانی، آبائی اور نسلی افتخارات اور امتیازات کا وارث بھی وہی ہے اس کے ذریعہ خاندان کی اجتماعیت قائم رہتی ہے وہی خاندان کے اجتماعی وجود کو تسلسلِ نسل بناتا ہے اور اسی کے ذریعے خاندان کی عزت اور وقار برقرار رہتا ہے۔ یہ بیٹا ہی ہے جو خاندان کے نام کو اوچھا کرتا ہے اور اپنے باپ کے انتقال کے بعد اپنے خاندان کے چراغ کو روشن رکھتا ہے۔

اور بیٹی۔ وہ بیچاری ایک ذیلی اور طفیلی وجود ہے اس کی حیثیت اثاثہ خاندان کی سی ہے شادی کے بعد یہ اثاثہ شوہر کے گھر میں منتقل کر دیا جاتا ہے وہاں اس کا وجود ہی تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس کا وجود اس طرح کم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا نام تک برقرار نہیں رکھ سکتی اس کا خاندانی نام تبدیل ہو جاتا ہے جہاں تک اس کی اولاد کا تعلق ہے تو ان کا نام ان کی شناخت اور ان کے تمام روابط اپنے باپ کے خاندان سے متعلق ہوتے ہیں بیچاری ماں کا ان سے کوئی تعلق پہچانا نہیں جاتا۔ اس صورت حال میں تمام مادی طاقت، دولت، اور اجتماعی نفیست کا حقدار صرف بیٹا ہوتا ہے۔ جو پدری نظام میں اپنے باپ کا دست و بازو بن کر اپنے خاندان کی دولت، عزت، طاقت، کو بڑھانے اور اجتماعی زندگی میں اپنے خاندان کا نام اونچا کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے اور اپنے باپ کے بعد اپنے خاندان کی آہنگ اور محنوی زندگی کے بقا اور تسلسل کی علامت سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس لڑکی بچہ، پورچ، بے وقعت، بے قیمت بلکہ خاندان پر بوجھ کی حیثیت رکھتی ہے وہ ایک ضعیف اور کمزور وجود ہے جو خاندان کی حفاظت اور حمایت کی محتاج ہے وہ مردوں کی ہم جونی اور جنگی حوصلوں کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے جس طرح کسی پرندے کے پاؤں میں سمھاری پتھر باندھ کر اسی کی پر واز میں رکاوٹ پیدا کر دی جائے اسی طرح عورتیں ہنگام جنگ مردوں کے حوصلہ، جنگ اور ان کی پیش قدمی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں جب بھی کوئی شخص دشمنوں کی صفوں، اس کے حیموں، اس کے قلعوں پر بڑھ بڑھ کر حملہ کرنا چاہتا ہے اس کے جوش شجاعت میں یہ خیال مانع آ جاتا ہے کہ کہیں اس کے خاندان یا قبیلہ کی عورتیں دشمن کے ہاتھوں گرفتار نہ ہو کر پورے قبیلہ کے لیے ذلت و رسوائی کا سبب نہ بن جائیں اسے ہمیشہ یہ خیال ستاتا ہے کہ ہنگام جنگ اس کی ذرا سی غفلت اور چوک کے نتیجہ میں اس کے قبیلہ کی عورتیں کہیں دشمن کے ہاتھوں گرفتار نہ ہو جائیں کیونکہ اگر ایسا ہوا تو اس کا قبیلہ ہمیشہ کے لیے طنز و طعنت کا نشان بن جائے گا۔ اس خوف اور اندیشے سے اس کی ہمت

اور حیات اور اس کا جوش جنگ متاثر ہو جاتا ہے اسی طرح زمانہ صلح میں خاندان کے غیر مذمروں کا دل اس خوف سے لرزتا رہتا ہے کہ کہیں خاندان کی کسی عورت کا طرز عمل انکے لیے نجات اور بے عزتی کا سبب نہ بنے اس تمام مشقت، رنج، تکلیف اور زحمت کے بعد جس لڑکی کی پرورش کی جاتی ہے وہ آخر کار دوسروں کے حوالے کر دی جاتی ہے (ازدواج کی صورت میں) وہ ایک ایسا درخت ہے جس کے میوے دوسروں کے کام آتے ہیں۔

اس پس منظر میں فطری طور پر بہترین حل یہی ہے کہ جیسے ہی کسی ماں کی آغوش بیٹی سے آباد ہو۔ بیٹی کو ماں کے گود سے چھین کر ہنوش مرگ کے حوالے کر دیا جائے اس کو بچپن ہی میں بیاہ دیا جائے اس کے لیے شروع ہی میں داماد تلاش کر لیا جائے اور یہ داماد، بہترین داماد، قبر کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

عرب میں ایسے شخص کو جو اولادِ زینہ سے محروم ہوا، تر کہا جاتا ہے (ابو یعلیٰ دم بریدہ جس کی نسل منقطع ہو گئی ہو جو عقیقہ ہو یا بچہ ہو اس کے برعکس لفظ کو شر کے معنی ہیں خیر و برکت کی کثرت، فراوانی اور تسلسل اس کے معنوں میں اولاد اور حریت کی کثرت کا رخ بھی ہے لوگ کہہ رہے تھے کہ رسول (معاذ اللہ) اہل بیت کے جواب میں اللہ نے اپنے محبوب پیغمبر کو کوثر یعنی حریت اور اولاد کی کثرت کی بشارت دی ہے۔

ایسے ماحول اور ایسے زمانہ میں دستِ تقدیر پس پردہ غیب کا رفرما ہو کر تمام اقدار میں انقلاب برپا کرنے والا تھا۔ ہر چیز بدلنے والی تھی۔ تقدیر کا ناپید ہونا ہر شے کو درہم برہم کر رہا تھا تا کہ اقدار حیات کی اس جھیل میں جس کا پانی سکتا اور بدبودار ہو چکا تھا ایک انقلابی طوفان برپا کر دیا جائے ایک مثبت زندگی بخش اور انسانیت نما طوفان، ناگہاں اس ساکت اور مستحق حسیل سے ایک شفاف اور متحرک چشمہ اہل پڑتے ہے۔ زندگی اور اس کی قدروں میں ایک انقلابی تبدیلی رونما

ہوتی ہے یہ انقلاب نہایت خوش گوار ہے مگر اس کے ساتھ ہی نہایت دشوار بھی ہے اور اس خوش گوار مگر دشوار انقلاب کے لیے قدرت نے عظیم شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک باپ اور ایک بیٹی۔

اس انقلابِ عظیم کا بار سنگین باپ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شانوں پر ہے۔ لیکن انقلابی اقتدار کی نمود و افرازش کی ذمہ داری بیٹی یعنی حضرت فاطمہؑ پر ہے۔

## نمود انقلاب

قریش عرب کا سب سے بڑا قبیلہ ہے اسے دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے بزرگی حاصل ہے۔ دراصل قبیلہ قریش اپنی قومی شرافت اور بزرگی کی نشانی ہے اس قبیلہ نے اپنے تمام افتخارات کو دو خاندانوں یعنی بنی ہاشم اور بنی امیہ میں تقسیم کر دیا ہے۔ بنی امیہ دولت کے اعتبار سے آگے ہیں مگر بنی ہاشم کی وجاہت اور وقار بنی امیہ سے زیادہ ہے اس لیے کہ کعبہ کے امور کی نگہبانی ان کے پاس ہے اور عبدالمطلب جو شیخ قریش ہیں ان کا تعلق بنی ہاشم سے ہے مگر عبدالمطلب کی وفات سے بنی ہاشم کی کیفیت پہلے جیسی نہ رہی۔ ابو طالب کو اپنے والد جیسا اثر و نفوذ اور طاقت حاصل نہیں ہے ان کی تجارت بھی کمزور ہو گئی ہے اور انہوں نے مالی مشکلات کے پیش نظر اپنے فرزندوں کو اپنے اعزاء کی کفالت میں دیدیا بنی امیہ اور بنی ہاشم کی باہمی رقابت میں شدت آگئی ہے اور بنی امیہ کی کوشش ہے کہ وہ قبیلہ قریش کے مناصب اور امتیازات پر قابض ہو جائیں اور بنی ہاشم کو جو روحانی اور معنوی برتری حاصل ہے وہ بھی ان سے چھین لیں بنی ہاشم میں اگر کسی گھسر کو وقار اور اعتبار حاصل ہے تو وہ خاندانہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے آپ حضرت عبدالمطلب کے پوتے ہیں جناب خدیجہؑ سے جو عرب کی صاحبِ دولت و حیثیت خاتون ہیں۔ عقد کے نتیجہ میں آپ کی سماجی حیثیت بہت نمایاں ہو گئی ہے

خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت بڑی مضبوط اور مستحکم ہے لوگوں میں آپ کی ایمانداری اور دیانت کا شہرہ ہے۔ خاص طور پر بنی ہاشم اور رجال قریش میں آپ کی شخصیت بڑی معزز اور محترم سمجھی جاتی ہے آپ کو بعد مناف کے عز و شرف کا آئینہ، بنی ہاشم کی عظمت کی علامت اور بالخصوص عبدالمطلب کی حیثیت کے اجراء کنندہ کے بطور دیکھا جاتا ہے اس لیے کہ حمزہ ایک ایسے جوان ہیں جن کی حیثیت ایک پہلوان کی ہے، ابولہب مرد بے اعتبار ہے عباس صاحب دولت ہیں مگر ان کی شخصیت مستحکم نہیں ہے ابوطالب کی شخصیت مضبوط ہے مگر ان کی مافی الحال کمزور ہے یہ صرف محمد ہیں کہ جو عہد شباب کی منزلوں میں ہیں۔ جن کی اپنی ایک بھرپور اور محترم شخصیت ہے اور ان کی رفیق حیات بھی ایک شخصیت اور حیثیت کی مالک ہے اور وہ صاحب ثروت بھی ہے شجرہ بن ہاشم کی عظمت اور اس کی بزرگی اب اسی گھرانہ پر منحصر ہے۔ یہی گھر ہے جس کی وجہ سے مکہ میں مبنی ہاشم کی ساکھ قائم ہے۔

سب اس انتظار میں ہیں کہ یہ گھر اولادِ زینہ کی خوشبو سے بھکے تاکہ خاندان عبدالمطلب اور خاندانہ محمد کی طاقت اور اعتبار کا سبب بنے مگر اس گھر میں جو اولاد ہوئی ہے اس کی صورت یہ ہے۔

سب سے پہلی ایک لڑکی پیدا ہوئی — زینب۔

حالانکہ تمام خاندان کو بیٹے کی آرزو اور انتظار تھا

دوسری اولاد بھی لڑکی ہی ہے — رقیہ

لڑکے کی آرزو شدید ہو گئی اور سب لوگ اس امید میں رہے کہ اب کی

بار لڑکا ہو گا۔

تیسری بار پھر لڑکی پیدا ہوئی — ام کلثوم

اس کے بعد دوسرے پیدا ہوئے۔ قاسم اور عبد اللہ ان کی ولادت سے

خاندان میں خوشی کی زبردست لہر دوڑ گئی۔ مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی دونوں

رد کے سنی میں انتقال کر گئے اور اب اس گھر میں تین بچے ہیں اور تینوں لڑکیاں ہیں۔

ماں ضعیف ہو چکی ہے اس کا سن ساٹھ سال سے تجاوز کر گیا ہے اور باپ اگرچہ کہ بیٹیوں کو بہت عزیز رکھتا ہے مگر اپنی قوم کے جذبات اور اپنے اہل خاندان کے احساسات میں شریک ہے۔

کیا خد بچہ جو اپنی عمر کی آخری منزلوں سے نزدیک ہیں کسی اور بچے کی ماں بن سکیں گی۔ اسکا نات بہت کم ہیں مگر اس گھر میں ایک بار پھر امیدوار آرزو کی لہر بھا ہی پیدا کر دیتی ہے۔ لوگوں کا اضطراب اپنے نکتہ عروج پر ہے یہ خاندان عبد المطلب کے لیے آخری موقع ہے۔ یہ آخری امید ہے۔

مگر اس بار پھر بیٹی پیدا ہوتی ہے  
اس کا نام فاطمہ رکھا گیا ہے۔

خوشی اور امید خاندان بنی ہاشم سے بنی امیہ میں منتقل ہو گئی۔ دشمن بہت خوش ہے لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں ہر طرف یہی چرچا ہے کہ ”محمد ابتر ہیں“ وہ اپنے خاندان کی آخری شخصیت ہیں، ان کا گھرانہ صرف چار بیٹیوں پر مشتمل ہے اور بس (کوئی اولاد زینہ نہیں ہے)

کیا کہا جائے کہ تقدیر نے یہ کیسے خوب صورت کھیل کا آغاز کیا ہے زندگی گذر رہی ہے اور محمد خود اپنی رسالت کے برپا کردہ انقلاب کے طوفان میں ہمتن گھرے ہوئے ہیں ان پر رسالت کی عظیم ذمہ داریاں ہیں۔ پھر وہ فاتح مکہ کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں اور اپنی رحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تمام دشمنوں کو طلقاً رقرار دیتے ہیں (طلقاً یعنی آزاد کردہ) تمام قبائل ان کے زیر فرمان ہیں تمام جزیرہ عرب اکے زیر نگیں ان کی شمشیر نے آسمان اور جاہر حکمرانوں کو لہو لہان کر دیا ہے ان کی آواز زمین سے آسمان تک گونج رہی ہے۔ ان کے ایک ہاتھ میں طاقت ہے اور دوسرے ہاتھ میں نبوت اور وہ عزت و افتخار کی

اس بلندی پر ہیں کہ جو بنی امیہ یا بنی ہاشم یا عرب یا عجم کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ محمد پیغمبر ہیں۔ مدینہ میں ان کا مرکز ہے اور وہ شکوہ و افتداری و عظمت کے اس نکتہ کمال پر ہیں جس کا تصور بھی محال ہے کوئی دوسرا انسان اس عظمت اور بزرگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ وہ شجر مبارک ہے جس کا تعلق بعد مناف، بنی ہاشم یا عبدالمطلب سے نہیں ہے بلکہ یہ شجر نور ہے۔ یہ وہ درخت ہے جو نور سے اگا ہے۔ اس کی نمود غار حرا میں ہوئی ہے۔ اس کا نور صرا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بلکہ افق سے افق تک تمام روئے زمین پر چھایا ہوا ہے بلکہ یہ نور وقت کی تمام طوالت پر محیط ہے یہ تمام آنے والے زمانوں کو انتہائے تاریخ تک وقت کے تمام ادوار کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔

مگر اس عظیم انسان کا خاندان صرف ہر بیٹیوں پر مشتمل ہے

اور ان میں سے بھی تین بیٹیاں خود اس کی رحلت سے قبل انتقال کر گئیں اب اس کی کل بقاعت صرف ایک بیٹی ہے سب سے چھوٹی بیٹی۔ فاطمہ

## فاطمہ

فاطمہ تنہا وارث ہیں اپنے خاندان کے تمام اختارات کی۔ اس تمام بزرگی اور عزت و شرف کی جس کی بنیاد خاک و خون یا دولت نہیں ہے بلکہ جو افریدہ وحی ہے یہ وہ وراثت ہے جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے اس کا تعلق رنگ و نسل یا مال و دولت سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اس انقلابی پیغام سے ہے جو ایمان و جہاد اور تبدیلی فکر و نظر کا پیغام ہے اس پیغام نے زندگی کی قدریں بدل دی ہیں مادیت کی پستی کو روحانیت کی بلندی سے تبدیل کر دیا ہے اب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت صرف بنی عبدالمطلب یا عبدمناف تک محدود نہیں ہے اب ان کا تعلق محض قریش یا عرب سے نہیں ہے بلکہ اب وہ ان سطحوں سے بہت بلند ہو چکے ہیں۔ وہ تاریخ انسانیت میں ایک علامت ہیں وہ تمام انسانیت اور انسانیت

کی بلند اقدار کے وارث ہیں وہ وارثِ ابراہیم ہیں۔ وارثِ نوح و ابراہیم و عیسیٰ ہیں اور اس عظیم وراثت کی تنہا وارث ان کی بیٹی فاطمہ ہے۔

۱۱۱ اعطینا لک کوثر.....

لے لے ہمارے حبیب ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے۔ پس اپنے پروردگار کی نماز ادا کرو اور قربانی دے۔ بے شک تیرا دشمن ابتر ہے۔  
ہاں دشمنِ رسول ابتر ہے اپنے دس بیٹوں کے باوجود ابتر اور دم بریدہ ہے اس کی نسل منقطع کر دی گئی ہے اللہ نے اپنے حبیب کو کوثر عطا کیا ہے اسے فاطمہ جیسی بیٹی سے نوازا ہے اس طرح دنیا میں ایک عظیم فکری اور روحانی انقلاب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

اب اپنے باپ کی عظیم انقلابی وراثت کی تنہا وارث ایک بیٹی ہے۔ یہ بیٹی اپنے خاندان کے تمام عز و شرف کی وارث ہے اسی کے ذریعے اس عظیم خاندان کا تسلسل جاری ہے جس کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوتا ہے اور جو انسانی حریت، عظمت اور آزادی کے تمام عظیم دہروں کے سلسلہ سے گذرتا ہوا حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہے اور پھر حضرت ابراہیمؑ کی عظیم شخصیت کے بعد حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو خود میں شریک کرتے ہوئے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک آتا ہے۔ یہ انسانیت کا خاندان ہے۔ یہ انسانی عز و شرف، حرمت اور عظمت کا خاندان ہے یہ عدلِ الہی کی زنجیر ہے۔ یہ سچائی اور حقیقت کا شجر ہے اور اس زنجیر کی آخری گڑی فاطمہ ہیں۔

فاطمہ جو اس خاندان کی سب سے آخری اولاد (بیٹی) ہیں جو خاندانِ بیٹے کا منتظر تھا۔

محمدؐ خوب جانتے ہیں کہ کاتبِ تقدیرِ ننان کے لیے کیا مقدر کیا ہے اور فاطمہ بھی اپنی عظمت اور اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر ہیں ہاں اس مکتب فکر میں اسی طرح کا فکری انقلاب رونما ہوتا ہے



اسی مذہب میں عورت کو اسی طرح آزادی اور حرمت عطا کی جاتی ہے  
کیا یہ مذہب، مذہبِ ابراہیمؑ نہیں ہے اور کیا یہ دونوں باپ اور بیٹی  
دارِ ثناء ابراہیمؑ نہیں ہیں۔

کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مسجد کے اندر دفن ہو سکے اور زمین  
کی تمام مساجد میں سب سے افضل مسجد الحرام ہے۔ خانہ کعبہ جو خدا کا گھر ہے جو  
خدا کا حرم بھی ہے اور حرم بھی جس کی طرف رخ کر کے سجدے کئے جاتے ہیں یہ تمام  
نمازیوں کا قبلہ ہے یہ وہ گھر ہے جسے خدا کے حکم پر بنایا گیا اور جس کے بنانے والے  
حضرت ابراہیمؑ جیسے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ یہ وہ گھر ہے کہ جسے بتوں سے پاک کرنے اور  
مشرکوں کے تسلط سے آزاد کرنے کی عظیم ذمہ داری پیغمبر اسلامؐ کے سپرد ہوئی اور  
فتحِ مکہ ان جنابؐ کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے اس فتح کے نتیجہ میں کعبہ یعنی  
خانہ آزاد صحیح معنوں میں طواف اور سجدہ کے لیے آزاد ہو سکا تاریخ میں جو بزرگ  
پیغمبر گزشتے ہیں سبھی اس گھر کے خدمت گزار رہے اس کے باوجود کسی پیغمبر کو یہ  
حق نہیں دیا گیا کہ وہ خانہ کعبہ میں دفن ہو سکے ابراہیمؑ اس گھر کے بانی ہیں لیکن  
ان کا مدفن یہاں نہیں ہے اور پیغمبر اسلامؐ اس گھر کے آزاد کنندہ ہیں اس کو  
بتوں کے تسلط سے آزاد کرنے والے ہیں لیکن ان کا مدفن بھی یہاں نہیں ہے  
تمام انسانی تاریخ میں یہ شرف صرف ایک ہستی کو حاصل ہو سکا خدائے اسلام نے  
تمام نوعِ بشر میں صرف ایک ایسی ہستی کو چنا جو خاص اس کے گھر یعنی کعبہ میں دفن  
ہو سکے۔

اور یہ ہستی کس کی ہے؟ کون ہے؟

ایک عورت، ایک کینز یعنی خبابِ حاجرہؓ

خدائے ابراہیمؑ کو یہی حکم دیا کہ انسانوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ کعبہ  
حاجرہؓ کے گھر سے متعلق بنایا جائے تاکہ بشریت ہمیشہ خانہ کعبہ کے طواف کے ساتھ  
ساتھ بیت حاجرہ کے گرد بھی طواف کرے۔

خدائے ابراہیمؑ نے تمام انسانیت میں اپنے گناہ سپاہی کے طور پر ایک عورت کا انتخاب کیا۔ ایک عورت جو ایک کینر تھی یعنی جو دنیا کے مروجہ معیار کے مطابق ہر عزت اور شرف سے محروم تھی۔

ہاں بے شک اس مکتب فکر میں ایسا فکری انقلاب رونما ہوا اور اس مذہب میں عورت کو اس قدر آزادی اور عزت عطا کی گئی عورت کا مقام کس قدر بلند کیا گیا

اب خدائے ابراہیمؑ نے فاطمہؑ کا انتخاب کیا ہے۔

فاطمہؑ کے توسط سے وہ فکری انقلاب برپا ہوا کہ اب بیسے کی جگہ بیٹی اپنے خاندان کی عزت و بزرگی کی وارث قرار پائی اب اپنے خاندان کی تمام قدروں کا تحفظ کرنے والی اور اپنے آباؤ اجداد کے نام کو دوام بخشنے والی ہستی بیٹی ہے۔ یہ بیٹی ہی ہے جن کے ذریعہ شجرہ کے بڑھے گا نسل کو دوام حاصل ہوگا۔

فاطمہؑ پیغمبر کے کام اور ان کے نام کی وارث ہیں اپنے باپ کی نسلی اور فکری وراثت کا بار اٹھائے ہوئے ہیں۔

اور یہ اس معاملہ کی بات ہے جن میں لڑکی ہونا ایک جرم تھا اور اس جرم کی سزا یہ تھی کہ اسے زندہ درگور کر دیا جائے۔ یہ اس ماحول کی بات ہے جب باپ بیٹی کو باعثِ ننگ سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک بہترین داماد قبر ہوتی تھی۔ پیغمبرؐ اس بات سے آگاہ ہیں کہ قدرت نے ان کو کسی عظیم انقلاب کا مظہر بنایا ہے۔

اور فاطمہؑ بھی اس بات کا پورا شعور رکھتی ہیں کہ اس انقلاب میں ان کی حیثیت کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبرؐ کے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سے رویہ پر تاریخ حیران ہے۔ پیغمبرؐ اپنی اس دختر سے جس طرح پیش آتے تھے اس کی مدح و ستائش میں انہوں نے جو باتیں کہیں ہیں اور اس کے ساتھ عزت و احترام کا جو رویہ دکھاوہ

سب باتیں تعجب خیز ہیں۔

خانہ پیغمبرؐ اور خانہ فاطمہؑ ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ صرف فاطمہؑ اور ان کے شوہر علیؑ مسجد نبویؐ میں سکونت پذیر ہیں۔ بیت رسولؐ کے علاوہ صرف فاطمہؑ کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ان کا گھر مسجد نبویؐ میں ہے ان کے گھر اور رسولؐ کے گھر کے درمیان صرف دو میٹر کا فاصلہ ہے دونوں گھروں کی گھڑکیاں آمنے سامنے کھلتی ہیں۔ پیغمبرؐ ہر صبح اپنے گھر کی گھڑکی کھول کر اپنی دختر کو سلام کرتے ہیں۔

جب کبھی پیغمبرؐ سفر پر جاتے ہیں تو خانہ فاطمہؑ میں جا کر بیٹھی کو خدا حافظ کہتے ہیں فاطمہؑ وہ آخری ہستی ہے جن سے حضورؐ سفر پر جاتے وقت وداع ہوتے ہیں اور جب آپؐ سفر سے واپس تشریف لاتے ہیں تو سب سے پہلے جن ہستی سے ملاقات کرتے ہیں وہ ہستی بھی فاطمہؑ ہی ہیں آپؐ سب سے پہلے خانہ فاطمہؑ میں تشریف لے جاتے ہیں اور ان کی مزاج پرسکی کرتے ہیں۔

متعدد نامہ لکھی کتب میں یہ درج ہے کہ پیغمبرؐ اپنی بیٹی (فاطمہؑ) کے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا کرتے تھے۔

یہ حسن سلوک اور یہ رویت ایک شفیق اور مہربان باپ کی محبت اور نوازش سے کچھ زیادہ معنویت رکھتا ہے باپ اپنی بیٹی کے ہاتھوں کو چومے اور بیٹی بھی وہ جو سب سے چھوٹی بیٹی ہے یہ محبت کا برتاؤ عرب کے اس ماحول میں ایک ضرب انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے جہاں عورتوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا اسی طرح یہ حقیقت کہ اسلام کے پیغمبرؐ اپنی بیٹی فاطمہؑ کے دست مبارک کو بوسہ دیتے تھے، تمام بزرگوں، سیاستدانوں، تمام مسلمانوں اور بالخصوص پیغمبرؐ کے اصحاب اور ساتھیوں کی نگاہیں کھولنے کے لیے بہت کافی تھی تاکہ وہ فاطمہؑ کی جنت اور ان کی عظمت کو پیغمبرؐ کے اس رویہ کے حوالے سے پہچان سکیں اسی طرح اپنی بیٹی کا ساتھ حضورؐ یہ غیر معمولی رویہ تمام انسانوں کو اور ہر عہد کے انسانوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کس طرح

تاریخی عادات وادبام اور فرسودہ روایتوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے یہ انسانوں کو فرسودہ اور غلط عادات و روایت سے نجات دلا کر اس بات کا سبق دیتا ہے کہ مرد اس تخت جبروت و جباریت اور اس خشونت اور فرعونیت کی بلندی سے نیچے اتریں جو انہوں نے اپنے لیے اختیار کر رکھی ہے وہ عورتوں کے برابر کھڑے ہوں اور اسی طرح یہ عمل پیغمبر عورت کو اس بات کا سبق دیتا ہے کہ وہ اس حقارت کی پستی سے جو قدیم دور سے جدید عہد تک اس کا مقدر رہی ہے نجات حاصل کرے اور انسانی وقار و عظمت کی بلندی تک صعود کرے۔ بالفاظ دیگر یہ عمل مرد اور عورت کو انسانیت کے صحیح مرتبہ اور مقام سے متعارف کرنے کی علامت اور عورت کی عزت و حرمت کا اظہار ہے یہی سبب تھا کہ پیغمبر صرف محبت پدری کے اظہار کے لیے ہی نہیں بلکہ ایک وظیفہ کے طور پر ایک فرض اور ایک عظیم ذمہ داری کے پورا کرنے کے لیے اپنی دختر (فاطمہؑ) کے ساتھ عزت اور احترام کا رویہ رکھتے تھے اور یہی سبب تھا کہ حضورؐ اپنی بیٹی کی شان میں ہمیشہ رطب اللسان رہا کرتے تھے آپؐ نے فرمایا :

تمام دنیا کی عورتوں میں چار عورتیں سب سے زیادہ فضیلت رکھتی ہیں، مریمؑ، آسیہؑ، خدیجہؑ اور فاطمہؑ۔

اللہ فاطمہؑ کی خوشنودی سے خوش اور ان کی ناراضگی سے ناراض ہوتا ہے  
و فاطمہؑ کی خوشنودی میری خوشنودی ہے۔ فاطمہؑ کا غضب میرا غضب ہے۔ جو کچھ میری بیٹی فاطمہؑ کو دوست رکھتا ہے۔ وہ مجھے دوست رکھتا ہے اور جو کوئی فاطمہؑ کو خوش کرتا ہے وہ مجھے خوش کرتا ہے اور جو فاطمہؑ کو غضب ناک کرتا ہے وہ مجھے غضب ناک کرتا ہے۔

و فاطمہؑ میرا پارہٴ تن ہے جس نے اسے اذیت دی اسے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے خدا کو ناراض کیا۔

یہ سب تکرار آخر کس لیے؟ کس لیے پیغمبرؐ نے بہ اصرار اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کی مدح و ستائش میں اس قدر حدیثیں ارشاد فرمائیں۔ یہ تکرار، یہ اصرار

یہ اہتمام آخر کس لیے تھا۔ آخر کس لیے پیغمبر لوگوں کے سامنے ان کی مدح و ستائش فرماتے تھے آپ کیوں یہ چاہتے تھے کہ تمام مسلمانوں کو اپنی بیٹی سے اپنی غیر معرولی محبت اور تعلق سے آگاہ کریں۔ اور پھر آخر حضور فاطمہ کی خوشنودی اور ان کی ناراضگی (خشم) کا ذکر کیوں کرتے تھے کیوں بار بار ان کے بارے میں اذیت دینے اور آزر دہ کرنے کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ خشم اور خوشنودی اور آزر دہی کے کلمات پر پیغمبر نے اتنا زور کیوں دیا ہے۔

ان سوالوں کا جواب اگرچہ بہت حساس اور جذباتی مسئلہ ہے لیکن نتائج میں یہ جواب صاف اور روشن ہے تاریخ نے ان تمام سوالوں کا جواب دیا ہے اور حضور کے بعد فاطمہ نے جو زندگی کے مختصر سے دن گزاریے ہیں ان دنوں کے واقعات پیغمبر کے تمام مستقبل کے اندیشوں کو آشکار کر دیتے ہیں۔

## اُمّ ابیہا

تاریخ صرف یہ کہ ہمیشہ بزرگوں کی بابت گفتگو کرتی ہے بلکہ تاریخ کا موضوع تو جہ بھی محض بزرگ ہستیاں ہی ہوتی ہیں بچوں اور کم سنوں کو تاریخ ہمیشہ فراموش کر دیتا ہے۔

فاطمہ اپنے گھر میں سب سے کم سن تھیں۔ ان کی طفلی کا زمانہ طوفان مشکلات و حوادث میں گذرا ان کی تاریخ ولادت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ طبری، ابن اسحق اور سیرت ابن ہشام میں آپ کا سن ولادت ۵۰ھ قبل بعثت بتایا گیا ہے اس کے برعکس مسعودی کی مروجہ الذہب میں آپ کی ولادت بعثت کے بعد پانچویں سال میں بتائی گئی ہے یعقوبی نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا ہے وہ سن ولادت کا تعین نہیں کرتا بلکہ آپ کی ولادت کو پس از نزول وحی قرار دیتا ہے اسی اختلاف روایات کے سبب اہل سنت نے آپ کی ولادت بعثت سے پانچ سال قبل اور شیعوں نے بعثت کے بعد پانچویں سال میں تسلیم کی ہے۔

لیکن ہم ان اختلافی مباحث سے قطع نظر کر کے ان کو محققین کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ محققین کا کام ہے کہ آپ کے سن ولادت کا صحیح تعین کریں ہمیں تو دراصل جناب فاطمہ کی شخصیت اور آپ کی حقیقت اور معنویت کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔ ہمارے موصوع گفتگو پر اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کی ولادت قبل بعثت ہوئی یا بعد بعثت۔

جوابات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ فاطمہ گھر میں بالکل تنہا تھیں۔ آپ کے دونوں بھائی بچے ہی میں انتقال کر گئے آپ کی سب سے بڑی بہن زینب جو بڑی بہن ہونے کے ناطے ماں کی جگہ تھیں ابی العاص کے گھر بیاہ کر چلی گئیں جناب فاطمہ نے ان کی حیرانی کی تلقین اور جدہ کو محسوس کیا۔ اس کے بعد رقیہ اور ام کلثوم کے عقد کی باری آئی اور وہ دونوں بھی اپنے اپنے شوہر کے گھر چلی گئیں اور فاطمہ تنہا رہ گئیں اور یہ صورت حال بھی اس روایت کو تسلیم کرنے سے مطابقت رکھتی ہے کہ جس میں آپ کی ولادت کو پانچ سال قبل بعثت قرار دیا گیا ہے ورنہ اگر آپ کی ولادت بعثت کے بعد پانچویں سال میں تسلیم کی جائے تو ایسی صورت میں آپ نے جب سے ہوش سنبھالا خود کو اپنے گھر میں تنہا پایا، بہر حال آپ کی زندگی کا دور آغاز اور آپ کے پدر بزرگوار کی عظیم رسالت کے کام کا آغاز ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے۔ یہ دور خاندان رسالت کے لیے بڑی شدید آزمائشوں، مصیبتوں اور سختیوں کا دور تھا۔ آپ کے پدر بزرگوار خلق خدا کو عفت سے بیمار کرنے کے عظیم کام کا آغاز کر چکے تھے اور اس کے نتیجے میں تمام انسانیت دشمن قوتوں کی دشمنی کا ہدف بن گئے تھے اور آپ کی مادر گرامی اپنے محبوب شوہر کی دلجوئی اور دلسوزی میں ہمد تن مصروف تھیں اس صورت حال میں فاطمہ کو جو زندگی کا پہلا تجربہ ہوا وہ رنج و اندوہ کا تجربہ تھا اور آپ نے بچپن ہی سے زندگی کو ایک شدید آزمائش کے طور پر محسوس کیا۔ چونکہ اس وقت آپ بہت ہی کم سن تھیں اس لیے گھر سے باہر نکلنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس آزادی سے آپ نے یہ فائدہ اٹھایا کہ آپ اپنے

والد کے ہمراہ ان کی تبلیغی مہم میں شریک رہیں جنابِ فاطمہؑ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ان کے پدر بزرگوار کو یہ فرصت نہیں ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی انگلی پکڑ کر اسے شہر کے کوچہ و بازار میں سیر کرا سکیں وہ اپنی رسالت کے عظیم اور پرخطر کام میں مصروف تھے وہ جانتے تھے کہ شہر میں ہر طرف دشمنی اور مخالفت کا طوفان موجیں مار رہا ہے اس لیے وہ اس طوفان سے نمٹنے کے لیے اکیلے ہی اپنی مہم پر روانہ ہو جاتے ہیں لیکن ان کی جیہتی بیٹی جو اپنے باپ کی عظمت اور حقیقت کا شعور رکھتی تھی ان کو ان خطرات میں تنہا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس بیٹی نے بار بار یہ منظر دیکھا کہ ان کے پدر بزرگوار لوگوں کے ہجوم میں تنہا کھڑے ہیں اور انہیں ایک شفیق باپ کی طرح نرمی اور محبت سے حق کی تعلیم دے رہے ہیں پیغمبرِ خود کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہے ہیں سنگین کے عزم اور حوصلہ میں کوئی فرق نہیں آتا جب کوئی ایک گروہ ان کی بات سننے سے انکسار کر دیتا ہے تو وہ لوگوں کے کسی دوسرے گروہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مگر یہاں بھی لوگ ان کا مذاق اڑانے اور ان کے ساتھ نامناسب زبان استعمال کرنے کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں دینے اسی طرح تمام وقت گذر جاتا ہے بالآخر حضورِ خستہ و درمائدہ اپنی بے ثمر مہم سے واپس لوٹتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے دوسرے بچوں کے باپ اپنے اپنے کام سے لوٹتے ہیں تاکہ گھر میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر اپنے کام کا آغاز کر سکیں۔

تاریخ ہمیں یہ واقعہ یاد دلاتی ہے کہ ایک دن پیغمبرِ مسجد الحرام میں تھے کہ لوگوں نے ان پر وشام طرانی کی اور انہیں زد و کوب کیا کم سن فاطمہؑ بے بسی اور غم کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھیں اس ناخوشگوار حادثہ کے بعد وہ اپنے باپ کو ملے کہ گھر لوٹیں پھر ایک روز یوں ہوا کہ پیغمبرِ مسجد الحرام میں نماز ادا کر رہے تھے جب آپؐ سجدہ کی حالت میں تھے تو دشمنوں نے پھر کی او جھڑی آپؐ کے سر مبارک پر رکھ دی فاطمہؑ نے یہ منظر دیکھا تو بیتاب ہو گئیں۔ آپؐ اپنے باپ کے نزدیک گئیں۔ اس غلاظت کو ان کے فرق مبارک

سے ہٹایا اور پھر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کے سر کو گندگی سے پاک کیا ان کے ساتھ طعلمانہ محبت اور ہمدردی کا اظہار کیا اور پھر آپ اپنے پدر بزرگوار کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چلیں۔

لوگ اس لاغر اندام اور کمزور و نحیف بچی کو ہمیشہ اپنے عظیم المرتبت باپ کی تنہائی کا رقیق اور مونس و غم خوار پاتے تھے وہ دیکھتے تھے کہ کس طرح یہ معصوم اور کم سن بچی اپنے باپ سے محبت کرتی ہے ان کو ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہے اور اپنے باپ کو مصیبت اور رنج سے نجات دلانے کے لیے ہمدردی مصروف رہتی ہے وہ اپنی باتوں سے اپنے طور طریقوں سے اور اپنی معصومانہ محبت سے اپنے باپ کو تسکین و تسلی دیتی ہے اور ہر طرح ان کے دکھ درد بانٹنے میں مصروف رہتی ہے ایک چھوٹی سی بچی کا اپنے باپ کے ساتھ یہ بے مثال رویہ دیکھ کر لوگ کہنے لگے کہ یہ بیٹی مومن بیٹی نہیں بلکہ یہ اپنے باپ کے ساتھ ماں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔

یہ ام ایہا ہے۔



## باب دوم

### شعبِ ابی طالب کا دور

شعبِ ابی طالب کے دور پر فتن کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ دور خالوادہٴ رسالت کے لیے ہر طرح کی سختی اور مصیبت کا دور تھا۔ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب (سوائے ابولہب کے جو دشمنوں سے مل گیا ہے) ایک خشک اور بے آب و گیاہ گھاٹی میں محبوس ہو گئے ہیں۔ انہیں عورتیں، مرد بچے، سبھی شامل ہیں۔ ابوجہل نے تمام اشرافِ قریش کی طرف سے ایک دستاویز تحریر کی ہے اور اسے خانہٴ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا گیا ہے اس قرارداد کا متن یہ ہے کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب سے کوئی شخص کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھے گا۔ ان کے ساتھ ہر قسم کا تعلق منقطع کر دیا جائے گا ان سے کوئی چیز خریدی نہیں جائے گی اور نہ ان کے ہاتھ فروخت کی جائے گی ان کے ساتھ کوئی ازدواجی رشتہ قائم نہیں کیا جائے گا

انہیں اس پہاڑی درہ میں محصور رہنے پر اس وقت تک مجبور کیا جائے گا کہ فقر و فاقہ، تنہائی اور زندگی کی سختیاں یا تو انہیں بتوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیں یا پھر موت کے حوالے کر دیں۔ یہ مصیبت، یہ قید کی سختیاں ان سب لوگوں کو برداشت کرنی ہوں گی جو یا تو اس نئے دین میں داخل ہو گئے ہیں یا پھر اگرچہ کہ انہوں نے اس نئے دین کے حلقہ میں شمولیت اختیار نہیں کی مگر وہ ہوان آزاد ہیں۔ وہ جاہلیت کے تعصب اور تنگ نظری سے آزاد ہیں اگرچہ کہ انہیں پیغمبرؐ سے فکری اختلاف ہے مگر وہ مشترک دشمنوں کے خلاف ان کا دفاع کرتے ہیں۔ وہ اسلام شناس نہیں ہیں اس لیے وہ اسلام کے اھولوں پر ایمان نہیں

لئے مگر وہ محمد شناس ہیں وہ پیغمبرؐ کی نیکی، پاکیزگی اور ان کی بے لوثی اور بے غرضی کے معترف ہیں وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ پیغمبرؐ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سب ہی حقیقت ہے اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض شامل نہیں ہے بلکہ ان کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ تمام انسانیت کو جہل اور ظلم سے نجات دلا سکیں تمام انسانوں کو آزاد کرا سکیں۔ یہ لوگ ایسے دانشوروں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ جو خوف اور مصلحت کا شکار ہو جاتے ہیں جیسے علی بن امیہ تھا۔ جو رجوت پسندی کا مخالف اور اسلام کے نئے انقلابی اور ترقی پسندانہ نظریہ سے آگاہ تھا۔ اور قریش کے توہمات اور تعصبات اور عرب کے اجتماعی، اقتصادی، نسلی اور طبقاتی نظام کی خرابیوں کو اسلام کی روشنی میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود اپنے باپ کی دولت اپنی اپنی خاندانی وجاہت اور اجتماعی زندگی میں اپنے مقام و مرتبہ سے محرومی کا اندیشہ اور اپنی جان و مال کی سلامتی کے خوف سے ابو جہل اور ابو لہب کے ساتھ ہو گیا اور اپنے ہم نکروں، نیک اور پاکیزہ فطرت اور با حوصلہ ساتھیوں۔ بلال اور عمار اور براء اور سمیہ۔ کو ہر طرح کے شدید کاہف بنتے دیکھتا رہا اور اس کے باوجود مشرکوں کے اس ظالمانہ رویہ کے خلاف اس کے لب نہ کھل سکے اس کے منہ سے کوئی آواز احتجاج بلند نہ ہو سکی وہ اس مشکل اور آزمائشی مدت میں جب اس کے عقیدے کے علمبردار اور مجاہد قید و بند کی سختیاں جھیل رہے تھے ان کی طرف سے بے فکر اور بے چارہ رہا اور اپنے خاندان اور شہر کی زندگی میں حسب معمول سرگرمی سے حصہ لیتا رہا یہاں تک کہ وہ کفر و منکارت کے سربراہوں کے ساتھ تعاون بھی کرتا رہا۔ ان کی مجرمانہ سرگرمیوں میں ان کا ساتھ دیتا رہا اس طرز عمل نے ایک سنت مذموم کی بنیاد رکھ دی برائی کا دروازہ کھول دیا تاریخ کے ادوار میں اس مسک اور اس سنت مذموم کے پیروں کی تعداد مسلک پیغمبرؐ کے سچے پیروکاروں علیؑ و ابوذرؓ و عمارؓ و فاطمہؓ و زینبؓ و حبیبؓ کے شیعوں اور تمام ان ہاجرین اور انصار سے جو دین پر صحیح معنوں میں عمل کرنے والے تھے۔ کہیں زیادہ نظر آتی

ہے یہ لوگ (علی بن امیر) وہ پہلے مسلمان تھے کہ جو باوجود اس کے کہ پیغمبرؐ نے جہدِ تقید کے اختتام کا اعلان کر دیا تھا۔ تقید کے اصول پر کاربند رہے اس لیے کہ اسی میں ان کا فائدہ تھا۔ یہ تاوقتِ مرگ اپنی اس مصلحت آمیز روش کا شکار رہے آخر یہ انسان کیسی عجیب و غریب مخلوق ہیں۔

جب انسانوں کی روح میں آتشِ ایمان فروزاں ہوتی ہے۔ جب معاشرے میں کسی نئی انقلابی تحریک کا آغاز ہوتا ہے تو پھر آزمائش اور احتساب کا وہ لمحہ بھی آجاتا ہے جب ہر شخص خود اپنے محاسب پر مجبور ہو جاتا ہے یہ وہ موقع ہوتا ہے جب انسان اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتا وہ خود سے سچ بولنے پر مجبور ہوتا ہے اسے مکرو دیا کے پردے چاک کرنے پڑتے ہیں اسے حق اور باطل کے درمیان واضح انتخاب کرنا پڑتا ہے اور یہی وہ موقع ہے جب وہ تمام عظمتیں اور ذلتیں وہ تمام کمزوریاں اور توانائیاں جو انسان کے باطن میں چھپی ہوئی ہیں خود کو پوری طرح آشکار کر دیتی ہیں۔

شعبِ ابی طالبؑ کا دور بھی ایسا ہی آزمائشی دور تھا جس نے حق اور باطل کو آشکار کر دیا اس ہولناک گھاٹی میں جہاں تین سال کی طویل مدت تک بھوک، تنہائی، سختی اور پریشانی کا ہولناک سایہ پھیلا ہوا تھا ایسا کون ہے جو مسلمان نہ ہو۔ مگر جو اس عظیم انقلابی مہم میں خدائی کام میں شریک اور سہیم ہے اور تاریخِ اسلام کے اس ابتدائی مگر انتہائی نازک اور آزمائشی دور میں محمدؐ اور علیؑ اور ان کے مخلص پیروکاروں یعنی اصحاب و مہاجر کے ساتھ ساتھ سختی اور مصیبت کا ہدف ہے اور دوسری طرف شہرِ مکہ ہے جہاں ناؤ نوش کی لذت اور زندگی کی راحت ہے مگر اس شہر پر جاہلیت اور رجعت پسندی بے دردی اور بے شرمی کا سایہ خیمہ کئے ہوئے ہے اور اس تاریک فضا میں کچھ وہ جہرے بھی دیکھے جاسکتے ہیں جن پر اسلام کا نقاب ہے مگر جن کے دامن آلودہ اور جن کے ہاتھ پلید ہیں یہ اس شہر میں آزادی اور آرام سے زندگی گزاتی ہے

۱۔ ایمان البرطالبت کی طرف اشارہ ہے۔

ہیں کیا یہ پیغمبرؐ اور ان کے خلیفینؓ پر سختیوں کا تماشہ دیکھ رہے ہیں یا اس مذموم کھیل میں خود بھی شریک ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ باطنی طور پر دیندار ہیں اور دینداروں کو دوست رکھتے ہیں۔ مگر کیا واقعی یہ دعویٰ سچا ہے ادھر شعب ابی طالب کے حصار میں بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کا خاندان شہری زندگی کی ہر سہولت سے محروم، لوگوں سے دور، آزادی حتیٰ کہ روٹی تک کے لیے ترس رہا ہے کبھی کبھی نصف شب کے اندھیرے میں خفیہ طور پر کوئی ہمت جو ان گھاٹی سے باہر آجاتا ہے قریش کے جاسوسوں کی نظروں سے بچتا ہوا بھوکے اور بیتاب قیدیوں کے لیے خوراک کا کچھ انتظام کرتا ہے کیا اس بات کا احتمال نہیں ہے کہ ان لوگوں میں جو شہر میں آزاد ہیں کوئی عزیز یا دوست اذراہ کرم ان بھوکوں تک روٹی پہنچا دے ان کی بھوک کبھی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ یہ نظر آتا ہے جیسے لوگ بھوک کے ہاتھوں، مرگ سیاہ، "کاشکار ہو جاتیں گے۔ مگر یہ اہل عزم و ایمان جنہوں نے خود کو مرگ سرخ یعنی شہادت کے لیے تیار کیا ہوا ہے۔ بھوک کے سامنے سپر انداختہ نہیں ہو سکتے ان کے حوصلہ اور صبر میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سعد بن ابی وقاص جو خود اس حصار میں مقید تھے بیان کرتے ہیں کہ بھوک نے اسقدر بیتاب کر دیا تھا کہ اگر رات کی تاریکی میں کسی تراور ملامت چیرے ٹھوکر لگتی تھی تو اسے اٹھا کر بے اختیار منہ میں رکھ لیتا تھا اور چوسنے اور چبانے کی کوشش کرتا تھا اس واقعہ کے دو سال بعد بھی میں یہ ٹھیک سے نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا چیز ہوتی تھی۔

ایسے حالات میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود خاندان رسالتؐ پر کیا گزری ہوگی تاریخ ہر واقعہ کی جزئیات نقل نہیں کرتی مگر ہم خود اندازہ لگاسکتے ہیں کہ خانوادہ رسالتؐ ان سختیوں کا سب سے زیادہ ہدف بنا۔

بات یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جو شعب ابی طالب کے حصار میں محصور و فقروں فاقہ کی سختیاں جھیل رہے تھے ان کے تمام آرام و مصائب کا واحد سبب ان کی خاندان

رسالت سے محبت اور یگانگت تھی اسی خاندان سے تعلق خاطر کے سبب وہ قید تنہائی اور فقر و فاقہ کی مصیبت جھیل رہے تھے یہ حقیقت بھی پوری طرح روشن ہے کہ تمام صورت حال کی ذمہ دار صرف ایک شخصیت تھی اور وہ شخصیت پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ کی ذات گرامی تھی خود پیغمبر بھی اس بات کو محسوس کرتے تھے اور ان کے تمام ساتھی بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے۔

ہر بچہ جو بھوک کی تکلیف سے بیتاب ہو کر رونا تھا۔ ہر بچہ جو غذا اور دوا فراہم نہ ہونے کی وجہ سے فریاد کرتا تھا۔ ہر بوڑھا خواہ مرد ہو یا عورت جو اس سختی اور مصیبت سے عاجز ہو جاتا تھا اور ہر چہرہ جو تین سال کی بھوک اور قید تنہائی کی وجہ سے زندگی کی حرارت اور خون کی سرخی سے محروم ہو چکا تھا جب ان... کا سامنا محمدؐ سے ہوتا تو وہ اپنی بھوک، بیماری، پریشانی اور کمزوری پر پردہ ڈال کر ان سے محبت اور وفاداری کا اظہار عزم اور حوصلہ کے ذریعے کیا کرتے تھے لیکن پیغمبرؐ کا حساس اور آگاہ قلب ان تمام لوگوں کے مصائب کو محسوس کرتا تھا اور ان کی ایک ایک تکلیف سے متاثر ہوتا تھا۔

بے شک جب کبھی رات کی تاریکی میں کہیں سے کچھ طعام دستیاب ہوتا تھا اور اسے پیغمبرؐ کے حضور پیش کیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں میں اسے تقسیم کر دیں تو اس تقسیم میں سب سے کم حصہ پیغمبرؐ کی بیوی اور ان کی اولاد کا ہوتا تھا بے شک اس غذا میں سے انہیں بس اسی قدر مل سکتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے جسم اور روح کے رشتہ کو برقرار رکھ سکیں

دورانِ حصار خانوادہ رسالت میں حضورؐ کی زوجہ خدیجہؓ تھیں ان کی سب سے چھوٹی بیٹی فاطمہؓ تھیں اور فاطمہؓ کی بہن ام کلثومؓ۔ ام کلثومؓ اور ان کی بہن رقیہؓ کی شادی ابولہب کے بیٹوں سے ہوئی تھی مگر لعنت کے بعد پیغمبرؐ کی تحقیر اور دلازاری کے لیے ابولہب نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں مگر عثمانؓ نے جن کا تعلق طبقہ اشراف سے تھا جو

جوان، حسین اور دولت مند تھے و قید سے عقد کر کے ابو لہب کے اس عمل کی تلافی کردی اور قیہ عثمان کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئیں۔ مگر ام کلثوم اپنی زندگی کے آرام و آسائش کو اپنے ایمان پر قربان کر کے اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ شعب ابی طالب کے حصار میں رہیں انہوں نے اپنے عظیم المرتبت باپ کے ساتھ وفاداری اور راہ ایمان و عقیدہ میں قید و بند اور جھوک کی سختیوں کو خاندان ابو لہب میں اپنے نابکار، بداندیش اور رجعت پسند شوہر عتبہ کے ساتھ رہ کر عیش و عشرت کی زندگی گزارنے پر ترجیح دی۔

اس گھائی کے مکینوں کا ہر دن سختی اور مصیبت میں کٹتا تھا اور ہر رات ایک تاریکی کے حیمہ کی طرح ان پر مسلط ہو جاتی تھی ہفتہ، مہینہ اور سال اسی طرح گزر گئے ان دنوں کی سختی اور ان راتوں کی مرگ آسائش کی نے ان کے جوں اور درجوں کو خستہ کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ان سب کی ہمتیں جوان تھیں ان کے ایمان تو اتنا تھے وہ ایک دوسرے کی علم خواری اور پیغمبر سے عہد وفا پر مضبوطی سے قائم تھے۔

ان تمام حالات میں خاندان رسالت کی ایک مخصوص اور منفرد حیثیت ہے اس خاندان کے سربراہ کے شانوں پر تمام لوگوں کے دکھ درد اور مصیبتوں کا بوجھ ہے اس کی بیٹی ام کلثوم اپنی ہر حسرت کو تیج کر شوہر کے گھر سے اپنے باپ کے گھر آچکی ہے اور دوسری بیٹی فاطمہ نہایت خورد سال ہے اس کی عمر صرف دو تین سال یا ہر روایت دیگر بارہ سترہ سال ہے اس کے ساتھ ہی وہ کمزور اور حایس ہے اس کا جسم ضعیف اور اس کی روح زندہ اور حساس ہے اور پیغمبر کی زوجہ فاطمہ نہایت بزرگھی اور ضعیف ہیں وہ اپنی عمر کے ستر سال گذار چکی ہیں۔ جن میں دس سال کا وہ آزمائشی اور تکلیف دہ عرصہ بھی شامل ہے جو دعوت رسالت کے جواب میں کافروں کے رد عمل سے عبارت ہے اور پھر تین سال کا یہ عرصہ قید تنہائی، جھوک اور پریشانی کا یہ دور جو کاہر دن سختی اور ہر رات

مصیبت کا بیفام ہے انہوں نے اپنے شوہر کے حالات کو دیکھا ان کے دکھ درد کو محسوس کیا اپنی بیٹیوں کی تسکین کو محسوس کیا ان حوادث اور اس سے قبل دو کم سن لڑکوں کی موت کے صدمہ نے ان کو بالکل نڈھال کر دیا ہے اگرچہ اب بھی ان کی بہت پست نہیں ہوئی مگر ان کے ضعیف جسم سے زندگی کی تمام توانائیاں رخصت ہو چکی ہیں اب ہر لحاظ ان کی آنکھیں موت کی تصویر دیکھ رہی ہیں۔

اور اس ضعیف اور بیماری کے باوجود خاندان محمد پر ایسا برا وقت پڑا ہے کہ خدیجہ جن کی زندگی عیش و نعم میں گزری ہے اور جنہوں نے اپنی تمام دولت اپنے شوہر کے مقصد کی راہ میں قربان کر دی اب بھوک سے بے تاب ہو کر چرٹے کے ٹکڑے کو پانی میں ترکی کے اپنے منہ میں رکھتی ہیں تاکہ بھوک کی شدت کو کم کیا جاسکے۔

فاطمہ جو ایک کم سن اور حساس بچی ہیں اپنی ماں کے بالے میں فکر مند رہتی ہیں اور ان کی ماں فاطمہ کے بالے میں پریشان رہتی ہیں یہ ان کی سب سے چھوٹی اولاد ہیں کم سن اور لاغر لڑکی جنکی اپنے باپ اور ماں سے غیر معمولی محبت کا ہر طرف چرچا ہے اس صبر آزمایہ قید کے آخری ایام میں ایک دن خدیجہ جنہیں اپنی موت جانتی پوری ہونے کا احساس ہو چکا تھا اپنے لیستر پر آرام کر رہی تھیں اور فاطمہ اور اکثوم ان کے پاس بیٹھی تھیں اس وقت پیغمبر لوگوں کو خوراک تقسیم کرنے کے کام میں مصروف تھے۔

خدیجہ کی رسنی اور ضعیف اور ناسازگار حالات کے مضرات کو پوری طرح محسوس کر رہی تھیں ان کا جسم بیماری سے بہت کمزور ہو چکا تھا انہوں نے حسرت بھر کے لہجہ میں کہا

کاش موت مجھے اتنی مہلت دے دے کہ یہ تیرہ و تار ایک دور ختم ہو جائے اور میں اطمینان اور سکون سے جان دے سکوں۔ ام کلثومؓ یہ سن کر رونے لگیں اور انہوں نے کہا

اے مادرِ بہرہ ان آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم ان باتوں سے نہیں گھبراتے جناب خدیجہؓ نے جواب دیا۔ خدا کی قسم مجھے اپنی کوئی پرواہ نہیں ہے اور نہ میں

خود اپنے بائے میں پریشان ہوں۔ اے میری خُشتِ جگر قریش میں کسی عورت نے زندگی سے وہ راحت و آرام نہ اٹھایا ہوگا جو مجھے میسر رہا ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو تمام دنیا کی عورتوں میں جو مجھے کرامت نصیب ہوئی ہے اور وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آ سکی ہے۔ میرے لیے یہ بات بہت ہے کہ اس دنیا میں میری تقدیر یہ ہو سکی کہ میں اللہ کے محبوب بندہ اور اس کے منتخب پیغمبر کی شریکِ حیات ہوں اور عاقبت کے لیے مجھے یہ فخر کافی ہے کہ میں نے دعوتِ رسالت پر سب سے پہلے لبیک کہا اور میں رسول کے امتیوں کی ماں کہلاتی ہوں۔

پھر خود ظامی کے انداز میں انہوں نے اپنا سلسلہ گفتگو عمارِ رکھا۔ خداوندِ ماجد میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ تو نے مجھ پر جو اسطاف و عنایات کی ہیں اور مجھے جن نعمتوں سے نوازا ہے ان کا شمار کر سکوں، اے خدا میں تجھ سے ملاقات کے خیال سے دل تنگ نہیں ہوں لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ تجھ سے ایسی حالت میں سامنا ہو کہ میں خود کو تیری عطا کردہ نعمتوں کا اہل ثابت کر سکوں

نظارہ پر ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا، رنجِ مایوسی، اور موت کا سایہ خدیجہؓ ام کلثومؓ اور فاطمہؓ کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا کہ ناگہان پیغمبرؐ نمودار ہوئے۔ ان کے چہرہ تاباں سے امید، ایمان اور روحانی قدرتِ فوقانی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں یوں لگتا تھا کہ آسمان اور زمین کے اس تین سالہ سخت و تاریک دور نے پیغمبرؐ کے جسم و روح کو بالکل پڑھوڑ نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس ان کے عزم، حوصلہ، قوتِ ارادی اور جذبہٴ ایمان میں اضافہ کا سبب بنا ہے۔

شعب ابی طالبؓ کی قیدِ سخت کا تاریک دور ختم ہو گیا خدا پرستوں نے موت سے قبل مسلمانوں کی نجات اور اپنے عزیز اور عظیم مشن کی آزادی کے دور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہ قریش پر پیغمبرؐ کی پہلی بڑی فتح تھی۔

مگر کاتبِ تقدیر کو یہ پسند نہیں آیا کہ وہ عظیم انسان جسے تاریخ کا دھارا موڑنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اطمینان اور سانس کا سکون لے سکے اس لیے اس کی



چہرہ پر اطمینان اور مسرت کا رنگ جھلک سکے تقدیر پیغمبرؐ کو بیک وقت دو عظیم مہمات سے دوچار کر دیتی ہے۔

شعب ابی طالبؑ کی قید سے رہائی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرنا کہ ابوطالب اور خدیجہؓ تھوڑے دنوں کے فرق سے داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ ابو طالبؑ وہ ہستی ہیں جنہوں نے اپنے یتیم بھتیجے کی پرورش کی ہے اور اپنی غیر معمولی محبت اور شفقت کے ذریعہ یتیم بھتیجے کو ماں باپ اور دادا کی کی محسوس نہیں ہونے دی پھر جب آپؐ جوان ہو گئے تو ابو طالبؑ نے آپؐ کی سرپرستی اور نگہبانی کے فرائض انجام دیئے آپؐ کے لیے خدیجہؓ کے کاروبار میں شرکت بھی راہ ہموار کی اور پھر خدیجہؓ سے آپؐ کے عقد کے موقع پر آپؐ کے پدر بزرگوار کی نیابت کی۔

ابوطالبؑ سے حضورؐ کے تعلق کی تین نمایاں جہتیں ہیں آپؐ نے محمد یتیم کی پرورش فرمائی "محمد جوان" کی نگہداری کا فریضہ انجام دیا اور محمد پیغمبرؐ کی حفاظت اور نصرت میں اپنی تمام توانائیوں کو صرف کیا جب حضورؐ نے کار رسالتؐ کا آغاز کیا تو ابو طالبؑ دشمنوں کے خلاف آپؐ کی سپر س گئے اور اپنی تمام شخصیت اور حیثیت اپنے تمام اثرو نفوذ اور اپنے تمام اجتماعی اعتبار اور وقار کو حضورؐ کی حفاظت اور حمایت کے لیے وقف کر دیا۔ یہاں تک کہ تین سال تک پیغمبرؐ کے ساتھ شعب ابی طالبؑ کے حصار کی سختیاں صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ یہ محض ابو طالبؑ کی ذات تھی جس کے سبب پیغمبرؐ اسلام دشمنوں کی ایذا رسانی اور تشدد سے محفوظ رہے یہ محض ابو طالبؑ تھے جو دشمنوں کی تمام سازشوں کے خلاف ایک مضبوط حصار تھے اور جن کی وجہ سے پیغمبرؐ دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے محفوظ رہے اور اب یہ بزرگ ترین شخصیت دنیا سے اٹھ گئی گویا رسولؐ کے گرد حفاظت کا جو مضبوط حصار تھا وہ ٹوٹ گیا اب رسولؐ لہذا ہر بے یار و مددگار ہو گئے۔

اس کے کچھ ہی دن بعد خدیجہؓ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔

خدیجہؓ وہ خاتون تھیں جنہیں قدرت نے اپنے محبوب کو ایک ایسی عنایت کے

طور پر بخشا تھا جس کے ذریعہ پیغمبر کی انفرادی زندگی کی تمام محرومیوں کا ازالہ کیا  
جاسکے خدیجہ سے عقد کے وقت حضور کا سن ۲۵ یا پچیس سال تھا اور یہ تمام مدت  
یتیمی، گمہ بانی، تنگ دستی اور فقر کے ایک مہر آزمادہ دور کی حیثیت رکھتی ہے خدیجہؓ ایک  
انتہائی مالدار خاتون تھیں عقد کے وقت آپ کا سن چالیس سال بتایا جاتا ہے  
خدیجہ سے حضور کی رفاقت محض ایک زوجہ اور شہرہ کے تعلق سے کہیں زیادہ تھی وہ  
ایک مخلص اور وفادار بیوی تھیں وہ آپ کی تبلیغی مہم میں آپ کی ہمدرد اور روحانی  
رفیق تھیں وہ مفلسی اور تنگ دستی میں آپ کی پناہ تھیں انہوں نے پیغمبر کو ایک  
مخلص دوست اور رفیق کا خلوص بخایا اور انہوں نے آپ سے ایسا محبت آمیز رویہ  
رکھا جس نے کسی حد تک مال کی محبت سے محرومی کے احساس کی تلافی کر دی۔

حضورؐ کی بعثت کے بعد ایک ایسا طوفانی دور شروع ہوا جو پیغمبر کے لیے سختی  
خوف، خطرہ اور تنہائی کا دور تھا یہ دشمنوں کی سازشوں، مکر و فریب اور کشمکش  
کا ایک ایسا دور تھا جس میں پیغمبرؐ ہر طرف سے دشمنی اور مخالفت کا نشانہ بنے ہوئے  
تھے۔ آغاز وحی کے وقت سے موت کے لمحہ تک خدیجہ قدم بہ قدم رسولؐ کے ساتھ  
رہیں ان کا دل اور ان کی روح رسولؐ کی محبت سے سرشار تھی وہ تمام مشکل لحظات  
میں ان کی مونس و غم نگار تھیں۔ ان کی تمام زندگی، تمام جذبہ محبت، ایمان خدا  
سکاری اور تمام دولت حضورؐ کے لیے وقف تھی انہوں نے ہر چیز کو ان پر قربان کر دیا  
خدیجہؓ نے ایک ایسے پاشرب اور پرخطرہ دور میں رسولؐ کا ساتھ دیا جب رسولؐ  
کو کسی ساتھی کے غلوں اور ہمدردی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

اور اب محمدؐ رحمتی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اس ہستی سے محروم ہو گئے جو ان کی  
حامی تھی۔ ہمدرد ہمدرد تھی۔ جو ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والی تھی جو  
ہر سختی اور مصیبت کے وقت ان کو تسلی دینے والی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ان  
بینی فاطمہؓ کی ماں تھی اور فاطمہؓ ماں کے سایہ سے محروم ہو گئیں  
سختی اور مصیبت شدید سے شدید تر ہو گئی ہے ابو طالب دنیا سے گزر چکے

اور اب اس دنیا میں دشمنوں کی سازشوں اور ایذا رسانیوں سے پیغمبر کا تحفظ کرنے والا کوئی شخص نہیں رہا۔ پیغمبر کا محافظ کوئی نہیں ہے اور ہر پیغمبر اور ان کے پیروکاروں کے مبرا اور حوصلہ اور ایمانی قوت نے دشمنوں کو بہت مشتعل کر دیا ہے۔ اور ان کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ پیغمبر صمد درجہ تنہائی محسوس کر رہے ہیں۔ وہ بے یار و مددگار ہیں۔ شہر ابوطالب سے خالی ہے اور گھر خدیجہ سے۔ پیغمبر کے لیے گھر کے اندر اور باہر ہر طرف تنہائی ہے۔

اور یہی وہ وقت تھا جب فاطمہؑ نے اپنی کینٹ 'ام ایہا' کی معنویت اور اس کے تقاضے ہمیشہ سے زیادہ شدت سے محسوس کئے۔ ان کے ذہن میں ان لمحوں کی یاد تازہ ہو گئی جب ان کی بہنیں رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد باپ کے گھر سے شوہر کے گھر منتقل ہوئی تھیں انہوں نے اپنی ماں کا دامن پکڑ کر کہا تھا اماں مجھے کسی طرح یہ پسند نہیں ہے کہ میں اس گھر کو چھوڑ کر کسی اور گھر چلی جاؤں اماں میں ہرگز آپ سے جدا نہ ہوں گی خدیجہ نے ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جو شفقت اور ستائش سے بھرپور تھی جواب دیا۔

سب یہی کہتے ہیں مگر اے پارہ حنجر ایک وقت آتا ہے کہ ہر لڑکی اپنے باپ کے گھر سے شوہر کے گھر منتقل ہو جاتی ہے۔

مگر فاطمہؑ اصرار کرتی ہیں کہ نہیں میں اپنے باپ کو نہیں چھوڑ سکتی کوئی مجھے ان سے جدا نہیں کر سکتا۔ ماں بیٹی کے یہ جذبات دیکھ کر خاموش ہو جاتی ہے۔

اور اب فاطمہؑ کو پوری طرح احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کو کیسی اہم ذمہ داری سونپ دی ہے انہوں نے اپنے پدر بزرگوار سے جدا نہ ہونے کا جو عہد کیا تھا اب وہ محض طفلی کا معصومانہ عہد نہیں تھا بلکہ اس میں ایمان اور شعور کی پختگی شامل ہو چکی تھی۔ فاطمہؑ نے اپنے باپ کو ایک رسول کی حیثیت میں دیکھا تھا اور رسولؐ کی رسالت پر ان کا ایمان محض باپ اور بیٹی کی محبت کی بات نہ تھی بلکہ اس میں تفکر کی گہرائی بھی شامل تھی جس وقت حضورؐ نے قریش کو پہلی بار اسلام کی دعوت دی تو اس موقع پر

خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا۔  
اے گروہ قریش اپنی حقیقت کو دریافت کرو۔ میں خدا کے معاملہ میں تمہیں  
کسی بات سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔

اے بنی عبد مناف۔ اپنی ذمہ داریوں کو پہچانو۔ میں اس بات کی قدرت  
نہیں رکھتا کہ خدا کے معاملہ میں تمہیں کسی فرض سے بے نیاز کر سکوں۔  
اے عباس بن عبد المطلب میں خدا کے حضور تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا  
اے صفیہ بنت عبد المطلب۔۔۔۔۔

پھر رسولؐ نے اپنی کم سن بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا  
اے فاطمہؑ۔ تم میری دولت میں سے جو کچھ چاہو لے لو لیکن جہاں تک تمہارا اور  
تمہارے خدا کا معاملہ ہے یاد رکھو اس باب میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا  
تمہیں کسی فرض سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔  
فاطمہؑ نے یہ سن کر شوق اور جذبہ ایمان کی فراوانی کے عالم میں جواب دیا  
تھا۔

ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔ اے پدر ہریان۔ اے گرامی ترین پیغمبرؐ  
کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ پیغمبرؐ نے اکابر قریش کے مجمع میں بنی ہاشم  
اور بنی عبد مناف کی بزرگ ترین شخصیتوں کے ساتھ ساتھ فاطمہؑ کو بھی بطور  
خاص نام لے کر مخاطب کیا۔ فاطمہؑ جو اس وقت بہت کم سن تھیں مگر جو اس اجتماع  
میں شرکت کرنے والی وہ واحد ہستی تھیں جس کا تعلق خاص خاندانِ رسالت سے  
تھا اس مجمع میں صرف اور صرف وہی رسولؐ کے گھر کی نمائندگی کر رہی تھیں  
طفلی کے جذبات اور ایک بیٹی کی محبت کا وہ ذوق و شوق کہ جس کے زیر اثر فاطمہؑ  
نے بار بار یہ اظہار کیا تھا کہ وہ ہرگز شادی نہ کریں گی۔ تاکہ انہیں اپنے باپ سے  
جدائی کا درد نہ برداشت کرنا پڑے رفتہ رفتہ ایک عہد آگاہانہ میں بدل گیا تھا  
اس میں ذمہ داری اور مسؤلیت کی شان پیدا ہو گئی تھی۔

فاطمہ کی عمر کا ابتدائی دور اور بعثت رسول اور اس کے رد عمل کے طور پر پیش آنے والی مصیبتوں کا ابتدائی دور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے اور فاطمہؑ محمدؐ کی تمام اولاد میں سختیوں کو جھیلنے مصائب کو برداشت کرنے اور اپنے والد کے بار رسالت کو سہارا دینے کی سب سے زیادہ اہل ہیں اور پھر وہ اپنی اس حیثیت اور سروسنت کا پوری طرح شعور بھی رکھتی ہیں ان کے باپ اور ماں بھی اپنی اس چہیتی بیٹی کی حیثیت سے باخبر ہیں۔ اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں ایک دن خدیجہ نے فاطمہؑ سے ان کے مستقبل کی بابت گفتگو کرتے ہوئے کہا

اے میری عزیز ترین بیٹی میری موت کے بعد خدا معلوم تجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ میری زندگی کا پیمانہ بس آج یا کل لبریز ہو جائے گا اور میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی۔ تیری دو بہنیں زینبؑ اور رقیہؑ اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ آسودہ زندگی گزار رہی ہیں ام کلثومؑ کی عمر اور اس کا زندگی کا تجربہ اتنا کافی ہے کہ میں اس کی طرف سے بے فکر ہوں۔ مگر اے میری دختر خود رسال لے فاطمہؑ مجھے یہ فکر پریشان کئے ہوئے ہے کہ میرے بعد تو سختی اور مصیبت کے طوفان میں گھر جائے گی اور تیرے در دو غم میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔

اور فاطمہؑ نے جواب اپنی اس حیثیت سے آگاہ تھیں کہ انہیں اپنے پدر بزرگوار کی عظیم اور صبر آزماء دلداریوں میں ان کا ہاتھ بیٹا نہ ہے ان کے شانوں پر جو رسالت کا سنگین بار ہے اسے ہلکا کرنا ہے بڑے اعتماد سے اپنی ماں کو یوں جواب دیا۔

مادر گرامی مطمئن رہیے۔ میرے باپے میں غم نہ کیجئے۔ بہت پرست قریش جس قدر چاہیں سرکشی کریں۔ جتنا ممکن ہو مسلمانوں کے اوپر مصیبت کے پہاڑ توڑیں ان کا ظلم و زیادتی کسی حد تک کیوں نہ بڑھ جائے۔ سچے دل سے اسلام قبول کرنے والے ان عظیم مصائب کو خندہ پیشانی سے قبول کریں گے اور میں سب سے زیادہ اس بات کی سزا ہوں کہ میں کفر و شرک کی ان ریشہ دوانیوں اور ایذا رسانیوں کا مقابلہ کروں مجھے

رسولؐ کی بیٹی ہونے کا شرف حاصل ہے اور مجھے رسولؐ کی وہ محبت اور توجہ حاصل ہے جو صرف میرے ساتھ مخصوص ہے اس اعتبار سے مجھ پر تمام سختیوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری ہر شخص سے زیادہ عائد ہوتی ہے اور میں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے تجوشی تیار ہوں۔

ابوطالبؓ کے انتقال کے بعد دشمنوں کی دشمنی اور کینہ فوری اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ پیغمبرؐ کے اقارب و اصحاب میں سے ایک گروہ نے حبشہ ہجرت کر کے وہاں پناہ حاصل کر لی دوسرا گروہ مکہ میں کفار کے ظلم و ستم اور تشدد کا نشانہ بنا رہا۔ مسلمانوں پر کفار کی طرف سے ایذا رسانی کی شدت بڑھتی رہی چاروں طرف سے مصیبتوں کی یلغار میں اضافہ ہوتا رہا۔ پیغمبرؐ جن کی عمر کے پچاس سال گزر چکے ہیں اور جن کی زندگی مسلسل آلام و مصائب کی ضربات شدید کا نشانہ رہی ہے ایہہ طرف سے غم و اندوہ میں گھرے ہوئے ہیں وہ تنہا اور بے یار و مددگار ہیں ایسے عالم میں ان کے دکھ درد کی ساتھی صرف ایک ہی ہستی ہے۔

ان کی جہیتی اور کم سن بیٹی فاطمہؑ۔

مگر نہیں۔ تقدیر نے اس گھر میں ایک بیٹے کو بھی داخل کر دیا ہے کوئی نہیں جانتا کہ قدرت مستقبل کے لیے کیا منصوبہ بنا رہی ہے۔

اس بیٹے کا نام علیؑ ہے۔

ہاں علیؑ خود اپنے باپ کے گھر میں پروان نہیں چڑھے۔ وہ آغاز طفولیت ہی سے فاطمہؑ کے ساتھ ہے ان کی پرورش اور تربیت پدرِ فاطمہؑ کے گھر میں ہوئی اس نوجوان کی تقدیر اس باپ اور بیٹی کی تقدیر سے عجیب طرح مربوط اور منسلک ہے۔ تاریخ اپنا کام کئے جا رہی ہے ایک بظاہر پرسکون مگر پراسرار اور پرانہ امکان دور کی آغوش میں ایک زبردست طوفان پرورش پا رہا ہے مستقبل میں جب یہ طوفان برپا ہوگا تو تمام بت لوٹ جائیں گے۔ پیغمبروں کے بت طبقاتی تضاد کے بت، نسلی افتخار کے بت، اشرافیت اور قومیت کے بت، اقتصادی گروہ

ہندی اور طبقہ واریت کے بت سب ریزہ ریزہ ہو جائیں گے آتش کدہ ایران میں  
درباری روحانیت کی آتش پر فریب سرد پڑ جائے گی مدائن کے بلند و بالا قصر کے  
کنگرہ زمین بوس ہو جائیں گے۔

روم کی استبدادی حکومت جس کی بنیاد انسانوں کے خون پر رکھی گئی ہے دبا پڑ  
ہو جائے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں کے دل و دماغ سے وہ زنگ دھل جائے  
گا جو صدیوں کی بوسیدہ روایات، کہنہ عادات، بے معنی خرافات، اساطیری روایات  
کا نتیجہ ہے، تعصب جہالت، ہوس، جذبات اور انسان دشمن عقائد و خیالات نے  
جو قدیم تراشی ہیں اور بزرگی اور افتخار کے جو پیمانہ مقرر کئے ہیں وہ سب درہم  
و برہم کر دیئے جائیں گے اور ایک ایسی فضا بنے گا کہ ایک میں جو خاندان، نسل طبقہ واریت  
اشراقیت، طاقت، تشدد اور غارت گری سے آلودہ ہے اور جہاں خاک و خون اور  
بتوں کی پرستش کی جاتی ہے آزادی اور مساوات اور عدالت اور جہاد اور خود آگاہی  
کی جو عین نمودار ہو کر ہر نقش کہن اور ہر قد پارینہ کو مٹا دیں گی عوام گمنام بے حیثیت  
اور بے اعتبار عوام ناخدا یان زمین کے اقتدار کو جو ہمیشہ سے عوام کی گردنوں  
پر مسلط رہا ہے خاک میں ملا دیں گے تاریخ ماضی کے افسانوں کے بدلے حال و  
مستقبل کی حکایت بن جائے گی اس میں بوسیدہ ہڈیوں، زرد و قیروں، اور دولت  
اور طاقت کے افسانوں کی جگہ زندگی، حرکت تغیر اور انقلاب کا رنگ آجائے گا  
اب تاریخ تیغ اور طلا یعنی طاقت اور دولت کی حکایت نہیں رہے گی۔ ایک نئی  
تاریخ کا آغاز ہو گا۔ انقلابی تاریخ جو عوام کے جوش، حرکت، اور ذوقِ عمل سے  
عبارت ہوگی اس انقلابی تاریخ کا سلسلہ ان لوگوں سے شروع ہو گا جن کا تعلق طبقہ  
خوام سے نہیں بلکہ طبقہ خواص سے ہے یہ وہ گلہ بان ہیں جو انقلاب کے داعی ہیں  
ان میں ایک عظیم رسولؐ کو مبعوث کیا گیا ہے اور انہیں اقوامِ عالم تک اس پیغام  
کو پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے یہ جو پایاں مبعوث ہیں جن میں سے ہر ایک  
کے جسم پر شہادت کی قبار اور سر پر فقر کا تاج ہے ان کی زندگی یا میدانِ جنگ

یہ سہر ہوتی ہے یا تعلیم خلق کے مشغلہ میں گذرتی ہے یا پھر وہ زندانِ ستم میں قید کے دن گدگاتے ہیں تاریخ کے اس عظیم انقلاب کے داعی رسولؐ ہیں لیکن ایثارِ زندا کا یہ قربانی اور شہادت کی اس عظیم تاریخ کا نکتہ آغاز فاطمہؑ ہیں۔ اور اس تاریخ کو حرکت، توانائی، تسلسل اور اعتبار بخشنے کے لیے بہر حال علیؑ کی ضرورت ہے۔

یہی سبب تھا کہ فقر کی رحمت نے رحمت کی شکل اختیار کر کے ابوطالب کے کم سن بیٹے کو آغا ز طفولیت ہی میں اپنے باپ کے گھر کی بجائے اپنے عم زاد کے گھر منتقل کر دیا تاکہ اس بچے کی روح جاہلیت کی آلودگی سے ہر طرح پاک رہے تاکہ جس وقت وحی کا نزول ہو وہ سب سے پہلے اس پیغام کو سن سکے تاکہ آغازِ بعثت کے لمحہ ہی سے وہ ہر طرح کے حوادث اور آفات، ہر طرح کے رنج و مصیبت اور ہر طرح کی سختی اور کشاکش کے مقابلہ کی تربیت حاصل کر سکے تاکہ وہ ہجرت کے خطرناک موقع پر اپنی بے مثال ذمہ داری کو پورا کر سکے تاکہ وہ بدر، احد، خیبر، اور حنین کے معرکوں کو سر کر سکے تاکہ اس کی تلوار اور اس کی شجاعت اسلام کی انقلابی تحریک کی کامیابی کی علامت بن سکے تاکہ وہ فاطمہؑ کے ساتھ تربیت پاک پر روانہ چڑھ سکے تاکہ وہ بالآخر فاطمہؑ کی رفاقت میں انسانیت کے ایک خاندانِ مثالی کو تشکیل دے سکے اور سنتِ ابراہیمیؑ کو مدوامت عطا کر کے تاریخ میں ایک نئے انقلابی دور کے آغاز اور تسلسل کی بنیاد رکھ سکے۔



## ہجرت

مکی زندگی کے تیرہ سال پورے ہو چکے اس تمام مدت کا ایک ایک لمحہ سختی، مصیبت، کشمکش اور صعوبت کی داستان ہے۔ فاطمہؓ آغاز طفولیت ہی سے ان آلام و مصائب کی زد پر رہی ہیں۔ شہر ہو، گھر ہو یا شوبہ ابی طالبؓ کا حصار وہ ہر جگہ اپنے پدر بزرگوار کے قدم پر قدم دور جاہلیت کی وحشت آمیز مخالفت اور اس مخالفت کی سختیاں اپنی جان و ناتواں پر جھیلتی رہی ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے عظیم المرتبت مگر تنہا پدر بزرگوار کی غم خواری اور کسی ماں کی طرح ان کی دیکھ بھال کا فریضہ بھی انجام دیتی رہی ہیں۔

ہجرت کا آغاز ہو چکا ہے مسلمانوں کے گروہ مدینہ جا چکے ہیں فاطمہؓ کی بہن رقیہؓ جو اپنے شوہر عثمان کے ساتھ پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کر چکی تھیں اب مدینہ روانہ ہو چکی ہیں۔ بالآخر خود پیغمبرؐ اور ان کے ساتھ ابو بکر رات کی تاریکی میں مکہ سے ہجرت کر چکے پھر فاطمہؓ اور ان کی بہن ام کلثومؓ بھی مکہ روانہ ہو گئیں ناگہاں قریش کا ایک مفسد اور شر پسند شخص جو پیغمبرؐ کو آزار پہنچانے میں بہت پیش پیش رہتا تھا ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور انہیں تشدد کا نشانہ بناتا ہے یہاں تک کہ یہ سواران سے زمین پر گر خاتی ہیں۔

فاطمہؓ جو کمزور اور لاغر اندام تھیں اور جنہیں تین سالہ قید کی صعوبت اور زحمت نے مزید کمزور اور لاغر کر دیا تھا اس حادثہ سے شدید طور پر متاثر ہوئیں مدینہ تک کا تمام طویل راستہ انہوں نے شدید درد اور تکلیف کی حالت میں طے کیا جویرث بن نفیعہ کی اس کمینہ حرکت نے تمام مسلمانوں بالخصوص پیغمبرؐ اور علیؓ کو اس قدر اذیت پہنچائی کہ اس واقعہ کے آٹھ سال بعد فتح مکہ کے موقع پر اس کی اس حرکت کو بھلایا نہیں جاسکا اور اس کا نام ان لوگوں کی ہرست میں شامل تھا جن کا خون مباح کر دیا گیا تھا باوجودیکہ پیغمبرؐ نے مکہ میں خونریزی سے پرہیز کا بخومی حکم دیا تھا

اور اس حکم پر شدت سے عمل کرایا گیا تھا لیکن اس مکینہ فطرت شخص کے بارے میں یہ حکم دیا تھا کہ اگر وہ خانہ کعبہ کے پردے سے بھی لیٹا ہوا ہو تو بھی اسے قتل کر دیا جائے۔

اور یہ محض اتفاق حادثہ نہیں ہے کہ پیغمبر کے اس حکم کی تعمیل علی کے ہاتھوں سے ہوئی۔

### دورِ مدینہ

اب مدنی زندگی کا آغاز ہو چکا ہے۔ پیغمبر نے مسجد کی بنیاد رکھی ہے اور اس کے پہلو میں خورپا گھر تعمیر کیا ہے اس گھر کی تعمیر کھجور کے پتوں، اشخوٹ اور اسی طرح کے ساز و سامان سے کی گئی ہے۔

اس کے بعد عہدِ مواخات کی رسم ادا کی جاتی ہے خدا کی راہ میں دو انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا جاتا ہے۔

جعفر بن ابوطالب کو ان کی عدم موجودگی میں معاذ بن جبل کا بھائی بنایا جاتا ہے ابو بکر کو غارِ جبرہ بن زہیر کا عمر بن خطاب کو عتبہ بن مالک کا اور عثمان کو اوس بن ثابت کا بھائی قرار دیا گیا۔

جب پیغمبر تمام لوگوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا چکے تو آپ نے فرمایا کہ ”میرا بھائی یہ علیؑ ہے“ عہدِ مواخات کی رو سے محمدؐ اور علیؑ بھائی بھائی قرار پائے اس طرح ایک بار پھر تمام لوگوں میں علیؑ محمدؐ سے خصوصی قربت اور یگانگت سے سرفراز ہوئے۔ علیؑ کو محمدؐ سے ایک اور تعلق کا شرف عطا کیا گیا۔ علیؑ کی ماں، فاطمہ بنت اسد محمدؐ کی پرستار اور خدمت گزار ہیں، علیؑ کے باپ ابوطالب محمدؐ کے حامی و ناصر اور ان کے محافظ تھے۔ محمدؐ علیؑ کے گھر میں پروان چڑھے اور علیؑ نے خانہ محمدؐ میں پرورش پائی۔ وہ فاطمہؑ کے ہمراہ تربیت پاتے رہے وہ پیغمبر کے سایے میں پلے اور فاطمہؑ کی ماں خدمتِ نبویؐ کی آغوشِ عاطفت میں پروان چڑھے۔ وہ محمدؐ کے

عم زاد بھی تھے اور برہنہ ان کے فرزند بھی تھے اب وہی علیؑ، محمدؑ کے بھائی قرار پائے مگر ان سب باتوں کے باوجود ابھی ایک اور منزل باقی ہے سب سے اہم اور آخری منزل جس کے بعد علیؑ اس مقام کمال تک پہنچ جائیں گے جو قدرت کی طرف سے ان کے لیے مقرر کیا جا چکا ہے اور جس کا سرگزشتِ محمدؑ اور تاریخِ سر بلندیِ اسلام سے بڑا گہرا اور بنیادی اور خصوصی تعلق ہے۔

## عقدِ فاطمہ

فاطمہؑ نے طفلی میں اپنے پدر بزرگوار کا ساتھ نہ چھوڑنے کا جو عہد کیا تھا اس پر پورے خلوص سے قائم رہیں۔ وہ خانہٴ پدر میں اطمینان اور سکون سے مقیم رہیں۔ ہر شخص اس بات سے باخبر ہے جب سے پیغمبرؐ نے ابو بکر اور عمرؓ کی خواستگاری کو صریحی طور پر رد کر دیا ہے تمام اصحاب پر یہ بات روشن ہو گئی ہے کہ فاطمہؑ کا عقد ایک خصوصی نوعیت کا معاملہ ہے اور پیغمبرؐ اپنی بیٹی سے مشورے کے بغیر اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔

فاطمہؑ علیؑ کے ساتھ ساتھ بلی بڑھی ہیں ان کی نظروں میں علیؑ ایک عزیز بھائی اور ان کے پدر بزرگوار کے عاشق اور شیعہٴ رسالت کے پیروانے کی حیثیت رکھتے ہیں قدرت نے ان دونوں کی تقدیر کو عہدِ طفلی ہی سے ایک دوسرے سے مربوط کر دیا ہے اور یہ ربط اور تعلق بہت ہی خاص اور امتیازی نوعیت رکھتا ہے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی جاہلیت کی آلودگی نے مس نہیں کیا دونوں کی عمر کا ابتدائی حصہ بعثت کے طوفانی دور میں گزرا اور دونوں وحی کے نور کی آغوش میں پروان چڑھے۔

فاطمہؑ علیؑ کی نسبت کیا احساسات و جذبات رکھتی ہیں اور علیؑ کا شجاعت اور محبت سے لبریز دل فاطمہؑ کو کس حیثیت میں دیکھتا تھا اس کے متعلق سوچا تو جا سکتا ہے مگر اس کے بیان سے الفاظ قاصر ہیں۔

ان تہہ در تہہ احساسات کو الفاظ میں کس طرح دکھالا جاسکتا ہے جن کی ترکیب میں ایمان، عشق، حرمت، شائش، ہر خواہر و برادر، اشتراک عقیدہ اور روحانی بیگانگت جیسے خاموش شامل ہیں ان دونوں نے ایک ساتھ دکھ درد جھیلے ایک ساتھ مہینیں اٹھائیں۔ ان کا عقیدہ اور ان کی سرگزشت مشترک ہے۔ یہ راہ حیات میں ایک دوسرے کے ہم سفر ہیں۔ قدم بہ قدم، لحظہ بہ لحظہ انہوں نے زندگی کا سفر ایک ساتھ طے کیا اور یہ دونوں (علیؑ و فاطمہؑ) ایک ہی سرچشمہ ہدایت و رحمت سے فیضیاب ہوئے۔

پس علیؑ خاموش کیوں ہیں۔ وہ عمر کی پچیس منزلیں طے کر چکے ہیں اور فاطمہؑ اب نو سال یا براویتے دیگر ۱۹ سال کی ہیں۔

میرے خیال میں علیؑ کی خاموشی کے اسباب واضح ہیں۔ فاطمہؑ نے خود کو پیغمبرؐ کے لیے وقف کر دیا ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنے پدر بزرگوار سے اس قدر متعلق ہیں کہ کوئی انہیں ان سے جدا نہیں کر سکتا۔ علیؑ کے لیے یہ کیسے ممکن ہو گا کہ وہ فاطمہؑ کو اس گھر سے کسی دوسرے گھر منتقل کرنے کی سبیل کر سکیں وہ انہیں محمدؐ سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ علیؑ تو خود اس باب میں اسی طرح سوچتے ہیں جس طرح فاطمہؑ، انہیں بھی پیغمبرؐ کی خدمت، دلہن ہی اور آرام رسانی کی اسی قدر فکر ہے جتنی رسولؐ کی بیٹی فاطمہؑ کو اس لیے علیؑ فاطمہؑ کو پیغمبرؐ سے طلب کرتے ہوئے چپکاے ہیں وہ خاموش ہیں۔

ناگہاں صدمہ محال بدلنے لگتی ہے۔ عالتہ خاندان پیغمبرؐ میں آج بھی ہیں پیغمبرؐ نے اپنی تمام زندگی میں پہلی اور آخری بار کسی ایسی شریک حیات کو منتخب کیا ہے جو جوان ہے اور اس کے جذبات و احساسات بھی جوان ہیں۔

فاطمہؑ کو رفتہ رفتہ یہ احساس ہو گیا کہ ان کے پدر بزرگوار کی جوان زوجہ رسولؐ کے دل میں نہ سہی مگر ان کے گھر میں خدیجہؑ اور خود فاطمہؑ کی جگہ حاصل کر رہی ہیں علیؑ کو بھی یہ احساس ہو رہا ہے کہ قدرت نے جو لمحہ مقرر کیا تھا وہ آن پہنچا

ہے۔ مگر علیؑ کے پاس مال دنیا سے کچھ نہیں ہے وہ جوان جو فاضل رسولؐ میں  
 چھوٹے سے بڑا ہوا اور جس نے اپنی نوجوانی کا تمام عہد اپنے عقیدہ اور عقیدے  
 کے لیے جہاد میں گنارا ہے جسے یہ فرصت ہی نہیں ہے کہ وہ عقیدہ اور ایمان سے  
 ہٹ کر کسی اور طرف دیکھے۔ کار دنیا کی طرف متوجہ ہو یا دولت دنیا میں سے  
 کچھ حاصل کرے۔ اس کا کل سرمایہ حیات محمدؐ اور دین محمدؐ کے لیے جذبہ نفاکاری  
 ہے اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ سرمایہ کا کیا ذکر اس کے  
 پاس تو سر چھلانے کے لیے کوئی گھر بھی نہیں ہے اور جب گھر ہی نہیں ہے تو گھر  
 کا ساز و سامان کہاں سے ہو گا۔

اس کے باوجود ایک دن علیؑ پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں ان کے  
 سامنے خاموش سر جھکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پیغمبرؐ ان کے سکوت اور شرم کی کیفیت  
 کو دیکھ کر سوال کرتے ہیں۔

اے پیغمبرؐ طالب تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟

علیؑ ایک ایسے لہجہ میں جو جبار، نرمی اور لطافت کا آمیزہ دار ہے۔ و خیر  
 رسولؐ فاطمہؑ کی خواستگاری کا اظہار کرتے ہیں۔

پیغمبرؐ اس درخواست کو سن کر بے ساختہ فرماتے ہیں

مرحبا و اہلاً (بہت خوب، خدا مبارک کرے)۔

دوسرے دن وہ مسجد میں علیؑ سے سوال کرتے ہیں۔

تمہارے پاس کچھ مال و متاع ہے۔

نہیں! اے اللہ کے رسولؐ کچھ بھی نہیں۔

وہ زہرہ جو میں نے جنگ بدر کے موقع پر تمہیں دی تھی کیا ہوئی

وہ میرے پاس ہے۔ اے اللہ کے رسولؐ

اے آؤ

علیؑ گئے اور بہ بخلت اس زہرہ کو لا کر رسولؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا اسے فروخت کر دو اور اس سے جو قیمت حاصل ہو اس سے اپنے عقد کے لیے سامان ہیا کر لو۔

عثمانؓ نے زرہ ۴۷ درہم میں خرید لی پیغمبرؐ نے اصحاب کو جمع کیا۔ قریب عقد منعقد ہوئی۔ حضورؐ نے خطبہ خود ارشاد فرمایا۔

فاطمہؓ دفتر رسولؐ کا نکاح علیؓ سے ہو گیا۔

اس کے بعد حضورؐ نے دعا فرمائی۔ پروردگار ان کو صالح ذریت عطا کر پھر خرے تقسیم کئے گئے اور اس طرح جشن عروسی کی تقریب اختتام کو پہنچی۔

فاطمہؓ اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کی سب سے چہیتی بیٹی فاطمہؓ کا مہر کیا تھا چار سو شقال چاندی اور آپؐ کے جہیز کی صورت کیا تھی۔ ایک چکی۔ ایک لکڑی کا پیالہ اور ایک اونٹ کی بیل۔

در آغاز محرم سال دوم ہجری، علیؓ بیرون شہر مدینہ، مسجد قبا کے نزدیک ایک گھر کا بند و بست کرتے ہیں اور فاطمہؓ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو کر شہر کے گھر منتقل ہو جاتی ہیں۔

سید الشہداء حمزہؓ جو مجاہدین کے سرخیل اور جو پیغمبرؐ کے چچا ہیں دو اونٹ ذبح کر کے اہل مدینہ کی دعوت کرتے ہیں۔

پیغمبرؐ نے ام سلمہؓ سے کہا کہ وہ علیؓ کے گھر تک دلہن کی ہمراہی کریں بعد ازاں بلالؓ نے عشاء کی اذان دی پیغمبرؐ نماز ادا فرماتے کے بعد علیؓ گھر تشریف لے گئے ایک برتن میں پانی طلب کیا۔ کچھ آیات قرآنی کی تلاوت فرمائی پھر حکم دیا کہ دوہا اور دلہن اس کا سہ آب میں سے پانی نوش کریں اس کے بعد آپؐ نے اس پانی سے دھو فرمایا اور ان دونوں کے سروں پر وہ پانی چھڑکا پھر جب آپؐ نے واپسی کا ارادہ فرمایا تو فاطمہؓ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر رونے لگیں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے باپ سے جدا ہو رہی تھیں۔

پیغمبرؐ نے نہایت شفقت اور محبت سے انہیں تسلی دی اور فرمایا ۔  
 میں نے تمہارا ہاتھ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دیا جو ایمان کا اعتبار  
 سے سب سے افضل ہے۔ جس کا علم سب کے علم سے زیادہ ہے۔ جس کا اخلاق  
 تمام لوگوں کے اخلاق سے بلند تر ہے اور جس کی روح تمام تر دجول سے زیادہ  
 پاکیزہ اور لطیف ہے۔

### جہدِ حیات کا نیا دور

عقد اور رخصتی کے بعد بضعۃ الرسولؐ کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔  
 لیکن تقدیر نے انسانیت کی اس عظیم ترین ہستی کے لیے اس دورِ نو کے آغاز کی نشانی  
 کے طور پر رنج و مصیبت کے نئے تحفے فراہم کئے ہیں۔

فاطمہؑ جن کی زندگی آغاز طفولیت ہی سے آلام و مصائب کا شکار رہی ہے  
 جو اپنے باپ کے گھر میں فقر و فاقہ اور تنگی کے ماحول میں پل کر جوان ہوئی ہیں اب  
 خانہ علیؑ میں منتقل ہو گئی ہیں۔ جس کا اثنا دُ دولت عشق و فقر کے سما اور کچھ نہیں  
 خانہ علیؑ میں زندگی کے آزمائشی دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ مگر یہاں فاطمہؑ پہلے  
 سے زیادہ آزمائشی حالات سے دوچار ہیں۔ یہاں بھی ان پر وہ تمام ذمہ داریاں ہیں  
 جنہیں وہ اپنے باپ کے گھر میں پورا کرتی رہی ہیں مگر اب یہ ذمہ داریاں علیؑ کے حوالے  
 سے ہیں۔ علیؑ جو چشمِ فاطمہؑ میں کل تک ایک بھائی کی حیثیت رکھتے تھے اور  
 آج ان کے رفیقِ حیات ہیں۔ فاطمہؑ اچھے طرح جانتی ہیں کہ علیؑ کی زندگی ہمیشہ اسی فقر  
 و فاقہ میں گزرے گی اس لیے کہ انہیں خدا کی راہ میں جہاد، حقوق اللہ اور  
 حقوق العباد کے علاوہ اور کسی بابے میں سوچنے کی جہلت ہی نہیں ہے وہ کبھی  
 ایسی حالت میں گھر نہیں لوٹے کہ ان کے ہاتھ خالی نہ ہوں۔ فاطمہؑ کی ذمہ داریاں  
 خانہ رسولؐ کے مقابلے میں کچھ زیادہ بڑھ گئی ہیں اب وہ خانہ علیؑ میں ہیں یہ ان کا اپنا  
 گھر ہے۔ اس گھر کے تمام مسائل کی وہ براہِ راست ذمہ دار ہیں اور ان کے شہرہ کی

کیفیت یہ ہے کہ ان کی تہی دستی ان کی خوش بختی پر غالب ہے اور وہ متاعِ حیات سے زیادہ مقصدِ حیات کے بارے میں فکر کرتے ہیں۔

فاطمہ خود چکی پیستی ہیں خود روٹی پکاتی ہیں گھر کے اندر تمام کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی ہیں۔ بارہا یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ .. باہر سے پانی بھر کر لاری علی جو فاطمہ کی عظمت و جلالت سے واقف ہیں۔ جو ہمیشہ انہیں احترام اور محبت کی نظر سے دیکھتے رہے جو اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ بچنے سے آج تک فاطمہ نے جو سختیاں جھیلی ہیں اور جو مصیبتیں اٹھائی ہیں ان کے نتیجہ میں وہ بہت کمزور اور ناتواں ہو چکی ہیں اب اپنے گھر میں انہیں اس قدر محنت اور مشقت کتنے ہوئے دیکھتے تو ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔

ایک روز علی نے سہمہ ردی اور غم گساری کے لہو میں کہا۔

”زہرا، تم اس قدر زحمت اور مشقت برداشت کرتی ہو کہ میرا دل تڑپ اٹھتا ہے خدا نے رفوحات کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بہت سے خدمت گار عطا کئے ہیں کسی دن خدمت رسولؐ میں حاضری دیکرائیں گے ایک خادم اپنے لیے طلب کر لو۔“

فاطمہؑ اپنے باپ کی خدمت میں حاضری دیتی ہیں۔

بتاؤ۔ اے میری پیاری بیٹی تمہیں کیا کام ہے

بس آپ کے سلام کے لیے آئی تھی۔

فاطمہؑ یہ کہہ کر واپس چلی گئیں۔ والہی پراں نے علیؑ سے کہا مجھے اپنے باپ

سے کوئی سوال کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہوتی ہے۔“

فاطمہؑ اور علیؑ پھر رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس

بار علیؑ نے فاطمہؑ کی طرف سے سوال کیا۔ مگر بغیر نے بلا تردد دو ٹوک جواب دیدیا

نہیں سجدہ نہیں۔ اسیرانِ جگ میں سے کسی ایک فرد کو بھی تمہیں نہیں



دے سکتا۔ اہل صفہ بھوک کا شکار ہیں اور میرے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے میں ان غلاموں کو فروخت کر کے اس سے جو رقم حاصل ہوگی وہ اہل صفہ کی شکم سیر کے لیے خرچ کروں گا۔

علیٰ اور فاطمہ پیغمبر کا یہ جواب سن کر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور خالی ہاتھ لوٹ آتے ہیں۔

رات ہو چکی ہے اور دونوں (خاوند اور بیوی) اپنے بے سرو سامان گھر میں آرام کرنے کے لیے لیٹ چکے ہیں مگر دونوں کے ذہن اسی سوال کے متعلق سوچ رہے ہیں جو آج انہوں نے پیغمبر سے کیا۔

اور پیغمبر بھی تمام دن اسی بارے میں غور فرماتے رہے کہ انہوں نے اپنی جڑ ترین ہمتوں کے سوال کا کیا جواب دیا۔

ناگہاں خانہ علی کا دروازہ باز ہوتا ہے۔ پیغمبر اندر داخل ہوتے ہیں۔ رات نہ صرف تاریک ہے بلکہ بے انتہا سرد بھی ہے اس قدر سرد کہ علیؑ اور فاطمہؑ کانپ رہے ہیں پیغمبر نے دیکھا کہ ان دونوں کے پاس سردی کے تدارک کے لیے صرف ایک معمولی سا کپڑا ہے اور وہ بھی اس قدر چھوٹا کہ اگر اس سے یہ اپنے سروں کو ڈھکیں تو پیر کھل جاتے ہیں اور اگر پیروں کو ڈھکیں تو سر کھل جاتا ہے۔

پیغمبر نے محبت بھرے لہجے میں ارشاد فرمایا

اپنی جگہ سے اٹھنے کا تکلف مت کرو۔

پھر آگے بڑھ کر فرمایا۔

کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہیں ایک ایسی چیز عطا کروں جو اس چیز سے بدرجہا بہتر ہے جس کی بابت تم نے مجھ سے سوال کیا تھا۔

اہل صفہ میں وہ مہاجر اصحاب شامل تھے جن کا مدینہ میں کوئی گھر نہیں تھا وہ مسجد نبویؐ کے چوتھے دروازے پر رات بسر کرتے تھے اصحاب صفہ کا شمار نیک اور پاکیزہ لوگوں میں ہوتا ہے اور ان میں ابوذرؓ اور سلمانؓ جیسی مستودہ صفات ہستیاں شامل تھیں۔

دونوں نہایت اشتیاق آمیز لہجہ میں پوچھتے ہیں وہ کیا چیز ہے اے اللہ کے رسولؐ۔

یہ وہ کلمات ہیں جو جبریلؑ نے مجھے بطور خاص سکھائے ہیں۔ ہر نماز کے بعد دس بار سبحان اللہ دس بار الحمد للہ اور دس بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو اور جب اپنے بستر پر سونے لیٹو تو چونتیس بار تکبیر اور تینتیس بار حمد اور تینتیس بار تسبیح پڑھا کرو فاطمہؑ نے ایک بار پھر یہ سبق حاصل کیا ایک بار پھر ایک ضرب نرم کے ذریعے جو ان کی روح کی گہرائی تک اتر گئی انہوں نے یہ دریافت کر لیا کہ "وہ فاطمہؑ ہیں"

فاطمہؑ اس سبق سے اچھی طرح واقف ہیں انہیں سمجھیں سے اس حقیقت کا احساس ہے مگر یہ ایک ایسی زبردست حقیقت ہے جسے بار بار اور مسلسل یاد دلانا ضروری ہے یہ وہ سبق ہے جس کا تعلق علم و دانش سے نہیں ہے بلکہ یہ اپنی زندگی کو بنانے (شدن) کا درس ہے۔ یہ فاطمہؑ بننے کا سبق ہے (فاطمہ شدن) یہ آسان بات نہیں ہے۔ یہ وہ امانت ہے کہ جس کے لیے بے اندازہ بلندیوں تک سفر کرنا ہو گا۔

\_\_\_\_\_ فاطمہؑ کو علیؑ کے ساتھ ساتھ گام بہ گام بلندی کی طرف سفر کرنا ہو گا۔ علیؑ کی عظمت اور ان کی آزمائش میں شریک ہونا پڑے گا۔ تاریخ آزادی و جہاد میں تاریخ انسانیت میں علیؑ کی ذمہ داری بہت عظیم اور بڑی صبر آزمایہ ہے اور فاطمہؑ اس ذمہ داری میں علیؑ کی شریک اور سہیم ہیں یہ اس زنجیر نور کی درمیانی کڑی ہیں جو ابراہیمؑ سے محمدؐ تک کے سلسلہ کو حسینؑ اور ان کی اولاد میں ہونے والے آئینہ سے مربوط کرتی ہیں یہ امام منقہ تک انسانیت کی تاریخ کو ایک لڑی میں پرونے کا ذریعہ ہیں یہ نبوت اور امامت کے ربط و اتصال کا واسطہ ہیں۔

یہ تھا فاطمہؑ کا مرتبہ اور مقام اور ان بلند مقامات کے اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت عظیم تھیں۔ مگر ان سب مراتب اور درجات کے ساتھ ہی سب سے بڑی حقیقت، حیرت انگیز اور تعجب خیز اقدار کی آئینہ دار حقیقت یہ ہے کہ فاطمہؑ کے فاطمہ ہونے (فاطمہ بودن) کی بات اس قدر بڑی اور اہم ہے کہ جو

پیغمبرؐ کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے اس "خصوصی شاگرد اور غیر معمولی معانی" کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سخت گیری کا رویہ اختیار کریں۔ آرام و سکون کا کوئی ایک لحظہ بھی ان کا مقدر نہیں بن سکتا اس لیے کہ ایسے لمحات ان کی تعمیر شخصیت فاطمہؑ کے فاطمہؑ بننے کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں یہ وہ درخت ہے جس کے لیے رنج اور محرومی آب و خاک کی حیثیت رکھتے ہیں یہ نوروحی کے سائے میں پروان چڑھتا ہے اور اس میں آزادی اور عدالت کے ثمر آتے ہیں۔ ان کی ہستی اس شجرہ طیبہ کی مانند ہے جس کی ہر شاخ اس بات پر مامور ہے کہ پردہ میثاق کی طرح آسمان سے آتش خدائی کو حاصل کر کے اسے باشدگان زمین تک پہنچاتے ہیں۔ اس نسل کا ہر فرد "اطلس حقیقی" کی طرح بار زمین اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فاطمہؑ کو مسلسل نگہداری اور تربیت کی ضرورت ہے جس طرح درخت کو ہمیشہ روشنی ہوا، اور غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی اسی طرح منصب فاطمہؑ کا تقاضا ایک مسلسل اور کبھی ختم نہ ہونے والی تربیت ہے۔

پیغمبرؐ نے اپنی بیٹی اور داماد کو بجائے خدمت گار "کلمات" تعلیم کیے تمام دنیا میں یہی وہ عجیب و غریب جوڑا ہے۔ جو اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ "کلمہ" زندگی کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے یہ پیغمبرؐ کے کلمہ عطا کرنے پر مسمو رہیں اسے اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں یہی ان کا آب و طعام ہے اور اسی کے سہارے یہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ اس کلمہ نے ان کی روح کو سیراب کر دیا ہے۔ ان کلمات کی مثال ایک ایسی بارش نور و رحمت کی سی ہے جو مسلسل برس رہی ہے اور صرف یہی دو برگزیدہ ہستیاں۔ انسانیت کے یہی بلند ترین نمونہ وہ نہال ہیں جو اپنی تشنگی کو اس سے بچھلنے کے اہل اور سزاوار ہیں وہ اس بارش نور و رحمت کو اپنے رگ دریشہ میں جذب کر رہے ہیں ان کی آب و غذا یہی ہے۔ اس رات کے سکوت میں حمد کی ندائے ناگہانی ان کے لیے گلاب نگہ حیات و رحمت کی حیثیت رکھتی تھی

گویا یہ آواز کہہ رہی ہو۔

ہلک آہم من بگوش تشنگان ہجو باراں می رسم از آسماں  
بر چراہی عاشق برآورد اضطراب ہلک آب و تشنہ دآنگاہ خواب  
اور تمام روئے زمین پر ان دونوں ہستوں سے بڑھ کر تشنہ اور عاشق

اور کون ہے۔

یہ بات بے معنی نہیں ہے کہ علیؑ نے جو مرد جہاد و عمل ہیں اور جن کی زندگی مسلسل سعی و عمل سے عبارت ہے اور جن کے لیے ذکر اور ورد محض ایک رسم و عادت یا زبانی جمع خرچ نہیں ہے اس واقعہ کے پچیس سال بعد یہ اعلان کرتے ہیں۔

”وہ خدا کی قسم جن دن سے مجھے ان کلمات کی تعلیم دی گئی ہے آج تک میں نے کبھی ان کا ورد ترک نہیں کیا۔“

لوگوں نے حیرت اور استعجاب سے پوچھا کیا صفین کی خونیں رات میں بھی علیؑ نے بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کہا۔ ہاں صفین کی اس آزمائشی اور خطرناک رات میں بھی میں اس وظیفہ سے غافل نہیں رہا اور فاطمہؑ نے بھی تمام زندگی اس سبق کو یاد رکھا یہ کلمات ان کی زندگی بن گئے ان کلمات سے ان کا تعلق اس قدر گہرا اور ہم گیر ہے کہ تسبیحات ان کے نام سے موسم ہیں۔ تسبیح فاطمہؑ

یہ وہ آسمانی کلمات ہیں جو بجائے خدمت گاران کے امروز زندگی میں ان کی مدد کرتے ہیں اور یہ وہ کلمات ہیں جنہیں، ہدیہ عروسی، کے بطور پیغمبرؐ نے اپنی بیٹی کو عطا کیا تھا۔

رسولؐ خود ان کے گھر تشریف لائے اور ان کی آمد کا مقصد محض انہی کلمات کو تعلیم فرمانا تھا انہوں نے یہ کلمات عطا کئے اور واپس چلے گئے۔

پیغمبرؐ فاطمہؑ سے جس قدر محبت کرتے تھے اسی قدر ان کی تربیت میں سختی سے کام لیتے تھے انہوں نے یہ رویہ سنتِ الہیہ سے اخذ کیا تھا۔ قرآن کا مطالعہ کرنے سے

اندازہ ہوتا ہے کہ کسی پیغمبر کی تنبیہ و انتقاد میں اس قدر شدت نہیں برقی گئی۔ جس قدر شدت پیغمبر اسلام کے ساتھ روا رکھی گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی پیغمبر خدا کے نزدیک ان کی طرح محبوب اور پسندیدہ نہیں ہے اور نہ کسی اور پیغمبر پر خلق خدا کی ہدایت کی اس قدر عظیم اور ہمہ گیر ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔

ایک روز پیغمبر حب معمول خانہ فاطمہؑ میں تشریف لائے، ناگہاں آپ کی نظر دروازے پر آ پڑا اور آپ دے کی طرف اٹھی پردہ نقش دار تھا۔ پیغمبر کے ابرو عقدہ کی حالت میں کشیدہ ہو گئے آپ نے زبان سے کچھ نہ کہا مگر فوراً واپس تشریف لے گئے فاطمہؑ اپنے باپ کے اشارہ چشم و ابرو کو خوب سمجھتی تھیں انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ رسولؐ کو کیا بات ناگوار گذری ہے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس ناگوارگی کا ازالہ کس طرح کیا جاسکتا ہے انہوں نے فوراً دروازے سے پردے کو اتارا تاکہ وہ اسے فروخت کر دیں اور اس کی قیمت دینہ کے حاجت مندوں میں خیرات فرما دیں آخر فاطمہؑ کے ساتھ اس قدر سخت اور محتاط رویہ کیوں ہے۔ زینب ابوالاعلیٰ کے گھر میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہی ہیں دوسری بہنیں رقیہؑ اور ام کلثومؑ بھی ہمیشہ عیش و مسرت کے ساتھ زندگی گذارتی رہیں پہلے فرزند ان ابولہب کے گھر میں اور اس کے بعد ان دونوں کی یکے بعد دیگرے عثمان کے ساتھ شادی ہوئی جن کا تعلق طبقہ اشراف سے تھا فاطمہؑ نے کبھی نہیں سنا کہ ان کے پدر بزرگوار نے ان کی بہنوں کو جو سن و سال ہیں ان سے کہیں زیادہ بھتیں دولت و خیرات اور دین و زینت کی وجہ سے ہرزاشی کی ہو۔

لیکن پیغمبر کالب و لہجہ اور ان کا طریق عمل فاطمہؑ کے ہاں یہی مختلف ہے اس سے ظاہر ہے کہ فاطمہؑ چشم پیغمبر میں دوسری بیٹوں سے کس قدر مختلف اور ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

”فاطمہؑ سرگرم عمل رہو۔ اللہ کی راہ میں مسلسل سعی کرو کیونکہ روز قیامت میں تمہاری مدد کرنے سے معذور ہوں۔“

دراغوز فرمائیے کہ اسلام کی یہ تعلیم اسلام کے اس تصور سے کسی قدر مختلف ہے کہ جس کا یہ ادعا ہے کہ نام حسینؑ پر بہایا جانے والا ایک قطرہ اشک آتشِ روزخ کو بجھا دیتا ہے اگر کسی شخص کے گناہ سمندر کی تمام موجوں صحرائے تمام ریت کے ذرات اور آسلاف کے تمام ستاروں سے بھی زیادہ ہوں گے تو بھی اسے بخش دیا جائے گا یا یہ کہ علیؑ کی دوستی فرد کے گناہوں کو روز قیامت نیکیوں میں بدل دے گا۔ (اس لحاظ سے وہ شخص بے عقل ہے جو اس دنیا میں گناہ نہیں کرتا اس لیے کہ قیامت میں اس کے پاس کوئی ایسا توشہ نہیں ہو گا جسے نیکیوں میں تبدیل کیا جاسکے) اور ان سب سے زیادہ مضحکہ خیز دعویٰ یہ ہے کہ بقول خدا "وعلیٰ کا دوست جنت میں جائے گا۔ اگرچہ کہ وہ میرا فرمان ہو اور علیؑ کے دشمن کا ٹھکانہ جہنم ہے اگرچہ کہ وہ میرا اطاعت گزار ہو۔"

## شفاعت

قیامت میں احتساب و عقاب کے دو مختلف ادارے نہیں ہیں عدالت الہی اور عدالت علوی کا الگ وجود نہیں ہے میرزا ان احتساب ایک ہی ہے اس میں خدا اور علیؑ کے درمیان اختلاف نہیں ہو سکتا۔ قصیدہ سحر نازک اور اس طرح کے تمام غلط تصورات سے بلند رہیں۔ پیغمبر روز قیامت، احتساب عمل کے وقت اپنی سب سے عزیز بیٹی فاطمہؑ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے فاطمہؑ کا عز و وقار و شرف خود ان کے عمل پر منحصر ہے فاطمہؑ کا دختر رسولؐ ہونا قیامت میں ان کے کسی کام نہ آسکے گا البتہ یہ رشتہ یہ پاکیزہ اور مقدس رشتہ دنیا میں ان کے کام آسکتا ہے اور وہ اس طرح کہ وہ خود کو اس منصب کا اہل بنائیں۔ فاطمہؑ حقیقی معنوں میں فاطمہؑ بن جائیں فاطمہؑ کا فاطمہؑ بننا خود ان کے اپنے عمل پر منحصر ہے ان کا دختر رسولؐ ہونا ان کے عمل کے لیے میسر اور ماحول فراہم کرنا ہے۔ شفاعت کا دراصل یہی مفہوم ہے شفاعت کا مطلب امتحان میں ناجائز ذرائع سے کسی کی مدد کرنا نہیں ہے

نہ شفاعت کا مفہوم پارٹی بازی، اقربا پروری اور خویش نوازی ہے کہ جس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عدل الہی کے تقاضوں کی نفی کی جا سکے یہ کیسے ممکن ہے کہ عدل الہی کے تقاضوں کو رد کر کے کسی کے نامہ اعمال کو بدلایا جاسکے یا کسی کو کسی چور دروازے سے داخل بہشت کیا جاسکے۔

فاطمہؑ سے بڑھ کر اس حقیقت کو کون سمجھ سکتا ہے انہیں یہ حقیقت خود پیغمبرؐ نے تعلیم فرمائی اور پیغمبرؐ نے یہ بات نہ صرف انہیں بتائی بلکہ ہر شخص کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ شفاعت کا وہ تصور جو حساب، کتاب اور مسئولیت کے اس شعور کو ہی درہم برہم کر دے جو مذہب کی اساس اور بنیاد ہے دراصل عہد جاہلیت اور بت پرستی کی طرز فکر کا عکس ہے مشرکین بتوں کو پیش خدا اپنا شفیع (شفاعہ نامہ اللہ) سمجھتے تھے۔ وہ ہر طرح کے گناہ اور برائی کے کام کرتے تھے لیکن لات و عزریٰ اور منات جیسے بڑے بتوں اور دیگر چھوٹے امانام کے سامنے قربانی پیش کر کے اور ان کی مدد و شفاء اور خوشامد کر کے وہ ان سے اپنے لیے شفاعت طلب کر لیتے تھے اس طرح ان کا خیال تھا کہ یہ بت ان کے گناہوں کو بخشوا دیں گے۔ ان کے شفیع بن جائیں گے۔

میں نہ صرف پیغمبرؐ کے شفیع ہونے کا قائل ہوں بلکہ میں شفاعت امام و معصوم حتیٰ کہ شفاعت ملہا اور مجاہدین بزرگ کا بھی اعتقاد رکھتا ہوں مگر آپ میری بات کو بغور سمجھنے کی کوشش فرمائیے۔ میرا ایمان ہے کہ تربت حسینؑ کی خاک پلک بھی گنہگاروں کی بخشش کا سبب بن سکتی ہے مگر وہ اس طرح کہ انسان اس خاک پلک کی زیارت اس انداز سے کرے کہ اس کی دوح اور اس کی فکر میں ایک تبدیلی اور انقلاب برپا ہو سکے۔ وہ حسینؑ جیسے مثالی انسان اور ان کے معیار فکر و ایمان پر غور کرے اور اس کے حوالے سے اپنی شخصیت کی اصلاح اور تعمیر کرے اس طرح انسان کی تمام شخصیت بدل جاتی ہے اس کے باطن میں ایک انقلاب رونما ہو جاتا ہے امام حسینؑ سے انسان کا تعلق اسے ہر طرح کے صنف، خوف، طمع اور ہوس، بت پرستی، شخصیت پرستی دولت اور طاقت پرستی سے نجات دلاتا ہے اسے دین کی حقیقی معرفت عطا کرتا ہے انسانی

فضیلت کے تصور سے روشناس کرنا ہے اس کو ایک ایسا فلسفہ حیات عطا کرتا ہے جس کی روح جہاد صبرا خلاص ہے۔

یہ تعلق انسان کو بلند اقدار سے متعارف کرتا ہے اس میں انسانیت کی حقیقی روح کو بیدار کرتا ہے۔ انسان کے ارادہ طبعیت اور عادت کی وہ کمزوریاں جو بائی اور گناہ کی جڑ ہیں ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے امام حسینؑ کی یاد ان سے تعلق انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنادیتا ہے ایک مکمل اور برگزیدہ انسان اور یہ اس مہورت میں ہوتا ہے جب اس کی ماہیت ہی تبدیل ہو جاتی ہے اس کے قلب و روح میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے وہ باطنی طور پر ایک نیا انسان بن جاتا ہے اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی وہ خطائیں اور گناہ جن کا وہ ماضی میں ارتکاب کر چکا ہے محض ماضی کا قصہ بن جاتے ہیں اس کا حال اور مستقبل ان لغزشوں سے پاک ہو جاتا ہے وہ جیسا ماضی میں تھا اب ویسا نہیں ہے اب وہ ایک دوسرا اور نیا انسان ہے۔ گویا شفاعت انسان میں تبدیلی کے عمل کا قرینہ ہے یہ انسان کی قلب ماہیت کا نام ہے۔

جو جہاد کر بلا کا ایک ہیرو ہے امام حسینؑ کی شفاعت کے سبب حاکمانِ جور و مہلات کی غلامی کے دوزخ سے آزاد ہو کر محض چند گام کی مسافت میں انسانیت آزادی اور حقیقت کی بلند ترین جوئیں تک پہنچ جاتا ہے۔

اور فاطمہؑ شفاعت پیغمبرؐ کے ذریعہ فاطمہؑ بن سکیں اسلام میں شفاعت وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان خود کو نجات کا اہل بنا سکتا ہے۔ یہ عامل کسبِ نالستگی نجات ہے وسیلہ نجات نالاستہ نہیں ہے یعنی یہ ان لوگوں کے لئے جو خود کو نجات کا اہل نہیں بنا سکتے نجات کا وسیلہ نہیں ہے یہ انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ شفیع کی شفاعت سے اکتسابِ فیض کر کے اس کے ذریعے اپنی اصلاح کرے خود اپنے آپ کو شالستہ نجات بنائے یعنی اپنی سرشت کو اس طرح بدلے کہ اس کی سرنشت میں تبدیلی واقع ہو سکے بے شک انسان اپنی تقدیر اپنے عمل سے بنا رہا ہے وہ شفیع سے حسنِ عمل کا



معیار اور اتداری کسب کرتا ہے شفیق فرد کو خود سے کچھ نہیں عطا کرتا۔ اس کے برعکس فرد خود شفیق سے اکتساب فیض کرتا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو گناہ گار ہو جو حسنِ عمل کے اعتبار سے بے وقعت ہو کسی ترکیب سے کسی کی مدد سے قیامت میں پل صراط سے نہیں گذر سکتا۔ کوئی شخص اس پل کو پار نہیں کر سکتا جب تک کہ اس نے اس دنیا میں جو میدان سعی و عمل ہے اور جو رزم خیر و شر کا میدان ہے۔ صراط پر سے گزرنے کا فن نہ سیکھا ہو شفیق اس فن کو سکھانے والا ہے وہ معلم راہِ نجات ہے اس کو پارٹی نہیں سمجھنا چاہیے وہ خیانت کاروں اور گنہ گاروں کا رفیق و شریک نہیں حسین انسانیت کے شفیق ہیں ان معنوں میں کہ ان سے عشق و ایمان کا تعلق ... ان کی یاد اور ان کا تذکرہ انسان کو محابہ بناتا ہے ایک ایسا محابہ جو ان کے نقشبند قدم پر چل کر جبلِ او ظلم کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ جبر و تشدد کے خلاف سرگرم عمل ہوتا ہے وگرنہ اگر انسان جہالت کی راہوں میں خود کو گم کر دے اور زندگی کی عارضی اور ظاہری لذتوں میں بھنس کر فریضہ جہاد سے غافل ہو جائے تو پھر امام حسینؑ کی یاد میں اس کا گریہ اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔ اشکِ عزیز اکوئی ایسا کیسیا فی یا تیزابی اثر نہیں رکھتا۔ جو غفلت زدہ انسان کے گناہوں کو دھو دے اس سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے شعور و وجدان پر اس کا اثر نہ پڑے اور جب انسان کا شعور غمِ حسینؑ سے متاثر ہوگا تو اس کی سرشت بھی بدل جائے گی اور سرِ نوشت بھی تبدیل ہو جائے گی۔

”فاطمہؑ راہِ عمل میں سچی کرو کہ میں قیامت میں تمہارے کسی کام نہیں آسکوں گا۔“

فاطمہؑ کی مثال محمدؐ کی سی ہے عدالتِ خدا کے نظام اور اسلام کے قانون سے خود محمدؐ بھی مستثنیٰ نہیں ... وہ بھی مقامِ مسؤلیت میں ہیں بلکہ ان کی مسؤلیت سب سے زیادہ سنگین ہے انہیں ہر قدم اور ہر سخن کے لیے جو ابد ہی کرنی بنے اپنے معمولی سے معمولی قول و فعل کا حساب پیش کرنا ہے۔ یہی ہو تو محال فاطمہؑ کے ساتھ ہے۔

ایک دفعہ ایک قریشی عورت نے جو اسلام قبول کر چکی تھی چوری کے جرم کا ارمکاب کیا۔ جب یہ قصہ پیغمبرؐ تک پہنچا تو آپؐ نے فرمایا کہ

اس کے ہاتھ قطع کر دو۔ بہت سے لوگوں کے دل اس عورت کے لیے غمزہ تھے قریش ایک معزز قبیلہ تھا۔ عرب کا سب سے معزز اور دولت مند قبیلہ اس قبیلہ کی کسی عورت پر صد جاری ہونا بجزری کے حرم میں اس کے ہاتھ قطع ہونا تمام قبیلہ کے لیے بے عزتی کی بات تھی یہ ایک ایسا کلنک کا ٹیکہ تھا جس کا داغ کبھی چھڑایا نہیں جاسکے گا۔ لوگوں نے چاہا فاطمہؑ اس بارے میں مداخلت کریں خدا کے حکم کے خلاف اس عورت کی شفاعت کریں۔ آپؐ نے صاف انکار کر دیا۔ پھر لوگ اسامہؓ کے پاس گئے اسامہؓ زیدؓ کے بیٹے تھے جنہیں رسولؐ نے اپنا منہ لولا فرزند بنایا تھا۔ حضورؐ زیدؓ اور ان کے بیٹے اسامہؓ دونوں کو بہت دوست رکھتے تھے اور آپؐ کو ان سے محبت اور شفقت کا خصوصی تعلق تھا۔ اسامہؓ سے حضورؐ کی محبت اور شفقت ناراضی میں ایک معلوم حقیقت ہے اسی طرح ہم اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ اسامہؓ اور ان کے باپ زیدؓ جو پہلے جناب خدیجہؓ کے غلام تھے اور پھر حضورؐ کی غلامی میں آگئے تھے اپنی جان نثاری اور وفاداری کا اعتبار سے میزا اور ممتاز تھے اس لیے منظر کے ساتھ اسامہؓ نے قریش کی جانب سے اور خود اپنی طرف سے خدمت پیغمبرؐ میں درخواست کی کہ اس زن قریش کے گناہ کو نظر انداز فرما دیں اسامہؓ نے ایک مجرم عورت کی شفاعت کی لیکن حضورؐ نے نہایت دو ٹوک اور تہدید آمیز لہجہ میں جواب فرمایا۔

”اسامہؓ مجھ سے اس بارے میں ایک حرف بھی نہ کہو جب تک قانون میرے ہاتھ میں ہے کسی کے لیے اس قانون سے فراہمکن نہیں ہے اگر اس عورت کی جگہ میری بیٹی فاطمہؑ بھی ہوتی تو اس کو بھی صاف نہ کیا جاتا۔“

آخر کیوں حضورؐ نے اپنے تمام رشتہ داروں میں صرف اپنی بیٹی کا ذکر کیا اور اس میں بھی خصوصیت سے فاطمہؑ کا نام لیا۔ ان سوالوں کا جواب صاف ہے اور بالکل واضح اور روشن ہے۔

جب حضورؐ نے دعوتِ ذوالعشرہ میں خطاب فرمایا تو اس وقت بھی اپنے

تمام عزیزوں اپنے تمام اہل خاندان میں اپنی تمام بیٹیوں میں آپ نے بالخصوص فاطمہ کا انتخاب کیا حالانکہ وہ سب کُن تھیں مگر وہ اسلام کی دعوتِ عظیم کی خصوصی مخاطب قرار پائیں۔

حضور کی دامنِ حدیث کے مطابق فاطمہ تمام دنیا کی عورتوں میں چار عورتوں کو ممتاز کیا گیا ان میں سے ایک ہیں۔ تمام تاریخِ انسانیت میں سب سے محترم اور منتخب عورتیں چار ہیں۔ مریمؑ، آسیہؑ، خدیجہؑ اور فاطمہؑ اس فہرست میں فاطمہ کا نام سب سے آخر میں ہے۔ کیوں؟ ایسا کیوں ہے کہ یہ نام سب سے آخر میں لیا گیا۔

حضور خود تمام مروجات کے کمال کی آخری حد ہیں وہ اولین و آخرین ہیں تاریخ کے تمام ادوار میں انسانیت کے کمال کی آخری منزل ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ سلسلہٴ انبیاء کی آخری کڑی ہیں۔

اور فاطمہؑ دنیا کی ثانی عورتوں میں سب سے آخری اور سب سے افضل نمونہ ہیں۔

✽ مریمؑ کی تمام قدر و قیمت عیسیٰؑ کے حوالے سے ہے کہ وہ ان کی والدہ اور ان کی پرورش کنندہ ہیں۔

✽ آسیہؑ دُزنِ فرعون کی تمام قدر و قیمت موسیٰؑ کے حوالے سے ہے کہ انہوں نے ان کو پالا اور ان کی مدد کی۔

✽ جنابِ خدیجہؑ کی عظمت دو حوالوں سے ہے وہ زوجہٴ رسولؐ ہیں انہوں نے حضورؐ کی عم گساری فرمائی اور وہ مادرِ فاطمہؑ ہیں انہوں نے فاطمہؑ کی پرورش کی۔ اور فاطمہؑ کی عظمت کا حوالہ کیا ہے؟ ان کی قدر و قیمت کس نسبت سے تعین ہوتی ہے عقل حیران ہے کہ کیا کہے۔

یہ عظمت خدیجہؑ کی نسبت سے ہے؟ محمدؐ کی نسبت سے ہے؟ علیؑ کی نسبت سے ہے؟ حنینؑ کی نسبت سے ہے؟ زینبؑ کی نسبت سے؟ یا خود ان کی اپنی نسبت سے؟

علیؑ اور فاطمہؑ اب یرون شہر ایک ایسے گھر میں مقیم ہیں جو شہری زندگی کی پہلی پہل سے دور قریہ قبار میں واقع ہے یہ مقام مدینہ سے ۸ کلومیٹر درجنوب کی طرف ہے یہیں وہ مسجد ہے جسے مسجد قبار کہتے ہیں۔ خانہ علیؑ و فاطمہؑ اس مسجد سے متصل ہے اس جگہ کی اہمیت یہ ہے کہ جب پیغمبرؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو مدینہ میں داخل ہونے سے قبل ایک ہفتہ اس جگہ قیام فرمایا۔ علیؑ جو مکہ سے رسولؐ کی ہجرت کے تین دن بعد روانہ ہوئے آپؐ سے اسی مقام پر آکر ملے۔ اس کے بعد رسولؐ اسی جگہ سے روانہ ہو کر پہلی بار مدینہ کی سرزمین پر وارد ہوئے اور مدینہ کی آزاد فضاؤں میں اسلام کی آزادی اور ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہیں پیغمبرؐ نے مسجد کی بنیاد رکھی مسجد نبویؐ جو خانہ خدا بھی ہے اور خانہ مردم بھی۔

عجیب اور حین اتفاق ہے کہ علیؑ و فاطمہؑ اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز کے وقت پھر مدینہ سے قبار کی طرف لوٹے اور ایک مدت تک اس گھر میں رہے جو مسجد قبار کے پہلو میں واقع ہے مسجد قبار وہ پہلی مسجد ہے جسے پیغمبرؐ اسلام نے بنایا اور اسی مسجد کے کنارے علیؑ و فاطمہؑ نے اپنے گھر کی اس گھر کی جو ”خانہ عترت“ ہے بنیاد رکھی اور یہیں سے اسلام کی اس نئی تاریخ کا آغاز ہوا جس کے مؤسس علیؑ اور فاطمہؑ ہیں اس کے بعد وہ مدینہ واپس آئے اور مسجد نبویؐ کے احاطہ میں ایک ایسے گھر میں مقیم ہوئے جس کی دیوار خانہ پیغمبرؐ کی دیوار سے متصل تھی اسلام کی تاریخ اور علیؑ اور فاطمہؑ کی تاریخ حیات کے آغاز میں یہ ہم آہنگی اور مطابقت ہے کہ جس کو وہ صاحبان نظر اچھی طرح سمجھتے ہیں جو اسلام اور تشیع حقیقی کے تطابق کو پہچانتے ہیں اور جو مسجد نبویؑ اور خانہ نبویؑ کے باہمی اور معنوی تعلق سے باخبر ہیں بصورت دیگر لوگوں کے لیے یہ تطابق اور یکسانیت حیرت اور استحباب کا سبب بنتی ہے پیغمبرؐ پر علیؑ اور فاطمہؑ کی دوری شاق ہے وہ انہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتے علیؑ بچپن سے ان کے گھر میں ان کے ساتھ رہے ہیں۔

مگر اب یہ دونوں جو بعیت رسولؐ کی روح ہیں ان سے دور بیرون شہر قبا کے مقام پر سختی اور فقر کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر اس فقر و فاقہ کے باوجود ان کا جذبہ عشق و ایمان ان کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے، علیؑ آغاز طفولیت ہی سے سختی، تنہائی اور تنگدستی کا شکار رہے پھر ان کی زندگی جہاد و کشمکش، ریاضت اور روحانیت کا مرقع رہی مگر میں انہوں نے دشمنان اسلام کی مخالفت کو برداشت کیا اور ہر طرح کے آزمائشی مراحل سے صبر و تحمل کے ساتھ گزرے۔ ان کی جوانی حتیٰ کہ بچپن راہ اسلام میں جہاد کے لیے وقف رہا۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھے جو دوسروں سے بہت مختلف تھے۔ ان کی روح پارسائی اور خدا ترسی کے عناصر سے مرکب تھی انہیں نگہ کی بات سوچنے کا موقع تھا اور نہ وہ زندگی کی لذت، دولت اور راحت کے متعلق فکر کرتے تھے ان کی زندگی محض تلمی کے ذائقہ سے آشنا تھی۔ ان کی روح رنج اور مصیبت کے چمٹے سے سیراب تھی وہ خلوت و ریاضت و تفکر کے ساتھ ہی سعی و عمل اور کشمکش و جہاد کے غور کرتے تھے۔

اور جہاں تک فاطمہؑ کا تعلق ہے تو ان کی پوری زندگی مصیبت کشمکش اور فقر کا مرقع تھی انہوں نے اپنے باپ اپنی ماں اور اپنے گھر کے دکھاوے میں اللہ کا ہاتھ بٹایا اور وہ خود اور ان کے ہمراہ علیؑ جو اس وقت ان کے بھائی کی جگہ تھے مگر تمام زندگی میں شدائد و مصائب کا شکار رہے ان حالات نے ان کے قلب و روح پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ جہانی سادگی کے اعتبار سے ضعیف اور بے حد حساس تھیں ان کا دل بہت نرم تھا اور وہ لڑکی کی تکلیف کو پوری شدت سے محسوس کرتی تھیں اور اب خانہ علیؑ میں بھی وہ خود ہر طرح کے مصائب و شدائد فقر و ریاضت کے ماحول کو بخوشی قبول کئے ہوئے ہیں نہ علیؑ وہ شخص ہیں جو اس گھر کو عام گھروں کا نمونہ بنا سکیں اور اس میں ایسی دلچسپی لیں جو جوانی کے جذبات اور فحاشی زندگی کی دلچسپیوں سے عبارت ہو اور نہ فاطمہؑ ہی کو یہ پسند ہے کہ وہ اس گھر کی فضا کو ان گھروں کی فضا کی طرح بنادیں جن میں نئے شادی شدہ جوڑے اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں یہ گھر بھی عام گھروں سے مختلف ہے اور ان دونوں شخصیتوں کا مزاج اور معیار بھی سب سے جدا اور منفرد

ہے۔ فاطمہؑ اس بات کو پسند نہیں کرتیں کہ وہ علیؑ کو آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں کی طرف کھینچ لیں اور انہیں اپنی باطنی اور روحانی دنیا سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیں۔ صرف اور صرف پیغمبرؐ وہ شخصیت ہیں جن کی محبت، شفقت اور جبرئیل کے کلمات اس گھر میں روشنی، امید اور مسرت کی لہریں بکھرتے ہیں اور اپنی ان دونوں عزیز ہستیوں کو ساغر مسرت و شادمانی سے سیراب کرتے ہیں۔

پیغمبرؐ اس بات سے بھی بڑی آگاہ ہیں کہ اس خاندان کو ان کے لطف و محبت کی کسی قدر ضرورت ہے دراصل کی زندگی کا تمام سرمایہ ہی عشقِ رسولؐ ہے اور پیغمبرؐ اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ ”جو کوئی انہیں دوست رکھتا ہے پھر اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں رہتی اس کے لیے محبتِ رسولؐ بجائے خود ایک زندگی ہے“

اس احساس کے تحت پیغمبرؐ فاطمہؑ اور علیؑ کو اپنے قریب بلا لیتے ہیں۔ مسجد نبویؐ کے احاطہ میں رسولؐ کے گھر سے متصل ان کے لیے ایک گھر تعمیر کیا جاتا ہے اس گھر کی تعمیر بیتِ رسولؐ کے نمونہ پر کی گئی ہے۔ اسے کھجور کی شاخوں اور پتیوں سے بنایا گیا ہے خانہٴ رسولؐ اور خانہٴ علیؑ میں دو کھڑکیاں ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل کھلتی ہیں۔ اور یہ گھروں کی کھڑکیاں، گویا دلوں کے درپچے ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل باز ہوتے ہیں ایک تلب پدر اور دوسرا قلبِ دختر۔ موزنین نے لکھا ہے کہ پیغمبرؐ ہر روز بلا استثناء اپنے گھر کی کھڑکی کھول کر اپنی دختر کی غیریت معلوم کرتے تھے اور ان پر سلام کرتے تھے۔

ایسا کیوں تھا کہ تمام اصحاب، تمام اقارب و اعزاء یہاں تک کہ تمام بیٹیاں میں صرف فاطمہؑ کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ان کا گھر احاطہٴ مسجد میں ہے اور اس کی دیوار خانہٴ پیغمبرؐ کی دیوار سے اس طرح ملتی ہوئی ہے گویا کہ دونوں گھر ایک ہی ہیں اور حقیقت میں یہ دونوں گھر ایک ہی تھے خانہٴ محمدؐ، خانہٴ فاطمہؑ ہے جسے خانوادہٴ محمدؐ کہتے ہیں یہ وہی خاندان ہے جس میں باپ علیؑ ہیں۔ ماں فاطمہؑ ہیں، پسر حسینؑ ہیں اور بیٹی زینبؑ اور ام کلثومؑ ہیں۔

عزت و اہل بیت جن کا قرآن و حدیث میں بار بار اور بڑی اہمیت اور خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہی خاندانہ ہے یہی وہ گھر ہے جسے ہر طرح کے رجز سے پاک کیا گیا ہے اور یہی وہ اہل بیت ہیں جنہیں عصمت کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ یہی وہ "عزت" اور "اہل بیت" ہیں جنہیں ہر دو بار ہر زمانے میں قرآن کے ساتھ ساتھ انسانوں کی ہدایت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ جو کوئی اس گھر کی عظمت کا معترف ہے وہ مستحلال اور بخت کی مزدورت سے بے نیاز ہے۔ بغرض محال اگر اس خاندانہ کی نفی صحت میں کوئی روایت نہ بھی ہو تو بھی انسان کی عقل اس کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے۔

مدینہ میں خاندانہ عائشہ سے متصل اس گھر کی بنیاد رکھی جا چکی ہے اب اس گھر میں بہاروں کا دور دورہ ہے۔ علیؑ اور فاطمہؑ کے شجر اتصال میں بے مثل و بے نظیر ثمر آ رہے ہیں پے پے پے پے پھول کھل رہے ہیں ان پھولوں کے نام ہیں۔

حسنؑ، حسینؑ، زینبؑ اور ام کلثومؑ

ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو چکا ہے ان ستاروں کے طلوع ہونے سے نئے افق روشن ہو رہے ہیں۔

یہ محمدؐ کے لیے معنی حیات ہیں اسلام کے لیے دلیل ہدایت ہیں اور انسانیت کے لیے یہ کیا کچھ نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ ہیں۔ ہجرت کے تیسرے سال عقد کے ایک سال اور کچھ مہینے بعد حسنؑ کی ولادت ہوئی۔

پینچتر جن دن کا ایک مدت سے انتظار کر رہے تھے وہ دن آن پہنچا انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ مدینہ میں حبشی کا سماں ہے بلشت کے بعد ۶ سالہ دور کا ہر لمحہ تلخی اور مصیبت کا لمحہ تھا دشمنوں کی ایذا رسانی دوستوں کی تکالیف اور خود اپنی اور اپنے اہل خاندان کی مصیبتوں نے پیغمبرؐ کی زندگی کو تلخ کر دکھا تھا کسی طرف سے کوئی اچھی خبر سننے میں نہیں آتی تھی۔ اس ۶ سالہ آزمائشی دور کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ جب رسولؐ کو کوئی اچھی خبر ملی ہے جب آپؐ نے شیرینی حیات کا ذائقہ چکھا ہے۔ ولادت حسنؑ کی خوشخبری آپؐ کی خشکی احساس کے لیے نازکی کا پیغام تھی۔ و خود اشتیاق و مسرت کے عالم

میں حضور خانہ فاطمہ میں تشریف لاتے ہیں علیؑ اور فاطمہؑ کے باغ کے پہلے شجر کو اپنی آغوش کی زینت بناتے ہیں ان کے کان میں اذان و اقامت کہتے ہیں اور پھر ان کے سر کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات فرماتے تھے پھر ایک سال اور گذرا تو حسینؑ اس دنیا میں تشریف لائے۔

اب پیغمبرؐ کے دو بیٹے ہو گئے۔ حسنؑ اور حسینؑ

تقدیر کو یہی منظور تھا کہ رسولؐ کے صلیبی فرزند، ان کے دونوں بیٹے قاسم اور طاہر زندہ نہ رہ سکیں اس لیے کہ دراصل فاطمہؑ کے بیٹوں کو پھر ان رسولؐ قرار دیا گیا ہے۔ رسولؐ کے بیٹے فاطمہؑ کے نور ہائے نظر ہیں۔

پیغمبرؐ کی نسل کی بقا و امان کی بیٹی یعنی فاطمہؑ پر منحصر ہے۔ فاطمہؑ جو فاطمہؑ ہیں اور علیؑ بھی اس سلسلہ سے جدا نہیں ہے۔

معنوی اعتبار سے علیؑ محمدؐ کا تسلسل ہیں اور روحانی اعتبار سے علیؑ محمدؐ کے وارث ہیں۔

اور نسلی تسلسل کے اعتبار سے علیؑ، نسل محمدؐ کے تسلسل کی علامت اور اس کا وسیلہ ہیں۔ یہ دونوں مبارک ہستیاں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط و متحد ہیں کہ ذریت محمدؑ ذریت علیؑ ہے اور ذریت علیؑ ذریت محمدؑ ہے ان دونوں کی حقیقت ایک ہے۔ ان دونوں کا نور ایک ہے اور ان دونوں کی نسل ایک ہے اور حسنؑ اور حسینؑ کے معصوم چہروں سے یہ حقیقت نورانی پوری طرح آشکار ہے۔ محمدؑ ان دونوں بچوں کے معصوم چہروں میں تین مبارک ہستیوں کو جلوہ گر دیکھ رہے ہیں۔

علیؑ کو، فاطمہؑ کو اور خود کو

تقدیر نے ان دونوں کو خود حضورؐ کے دونوں بیٹوں کا نعم البدل قرار دیا ہے اور یہ دونوں علیؑ اور فاطمہؑ کے باغ کے شجر ہیں۔ فاطمہؑ ام ایہا ہیں انہوں نے اپنے باپ سے بے مثل محبت کی ہے اور حضورؐ کو بھی وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں ہر شخص جانتا ہے اور اس بات کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے کہ فاطمہؑ حضورؐ کی سب



سے چھوٹی اور سب سے چھیتی بیٹی ہیں۔ یہ حضور کو سب سے زیادہ محبوب ہیں علی  
سے بھی زیادہ۔

اور علیؑ۔

چشم رسولؐ میں ان کے بیٹے کی طرح عزیز ہیں رسولؐ نے انہیں پالا ہے۔  
یہ ان کے بھائی ہیں اور انہیں فاطمہؑ سے زیادہ عزیز ہیں۔ علیؑ اور محمدؐ میں محبت اور  
یگانگت کی نسبتیں بے شمار ہیں دونوں عبدالمطلبؑ کی اولاد ہیں مادر علیؑ نے رسولؐ کو اس  
وقت سے جب وہ صرف آٹھ سال کے تھے ہمیشہ ماں کی طرح پرورش کیا۔ علیؑ کے پیدائش کا رابلوطا  
نے اپنے یتیم بھتیجے کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی وہ رسولؐ کے لیے مثل باپ کے تھے محمدؐ  
آٹھ سال کے سن سے وہ ہر سال کی عمر تک خانہ علیؑ میں پلے بڑھے اسی طرح علیؑ بچپن ہی سے محمدؐ  
کے گھر میں رہے اور اسی گھر میں پل کر جوان ہوئے یہاں تک کہ ان کا سن پچیس برس کا ہوا  
خدیجہ ان کے لیے بجاتے ماں تھیں اور رسولؐ مثل پدر۔

ان روابط میں کس قدر مشابہت اور یکسانیت ہے حالات ایک دوسرے سے  
کس طرح مطابقت رکھتے ہیں۔

ان دونوں ہستیوں کی سرنوشت میں کس قدر مطابقت ہے۔

دونوں ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

گویا ایک روح اور دو قالب ہیں۔

علیؑ پیغمبرؐ کی دعوت اسلام قبول کرنے والے پہلے شخص ہیں۔ یہ وہ پہلے انسان  
ہیں جنہوں نے عالم عزت و تنہائی میں پیغمبرؐ کی آواز پر لبیک کہا۔ ان کی نصرت کا عہد کیا  
اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس دن سے جب تک زندہ رہے تمام خطرات کا مرنا  
وارقہا بل کیا۔ تمام زندگی خطرات اور مشکلات کے حصار میں گذاری مگر ہمیشہ اپنے عہد  
نصرت رسولؐ پر ثابت قدم رہے۔

بعثت سے قبل بھی علیؑ اگرچہ کہ بہت چھوٹے تھے وہ جلوت و غلوت میں ہمیشہ محمدؐ  
کے ساتھ دیکھے جاتے تھے اس دور میں حضورؐ جب فارحرا میں قیام فرماتے تو علیؑ ان کے ساتھ

ہوتے اور ان کے گہرے اضطراب، تفکر... اور غیر معمولی عبادت و ریاضت کو دیکھا کرتے  
جزیرہ نما عرب کے چاند نے بار بار یہ منظر دیکھا ہے کہ بشت شروع ہونے سے قبل  
ماہ رمضان میں کوہ حرا کی بلندی پر رات کی گہری اور پراسرار خاموشی میں ایک عظیم انسان کبھی  
کسی پتھر کے سہارے بیٹھ جاتا ہے کبھی آہستہ آہستہ ٹہلنے لگتا ہے۔ کبھی یوں سر جھکا لیتا ہے  
جیسے الہام کی بارش اس پر راز ہائے سربستہ کھول رہی ہو۔ کبھی آسمان کی طرف سر بلند کرتا  
ہے۔ جیسے نامعلوم حقیقتوں کے بحرِ نیا پیدا کنار کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہو۔  
جیسے اسے کسی عظیم خبر کا انتظار ہو۔ جیسے وہ ان چیزوں کا مشاہدہ کر رہا ہو جن کی ابھی  
نیک کسی کو خبر نہیں دی گئی اور ان تمام حالات و کیفیات کے دوران ایک بچہ سائے  
کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ہے کبھی اس کے دوش پر اور کبھی اس کے پہلو میں

اور یہ بچہ جب آٹھ یا دس سال کا تھا تو ایک روز رات کو یہ اس حجرہ میں گیا  
جہاں محمدؐ اور حضرت یوسفؑ بیٹے تھے۔ محمدؐ اور حضرت یوسفؑ جو اس کے لیے مثل باپ اور ماں کے تھے  
دیکھا کہ دونوں کبھی سیدہ کرتے ہیں کبھی بیٹھ جاتے ہیں کبھی اٹھ کر کھڑے ہو  
جاتے ہیں اور ان تمام حالتوں میں زیر لب کچھ پڑھ رہے ہیں دونوں نے اس کی طرف کوئی  
توجہ نہیں کی پھر جب وہ اپنے اس کام سے فارغ ہوئے تو بچے نے حیرت سے پوچھا آپ  
یہ کیا کر رہے تھے۔ پیغمبرؐ نے جواب میں فرمایا:

ہم نماز ادا کر رہے تھے مجھے پروردگار نے مبعوث بہ رسالت کیا ہے میں اس  
کام پر آمادہ ہوں کہ لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچاؤں اور انہیں اپنے پروردگار کی  
وصایت اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دوں اے علیؑ میں تمہیں بھی اس  
دین کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں:

علیؑ اگرچہ ابھی بچے ہیں۔ کم سن ہیں حالانکہ خاندانِ محمدؐ میں قیام پذیر ہیں حالانکہ  
ان کی محبت میں عرق ہیں اور دل و جان سے ان کی بزرگی کے قائل ہیں مگر علیؑ پھر  
علیؑ ہیں۔

وہ بے سوچے سمجھے ہاں نہیں کہتے وہ اپنی عقل کے ذریعے ایمان کو قبول کرتے

ہیں۔ پھر یہ ایمان عقل سے ان کے دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے اس لیے علیؑ بلا غور و تامل اس دعوت پر لبیک نہیں کہتے وہ اپنے سن و سال کی مناسبت سے ایک سادہ سی بات کہتے ہیں۔

”احانت دیجئے کہ میں آپؐ کی دعوت کے بارے میں اپنے والد (البرطانیہ) سے مشورہ کروں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان سے ضرور رائے لینی چاہیے۔“

یہ کہ کردہ حجرہ رسولؐ سے رخصت ہو جاتے ہیں اور اپنے سونے کے کمرے میں والپل آجاتے ہیں۔

مگر یہ دعوت، ایسی دعوت نہیں ہے جو علیؑ کو باوجودیکہ ان کا سن صرف آٹھ یا دس سال کا ہے، آرام سے سونے دے وہ تمام رات اس بارے میں غور و فکر کرتے رہے ان کی وہ تمام رات اسی فکر و اندیشہ میں بسر ہوئی؟

اس رات علیؑ کا دل و دماغ کس قسم کے خیالات کی آماجگاہ رہا اس بارے میں کوئی شخص کیا کہہ سکتا ہے۔ ہاں جب صبح ہوئی تو نہایت اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے خدمت پیغمبرؐ میں حاضر ہوئے اور ایک ایسے لہجہ میں جس میں لطف کی شیرینی کے ساتھ عزم و اعتماد کا حسن بھی تھا انہوں نے کہا۔

میں نے گزشتہ شب آپؐ کی دعوت کے بارے میں بہت غور کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ خدا نے مجھے پیدا کرتے وقت میرے باپ (البرطانیہ) سے مشورہ نہیں کیا۔ لہذا

مجھے بھی اپنے خدا کے دین کو قبول کرنے کے لیے اپنے والد کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپؐ کی دعوت قبول کرتا ہوں۔ آپؐ مجھے اسلام کے بارے میں تفصیل سے بتائیے

پس پیغمبرؐ ارشاد فرماتے رہے اور علیؑ ان ارشادات کی تصدیق کرتے رہے اور اس تاریخی لمحہ کے بعد ان کی زندگی کا ہر لمحہ اسی عہد کی تصدیق، خدا کی عبادت رسولؐ

کی خدمت اور نصرت، خلق خدا کی بھلائی اور اپنی روح کے تزکیہ کے لیے وقف رہا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ خدمت اسلام کی ایک بے مثال نشانی بن گیا۔ ان کے اور رسولؐ

کے درمیان صمد با ظاہری اور باطنی، فکری، قلبی، اور روحانی رشتے تھے محمدؐ اور علیؑ کے درمیان جو محبت اور تعلق تھا اس سے سبھی لوگ واقف تھے اور خود علیؑ سب سے زیادہ اس حقیقت سے باخبر تھے۔ پیغمبرؐ کے دل کی گہرائیوں سے ہر وجہ کی جو شاعیں چھوٹی تھیں ان کی روشنی اور لطافت کو علیؑ پوری طرح محسوس کرتے تھے ایک دن علیؑ کا دل اس پاکیزہ محبت کی خوشی سے جو رسولؐ کو ان سے تھی سرشار اور بخود ہو گیا اور اس عالم بے خودی میں انہوں نے چاہا کہ وہ خود زبان رسالتؐ سے یہ سنیں کہ ان سے رسولؐ کس درجہ محبت رکھتے ہیں چنانچہ وہ خدمت رسولؐ میں حاضر ہوئے اور ان سے سوال کیا !

”ان دونوں میں سے چشم رسالتؐ میں کون زیادہ محبوب ہے آپؐ کی بیڑا نہرؐ“  
یا ان کے اسوہ علیؑ

ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ کے لیے اس سوال نے بڑی مشکل پیدا کر دی تھی ان کے لیے اس سوال کا جواب گویا ایک انتخاب محال تھا۔ انہیں علیؑ اور فاطمہؑ کے درمیان انتخاب کرنا تھا ان کے لبوں پر ایک معصوم اور دہریانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انہوں نے اپنے دل کے جذبات کی تمام گہرائیوں اور وسعتوں کو اپنے الفاظ میں سموتے ہوئے اور اپنے الفاظ سے خود محفوظ ہوتے ہوئے فرمایا :

”فاطمہؑ میرے نزدیک تم سے زیادہ محبوب ہے مگر تم مجھے فاطمہؑ سے زیادہ عزیز ہو۔“

اور اب حسنؑ اور حسینؑ، رسولؐ کے لوا سے، ان کے محبوب ترین عزیز اور ان کی عزیز ترین محبوبہ کی پارہ ہائے جگر ان دونوں ہستیوں کا تئیں اور ان کی بزرگی کا عکس ہیں۔ یہ پیغمبرؐ کو تمام دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ عزیز ہیں پیغمبرؐ کو تاریخ جن کے عزم اور حوصلہ اور طاقت اور غلبہ کی گواہی میں رطب اللسان ہے جن کی شمشیر کی ریت سے تمام خسروان جہاں تمام قیصرانِ دوراں اور تمام حاکمانِ جور کے دل دہل اٹھتے ہیں اور جن کے قبر و غضب کے سامنے دشمنانِ حق

لہرہ بر اندام دکھائی دیتے ہیں۔ اس تمام جلالی شان کے ساتھ ہی رحمت و محبت اور نوازش و شفقت کا سرچشمہ بھی ہیں۔ ان کی جمالی شان یہ ہے کہ وہ لوگوں پر حد درجہ شفیق اور مہربان ہیں کسی کی خیف سی محبت ان کے دل میں محبت کے طوفان کو موجزن کر دیتی ہے اور کسی کی طرف سے جذباتِ اعلاص و مروت کا معمولی سا اظہار ان کی روح میں لطف و عنایت کے بحرِ نابیداں کا کرکھڑک کر دیتا ہے۔

جگ جنین میں تمام دشمنوں نے مل کر آپ پر یلغار کی، تمام شمشیروں کا رخ آپ ہی کی طرف کر دیا۔ کوشش یہ تھی کہ کسی طرح دنیا آپ کے وجودِ مقدس سے خالی ہو جائے ہر شخص... آپ کے قتل کے درپے تھا۔ یہاں تک کہ بالآخر دشمنانِ اسلام کو شکست ہوئی۔ سچہ ہزار افراد قیدی بنائے گئے، چالیس ہزار اونٹ، بے شمار بھیڑیں اور غنیمت کا بہت سا مال ہاتھ آیا۔ اچانک شکست خوردہ دشمن کی فرج میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور کہنے لگا ”اے محمدؐ ان قیدیوں میں آپ کی ذاتی ماواؤں آپ کی (رضاعی) خالائیں بھی ہیں“ اس نے مزید کہا کہ اگر ہم نے نعمان بن منذرؓ یا ابن ابی شمرؓ کی رہنمائی کی ہوتی تو اس مصیبت کے وقت میں وہ ہم سے وہ سلوک کرتے جو ان کی حیثیت اور عظمت کے شایانِ شان ہوتا ہے اور آپ ان سب لوگوں سے عظیم تر ہیں جن کی رہنمائی اور خدمت کی جاسکتی ہے۔“

پھر اس کے بعد ایک عورت آگے آئی اور اس نے فریاد کی میں تمہارے پیغمبر کی (رضاعی) بہن ہوں پیغمبرؐ نے سوال کیا کہ تیرے پاس تیرے دعویٰ کا ثبوت کیا ہے پس اس نے رسول اکرمؐ کو اپنے شافلوں پر ان کے دانتوں کے نشان دکھائے اور کہا ”ایک دن میں آپ کو اپنی پشت پر سوار کئے ہوئے تھے کہ آپ نے عصہ کی حالت میں میرے شانے

علیہ سعیدہ جہنوی نے حضورؐ کی دایہ ہونے کا شرف حاصل کیا اور حضورؐ کو دودھ پلایا۔

قبیلہ بنی اسد نے تعلق رکھتی تھیں اور یہ قبیلہ بنی ہوازن کے قبائل میں سے ایک تھا۔

وہ بادشاہ جس کی سلطنت عرب کے مشرق میں تھی۔

عراقی بادشاہ جس کی سلطنت شمالی عرب میں تھی۔

پر اپنے دانت پیوست کر دیئے تھے یہ اسی کا نشان ہے۔“

ان باتوں نے پیغمبرؐ کے جذباتِ رحمت و محبت کو برا لگیتے کر دیا۔ ماضی کی تمام یادیں آپؐ کے ذہن میں تازہ ہونے لگیں اس دور کی یادیں جب آپؐ بہت چھوٹے تھے اور آپؐ کی رعنائت کا فریضہ حلیمہ سعدیہؓ کو سونپا گیا تھا۔ اپنی دانی اور اس کی بیٹیوں کی محبت اور حلیمہ کے قبیلہ میں اپنی اہل بوائی زندگی کے ایام کی یاد نے آپؐ کے جذبات کو اس قدر مضبوط کیا کہ آپؐ کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں اور آپؐ نے فرمایا۔ میں اپنا حصہ اور تمام بنی عبدالمطلب کا حصہ ابھی معاف کرتا ہوں کل صبح تم مسجد میں آجاء اور تمام لوگوں کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کر دو اس کے جواب میں میں اپنی طرف سے اور اولاد عبدالمطلب کی طرف سے مالِ غنیمت کے حصہ کی معافی کا اعلان کر دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ تمام دوسرے لوگ بھی میری پیروی کرتے ہوئے اپنے اپنے حصے معاف کریں دوسرے دن ایسا ہی ہوا اور پیغمبرؐ نے بے پایاں محبت اور لطف کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سب کو آزاد کر دیا اور ان سب کا اسباب بھی لپٹا کر دیا۔ چند لوگ جو مالِ غنیمت میں اپنے حصہ کی دستبرداری سے خوش نہ تھے انہیں پیغمبرؐ نے مستقبل میں اس کمی کی تلافی کا وعدہ کر کے مطمئن کیا۔

اپنی خانگی زندگی میں اور اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک میں پیغمبرؐ ہمہ تن لطف و محبت کا نمونہ تھے، گھر کے باہر وہ مردِ رزم و سپاہ تھے، وہ طاقت، قدرت اور غلبہ کا مجسمہ تھے لیکن گھر میں وہ ایک جہانِ باپ اور ایک نرم خوشبوہر تھے، ان کی ازواج میں سے بعض کا رویہ نامناسب بھی رہا۔ انہوں نے گستاخیاں بھی کیں آزار بھی پہنچاتے مگر پیغمبرؐ کا رویہ ہمیشہ نرمی اور لطف و محبت کا رویہ رہا۔ حالانکہ یہ وہ دور تھا جب عورت کے ساتھ سخت گیرمی، آسائش و کامزاج تھا۔ لوگ عورتوں کو زود و کوب کرنے کے عادی تھے لیکن پیغمبرؐ نے اپنی تمام زندگی کبھی کسی زوجہ کے ساتھ ایسا نامناسب رویہ اختیار نہیں کیا۔ وہ تنہا موقعہ جس پر آپؐ اپنی ازواج سے ناراض ہوئے ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا اور ان کی تنبیہ کی وہ موقع تھا جب آپؐ کی بعض ازواج نے فقر و سنگدستی کی اس قدر شکایت کی کہ آپؐ کو ناگوار ہوا۔ اور آپؐ نے ان کے حجروں میں سونا ترک کر دیا ایک

ایسی جگہ جو کٹ کٹا ہوا، گھاس اور غلہ کا گودام تھی آپؐ سیڑھی لگا کر اس کی چھت پر چلے جاتے۔ وہاں جو سامان ہوتا اسے ایک طرف کر کے فرش صاف فرماتے اور وہیں سو جاتا ایک ماہ تک آپؐ کا یہی معمول رہا۔ یہاں تک کہ آپؐ کی ازواج اپنے رویہ پر نر مندہ ہوئی انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور جب پیغمبرؐ نے انہیں یہ فرائض لانا پیش کش کی اگر وہ دنیاوی عیش و آرام کی طلب گار ہیں تو وہ انہیں طلاق دینے کے لیے تیار ہیں اور اگر وہ ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو انہیں نفرت و فاقہ کی زندگی کو قبول کرنا ہو گا۔ ازواج میں سے سوائے ایک کے سب نے پیغمبرؐ کی رفاقت اور فقر کو دنیاوی عیش و آرام پر ترجیح دی پیغمبرؐ نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ خود کو دوسروں کے سامنے ان سے مختلف پراسرار، غیر معمولی یا عجیب و غریب بنا کر پیش کریں۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس آپؐ کی زندگی ہوتی تھی کہ لوگ آپؐ کو کوئی مختلف شخصیت اور اپنے سے غیر اور بیگانہ نہ سمجھیں۔ بلکہ آپؐ بھی دوسروں ہی کی طرح نظر آئیں نہ صرف یہ کہ آپؐ نے قرآن کے الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا کہ میں بشر ہوں تمہاری مثل، مگر یہ کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے، بلکہ بار بار یہ جتنا کہ مجھے علم غیب کا دعویٰ نہیں ہے مجھے جو کچھ خبر دی جاتی ہے اس کے علاوہ کسی بات کے متعلق میں نہیں جانتا۔ عرض آپؐ آجی رہتا وہ گفتار اور عادات و اطوار سے ہمیشہ ہی کوشش کرتے تھے لوگوں کے سامنے خود کو غیر معمولی اور فوق العادات شخصیت کے طور پر پیش نہ کریں تاکہ لوگوں کے دلوں میں آپؐ کے لیے خوف یا ہیبت نہ پیدا ہو۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک بوڑھی عورت آپؐ کی خدمت میں آئی تاکہ آپؐ سے کسی مسئلہ کے متعلق استفسار کرے اس نے آپؐ کی عظمت و جلالت کی بابت جو باتیں سن رکھی تھیں ان کا اس کے دل پر کچھ ایسا اثر تھا کہ جب اس نے خود کو آپؐ کی حضوری میں پایا تو فرط ہیبت سے کانپنے لگی اور آپؐ کے سامنے اس کی قوت گویائی جواب دینے لگی، پیغمبرؐ نے محسوس کیا کہ آپؐ کی شخصیت کے شکوہ نے اس کو حد درجہ متاثر کیا ہے۔ چنانچہ آپؐ اس سے حد درجہ نرمی اور ملاطفت سے پیشی آئے۔ اس پیرزن کے شانہ پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور نہایت نرم اور لطیف لہجہ میں فرمایا۔ مادر کیا بات ہے کیوں ڈر رہی ہو۔ میں تو

ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو بکریوں کا دودھ دہاتی ہے۔

پیغمبر کی شخصیت کا رخ یعنی نرمی، شفقت، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور محبت اور آپ کی رقت قلب بھی حیرت انگیز ہے۔

اپنی خانگی زندگی میں آپ کی سادگی اور تواضع مثالی تھی ازواج کے ساتھ آپ کا رویہ انتہائی نرمی اور محبت کا رویہ تھا۔ اپنی بیٹی فاطمہ کے ساتھ آپ کا سلوک لوگوں کے لیے باعث حیرت اور تعجب تھا آپ نے اپنی محبت اور شفقت کے اظہار کے لیے جو تشبیہات و کلمات استعمال کئے ہیں ان میں ایک خاص معنویت ہے عمار کے متعلق آپ نے فرمایا ”ہمارے میری دونوں آنکھوں کے درمیان کا پوست ہے۔ حضرت علی کے بارے میں ارشاد ہوا علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں“ اور اپنی پارہ جگر جناب فاطمہ کے بارے میں آپ کا قول ہے۔ فاطمہ میرا جرو ہے۔ میرے جسم کا ٹکڑا ہے۔

اور جہاں تک حق اور حسین کا تعلق ہے تو کس کو نہیں معلوم کہ پیغمبر نے ان سے کس کس طرح اظہار محبت نہیں کیا۔ پیغمبر کو ان بیٹوں سے خصوصی محبت تھی خصوصاً اس لیے کہ تقدیر نے آپ کو فرزندوں سے محروم رکھا تھا، حالانکہ آپ بیٹوں سے جس قدر محبت کرتے تھے اور جس حد تک ان کو عزیز رکھتے تھے اس کا تصور آج کے ترقی یافتہ انسان کیلئے بھی ممکن نہیں ہے۔ مگر پھر بھی آپ کے دل میں بیٹوں کی تمنا ہونا ایک فطری بات تھی مگر تقدیر کو یہی منظور تھا کہ آپ کی تمام اولاد میں صرف ایک بیٹی ہی زندہ رہے اور اب اس اکیلی بیٹی کو اللہ نے دو فرزند عطا کئے تھے، فاطمہ کے بیٹوں کی شکل میں رسولؐ نے دو ایسے فرزند پال لیے جن سے آپ کی محبت اس قدر شدید اور بے پایاں تھی جو ہمیشہ لوگوں کو حیرت اور تعجب میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ایک دن آپ خانہ فاطمہ میں تشریف لائے، یہ آپ کا روز کا معمول تھا اور جب سے حنین کی ولادت ہوئی تھی آپ کو جب بھی موقع ملتا ضرور خانہ فاطمہ میں رونق افروز ہوتے۔

اس دن ایسا ہوا کہ جب آپ اپنی بیٹی کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ علیؑ



اور فاطمہ دونوں محراب میں اور حسن بھوکے ہیں اور گریہ کر رہے ہیں کیونکہ انہیں اپنی بھوک مٹانے کے لیے کچھ مل نہیں رہا ہے۔ پیغمبرؐ نے یہ منظر دیکھا آپ نے یہ پسند نہیں کیا کہ اپنی عزیز ترین اور محبوب ترین ہستیوں میں سے کسی کو میدار کریں، آپ تیزی سے مگر بے آواز ننگے پاؤں چلتے ہوئے صحن خانہ میں تشریف لے گئے۔ جہاں ایک دہی موجود تھی آپ نے اس کا دودھ دوہا اور وہ اپنے ہاتھوں سے بچہ کو پلایا تاکہ بچہ سیر ہو کر چین سے سو جائے۔

ایک روز آپؐ در فاطمہ کے پاس سے تیزی سے گذر رہے تھے ناگہاں آپ کے کانوں میں حسینؑ کے رونے کی آواز پہنچی، آپ واپس مڑے۔ بیٹی کے گھر میں داخل ہوئے اور ایسی حالت میں کہ تمام جسم مبارک لرز رہا تھا فرمایا۔

”کیا تم نہیں جانتی ہو کہ اس کے رونے سے مجھے کس قدر اذیت ہوتی ہے۔“

اسامہ بن زید بن حارثہ جنکا ہم اس سے قبل بھی ذکر کر چکے ہیں۔ روایت کرتے ہیں کہ مجھے پیغمبرؐ سے کچھ کام تھا میں آپ کے در دولت پر حاضر ہوا۔ آپ گھر سے باہر تشریف لائے اور مجھ سے گفتگو فرمائی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ پیغمبرؐ کے زیر جامہ کوئی چیز پتھراں ہے جس کی طرف آپ تمام وقت محبت سے نظر کرتے رہے مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ پیغمبرؐ کی نگہ لطف کا مرکز جو چیز ہے وہ در حقیقت کیا ہے جب میری بات ختم ہو گئی تو میں نے سوال کیا کہ یہ کیا ہے جسے آپ نے سینے سے لگا رکھا ہے۔

پیغمبرؐ کا چہرہ و فورا بنشاط و محبت سے چمکنے لگا۔ آپؐ نے اپنی جاکے کنارے سرکاتے تو میں نے دیکھا کہ حسنؑ اور حسینؑ ہیں جنہیں آپ نے سینے سے لگایا ہوا ہے۔

آپؐ نے جاہا کہ میرے لیے اپنے اس غیر معمولی انعام رحمت کی توجیہ فرمائی، مگر آپ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی ناکاہیں ان بچوں سے ہٹا سکیں چنانچہ ایسی حالت میں آپ کی نگاہیں مسلسل ان بچوں پر مرکوز تھیں۔ آپؐ نے خود کلامی کے انداز میں فرمایا۔

یہ دونوں میرے فرزند ہیں۔ میری بیٹی کے بیٹے،

اور اس کے بعد آپ کی آواز شدتِ جذبات سے لرز ہو گئی اور آپؐ نے ایک ایسے لمبے

میں جس کی توصیح نہیں کی جاسکتی مزید فرمایا  
خدا و اندامیں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر، اور جو کوئی  
ان دونوں سے محبت رکھے تو بھی اس کو دوست رکھ۔

بقول ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی اگر پیغمبر کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا کہ ان کی  
کون سی بیٹی ان کی پاک نسل کا سرچشمہ بنے اور ان کے کون سے داماد کو بدلاہل بیت  
ہونے کا شرف حاصل ہو تو وہ انہی دونوں بیٹیوں کو منتخب کرتے جن کا انتخاب خدا نے  
اس مقصد کے لیے کیا تھا۔ ۱۔

علیؑ و فاطمہؑ کے بچوں کے لیے پیغمبرؐ کا وجود ہمہ لطف و محبت تھا۔ وہ مانتا تھا  
وہ باپ تھا ان کے خاندان کے دوست اور سرپرست تھا ان کے رفیق و دمساز تھا یہاں تک  
کہ وہ ان کے بچنے کے کھیل میں ان کے ساتھی تھا بچے ان سے اپنی ماں اور باپ سے  
زیادہ مانوس اور بے تکلف تھا ایک روز پیغمبرؐ نے نماز میں سجدے کو اس قدر طول دیا  
کہ تمام نمازی حیرت اور تعجب کا شکار ہونے لگے اس لیے کہ پیغمبرؐ کی یہ عادت تھی کہ آپؐ نماز  
جماعت میں ہمیشہ تجلی فرماتے تھے اور اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ نمازیوں میں کسی کمزور  
اور ضعیف شخص کے لیے نماز کا طول باعث زحمت نہ ہو اپنی اس عادت اور دستور کے  
برضلاف آپؐ کا سجدے کو غیر معمولی طول دینا لوگوں کے لیے حیرت اور تعجب کا باعث بنا۔

لوگوں کا خیال ہوا کہ یا تو کوئی حادثہ پیش آگیا ہے یا حالت سجدہ میں وحی کا نزول  
ہونے لگا ہے جب نماز ختم ہو چکی تو لوگوں نے آپؐ سے پوچھا کہ سجدہ کی غیر معمولی طوالت  
کا سبب کیا تھا حضورؐ نے فرمایا حسین سجدہ کی حالت میں میری پشت پر سوار ہو گیا تھا  
اس کی یہ عادت ہے کہ میں جب گھر میں نماز ادا کرتا ہوں تو وہ میری پشت پر سوار ہو جاتا  
ہے میرا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں ایسی حالت میں سجدے سے سر اٹھاؤں کہ  
حسین میری پشت پر سے گر پڑے اس لیے میں نے انتظار کیا تاکہ وہ خود میری پشت  
سے اتر جائے اس سبب سے مجھے سجدے کو اس قدر طول دینا پڑا۔

پیغمبر ہر مرحلہ پر اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ لوگ بالخصوص آپ کے تمام اصحاب اس حقیقت کو چنان لیں بلکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ پیغمبر ان دونوں بچوں، حسنؑ اور حسینؑ، ان کی مادر گرامی اور ان کے پدر بزرگوار کو کس قدر دوست رکھتے ہیں دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے شخص سے اتنی محبت نہیں کر سکتا جتنی حبت پیغمبر کو ان ہستیوں سے تھی۔

یہی سبب ہے کہ حضور دونوں کے سامنے اپنی بیٹی فاطمہؑ سے غیر معمولی محبت اور احترام کا مظاہرہ فرماتے تھے آپ ان کے ہاتھوں اور چہرہ کو بوسہ دیتے تھے۔ پیغمبر کی خواہش تھی کہ لوگ جان لیں کہ آپ کو اپنی بیٹی، داماد اور لو اسوں سے کیسا قلبی اور روحانی تعلق ہے اگر ایسا نہیں تھا تو پھر کیوں آپ مسلسل مسجد میں ان کی تعریف و ستائش فرماتے تھے۔ کیوں منبر سے ان کے فضائل بیان کرتے تھے۔ آپ کیوں بار بار اس خاندان سے اپنے روحانی اور جذباتی تعلق کا سرعام اظہار فرمایا کرتے تھے اور کیوں آپ ان ہستیوں کی درج و ستائش کے بعد ان کلمات کا اضافہ فرماتے تھے کہ جو ان کو دوست رکھتا ہے اے خدا تو اس کو بھی دوست رکھ۔ کیوں آپ حسنؑ، حسینؑ، فاطمہؑ یا علیؑ کی نسبت یہ فرماتے تھے کہ ان کی خوشنودی میری خوشنودی ہے اور میری خوشنودی خدا کی خوشنودی ہے کسی لیے آپ یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جس نے انیس سے کسی ایک کو یا ان سب کو آزار پہنچایا اس نے دراصل مجھے آزار پہنچایا۔ اور جو مجھے آزار پہنچاتا ہے وہ خدا کی ناراضگی مول لیتا ہے۔

یہ ستائش، یہ اظہار محبت، یہ دوستی اور دشمنی کا ذکر اہل اس کے ساتھ یہ تاکید کہ ان کی دوستی اور دشمنی خدا اور رسولؐ کی دوستی اور دشمنی کا پیمانہ ہے۔ آخر پیغمبر ان سب باتوں پر اس قدر زور کیوں دیتے تھے۔

ان تمام سوالوں کا جواب مستقبل میں مل جائے گا۔ اس خاندان کی سرگزشت اس خاندان کے ہر فرد کی داستانِ حیات ان تمام سوالوں کا جواب ہے۔

پیغمبرؐ کی راہ میں اور پیغمبرؐ کے واسطے اس خاندان نے مسلسل اور غیر معمولی قربانیاں پیش کیں ان قربانیوں کا سب سے پہلا مظہر فاطمہؑ ہیں پھر علیؑ، پھر حسنؑ، پھر حسینؑ اور

### بالآخر زینبؓ

ہجرت کے پانچویں سال، امام حسینؑ کی ولادت کے ایک سال بعد اس خاندان میں ایک لڑکی کی ولادت ہوئی۔ قرابینوں کے سلسلہ میں اس خاندان کے لیے حسینؑ کے بعد اس لڑکی کی ضرورت ناگزیر تھی اس لیے یہ حسینؑ کے بعد بلا فصل پیدا ہوئی اس کا نام زینبؓ اور زینبؓ کے دو سال بعد ایک اور لڑکی کا اضافہ ہوا۔ ام کلثومؓ

زینبؓ ام کلثومؓ بھی دختران رسولؐ کے نام بھی تھے  
در حقیقت فاطمہؓ وہ ہستی ہیں جو محمدؐ کے لیے سب کچھ ہیں وہ تنہا اپنے باپ کی تمام دنیا ہیں۔

پیغمبرؐ کی بیٹی زینبؓ انتقال کر چکی ہیں رقیہ اور ام کلثومؓ بھی دنیا سے سدھار چکیں  
ہجرت کے اٹھویں سال خدائے پیغمبرؐ کو ایک بیٹا عطا کیا۔ ابراہیمؑ مگر ولادت کے ایک سال بعد ہی وہ موت کی آغوش میں چلا گیا۔

اور اب پیغمبرؐ کی تمام اولاد میں صرف ایک ہستی زندہ ہے۔ فاطمہؓ اب پیغمبرؐ کی تمام دنیا، ان کی تمام امیدوں، آرزوؤں اور محبتوں کا مرکز فاطمہؓ ہیں اور ان کے بچے بے شک ہی اہل بیتؑ پیغمبرؐ ہیں۔

حسنؑ اور حسینؑ سے پیغمبرؐ کی محبت بڑھتی جا رہی ہے اب یہی دونوں بچے ان کی زندگی ہیں انہیں نہیں قدر ہی وقت ملتا ہے وہ انہی کے ساتھ گزارتے ہیں۔

جب کبھی آپؐ گھر سے باہر جاتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں مدینہ کے گلی کوچوں میں جی طرف سے گذرتے ہیں دونوں میں سے کوئی نہ کوئی بچہ آپؐ کے دوش مبارک پر سوار ہوتا ہے۔

ایک دن آپؐ مسجد میں مبنی پر خطبہ ارشاد کر رہے تھے تمام لوگ آپؐ کی طرف ہمتن گوش ہیں اچانک آپؐ کے نواسے اپنے گھر کے دروازے سے باہر آتے ہیں مسجد اور ان کا گھر اس طرح متصل ہے گویا مسجد ان کے گھر کا صحن ہے دونوں بچوں کے جسم پر سرخ پیرا بن ہے بچے اس قدر چھوٹے ہیں کہ قدم جاکر نہیں چل سکتے بار بار لڑکھڑاتے

ہیں، اور گر پڑتے ہیں، ناگہاں پیغمبرؐ کی نگاہ ان پر پڑتی ہے اور پھر جم کر رہ جاتی ہے ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی نظروں کو ان بچوں سے ہٹا سکیں آپؐ نے دیکھا کہ بچوں کو چلنے میں بڑی زحمت ہو رہی ہے کبھی گرتے ہیں پھر سنبھل کر اٹھتے ہیں پیغمبرؐ یہ دیکھ کر متباب ہو جاتے ہیں اپنے خطبہ کو درمیان میں روک دیتے ہیں تیزی سے منبر سے اترتے ہیں بچوں کو آغوش میں اٹھاتے ہیں اور پھر منبر پر واپس تشریف لاتے ہیں آپؐ دیکھتے ہیں کہ تمام لوگ حیرت سے آپؐ کی طرف نگاہیں ہیں اور آپؐ کی بے تابی اور اضطراب نے انہیں سخت متعجب کر دیا ہے آپؐ حسوس کرتے ہیں کہ جیسے لوگ یہ چاہتے ہوں کہ آپؐ اپنے خطبہ کو درمیان میں روکنے اور بچوں کے لیے اس قدر اضطراب اور بے چینی کا اظہار کرنے کے عمل کی بابت کچھ وضاحت فرمائیں۔

آپؐ نے اس حالت میں کہ دونوں بچوں کو اپنے پاس مہر و شفقت کے ساتھ منبر پر بٹھا رکھا تھا فرمایا:

بے شک خدا نے سچ کہا ہے۔ تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ (آزمائش) ہیں۔ میری نگاہ ان بچوں پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ انہیں چلنے میں دقت ہو رہی ہے یہ بار بار گر پڑتے ہیں۔ مجھ سے ان کی تکلیف برداشت نہ ہوئی اس لئے میں نے خطبہ کو روک دیا اور انہیں بڑھ کر اپنی آغوش میں اٹھالیا۔

حسین کے ساتھ آپؐ کی محبت کا انداز ہی اور تھا یہ محبت اپنی شدت اور نزاکت ہر دوا اعتبار سے حد سے بڑھی ہوئی تھی آپؐ ان کا بازو پکڑ لیتے، بچہ کے ساتھ کھیلنے اسے لوہیاں سنلنے اسے اپنے سینہ پر سوار کر لیتے اسے کہتے اپنا منہ کھولو اور پھر نہایت محبت اور مشق کے عالم میں اس کے منہ کے بوسے لیتے۔ یہ محبت کی وہ حد ہے جس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں ہے آپؐ بچہ کا منہ چومتے جاتے اور دفر جذبات سے متاثر لہجہ میں فرماتے جاتے۔

خداوند! میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اسے اپنا دوست نہ لے

ایک روز آپ کی کہیں دعوت تھی اپنے چند اصحاب کے ساتھ آپ دعوت میں تشریف لے گئے، اپنے ہاتھ پھیلائے اور چاہا کہ اپنے اس ڈاڑھے کو زینتِ آغوش بنالیں۔ بچہ نے بچوں والی معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ”میں خود آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔ آپ مجھے پکڑنے کی کوشش کریں یہ کہہ کے بچہ ادھر سے ادھر بھاگنے لگا۔ پیغمبر مسکراتے جاتے تھے اور بچہ کا تعاقب کرتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ایک ہاتھ اس کی پشت پر رکھا اور دوسرا اس کی تھوڑی کے نیچے پھر دوز شوق و محبت سے حسین کے منہ کے بوسے لے اور فرمایا۔

حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔۔۔۔۔ خداوند! تو اسے دوست رکھ جو حسینؑ کو دوست رکھے؛ پیغمبر کے ساتھ آپ کے اس طرزِ عمل کو حیرت اور تعجب سے دیکھ رہے تھے ان میں سے ایک نے دوسروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ذرا پیغمبرؐ کو دیکھو کہ اپنے ڈاڑھے کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے تھے۔ خدا میرے بھی ایک لڑکا ہے۔ مگر میں نے آج تک اسے کبھی پیار نہیں کیا۔ پیغمبرؐ اس شخص کی بے مہری اور خشونت کے اظہار سے بد مزہ ہوئے اور آپ نے فرمایا

جو دم نہیں کرتا اس پر دم نہیں کیا جائے گا۔

روز و شب اسی طرح گزر رہے تھے اور ہر لمحہ فاطمہؑ کی زندگی میں مٹھاس گھول رہا تھا یہ فاطمہؑ کی زندگی کا وہ شیریں ترین دور تھا کہ جس نے ماضی کی تلخ یادوں اور دورِ گزشتہ کی مصیبتوں اور پریشانیوں کی یادیں آپ کے دل سے محو کر دی تھیں۔

پھر فتح خیبر کے بعد یہودیوں نے فدک کا زحیہ علاقہ پیغمبرؐ کو ہدیہ کر دیا اور حضورؐ نے اسے فاطمہؑ کو عطا کر دیا اور فاطمہؑ بن کے گھر میں چار چھوٹے چھوٹے بچے تھے کچھ دنوں کے لیے فقر و تنگدستی کے حصار سے آزاد ہو گئیں۔

## فتح مکہ

پھر فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا اور فاطمہؑ اپنے فاتح باپ اور اپنے عظیم شوہر، جو لشکر

اسلام کے پیچہ بردار تھے، کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئیں آپسے باطل پرستی کی اس عظیم ترین فتح کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ سرزمینِ جواپے کی جلنے والی ولادت تھی آپے کی نگاہوں کے سامنے تھی اور مکی زندگی کی تمام خوش گوار اور ناخوش گوار یادیں ایک ایک کر کے تازہ ہو رہی تھیں، مسیحا الحرام اور وہاں پیش آنے والا ناخوش گوار حادثہ، خانہ پدہ، اپنی بہنوں کے ساتھ گزارے ہوئے زندگی کے دن۔ وہ بہنیں جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ گھر جو آپے کا مولد بنا، شعب البرطالیہ، قبر ابو طالب، قبر خدیجہؓ۔ خدیجہ جو آپے کی ماں تھیں۔۔۔۔۔

رفتہ رفتہ حالات بدلتے ہیں ان کے پر بزرگوار، سختی اور مصیبت کے حصار سے نکل کر جنت فرماتے ہیں ان کی طاقت اور عظمت تیزی سے بڑھتی ہے۔ تمام چیز پر نمائے عرب ان کے زیرِ نگین آجاتا ہے۔ یہ وقت ان کے باپ کی طاقت، عظمت، فتح و کامرانی اور شادمانی کا مژدہ سارہا ہے۔ اسی طرح ان کے شوہر علیؓ طاقت اور کامیابی کی مجسم کی علامت ہیں وہ بدر و احد، خندق و خیبر، فتح مکہ، حنین و ینبوع، ہر ہم کے ہیرو ہیں ان کی تلوار نے باطل پر اس قدر کاری مزیں لگائی ہیں کہ یومِ خندق ان کی ایک ضرب قیامت تک تمام جوں اور انسانوں کی عبادت سے افضل ہے۔

اور ان کے بچے جو ایک ایسی زندگی کا جو سر اس سختی و رنج سے عبادت ہے واحد شیریں شہر میں جو گلزارِ عشق و ایمان کی بہار ہیں

جو نسلِ پیغمبر اور نسلِ فاطمہؓ کی لہا اور تسلسل کی واحد مہمات ہیں جو عسرت کا دل میں جوابدہیت پیغمبر کا مرکز و محور ہیں، خوفناک رسولؐ کے چشم و چراغ ہیں اور جو رسولؐ کی پاکیزہ نسل کا سرچشمہ ہیں۔

یوں ہے جیسے فاطمہؓ کو خدا نے ان کے پدر بزرگوار کی زندگی کی تمام تلخیوں اور مصیبتوں کا مداوا بنا دیا ہے۔ ہاں بے شک فاطمہؓ اپنے باپ کے لیے ہر طرح کی مسرت، شادمانی اور فضیلت کا سرچشمہ ہیں۔

فاطمہؓ کے لیے سب سے زیادہ اطمینان اور مسرت کا سبب یہ احساس ہے کہ ان

کے چہنچہ نے ان کے پدر بزرگوار کے قلب و روح کو احساسِ مسرت و شادمانی سے اس طرح سیراب کر دیا ہے کہ وہ ماضی کی تمام تلخیوں اور محرومیوں کو بھول گئے، ہیں فاطمہ سے بڑھ کر اپنے باپ کے دکھ درد کا محرم اور کون ہے وہ جانتی ہیں کہ ان کے باپ کا دل اپنے کم سن بیٹوں کی موت کے مدد سے مجروح ہے۔ ان کی تمام بیٹیاں، سوائے ایک (فاطمہ) کے عالمِ جوانی میں انتقال کر گئیں۔ ہر چند پیغمبرؐ نے خدیجہؓ کے بعد تیرہ شادیاں کیں مگر کسی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔ آخر عمر میں ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے ابراہیمؑ پیدا ہوئے وہ بھی عالمِ شیر خوارگی میں اللہ کو پیالے ہو گئے۔ اب فقط فاطمہؑ کے بچے ہیں، حسنؑ، حسینؑ، زینبؑ اور ام کلثومؑ جن کا دیدار رسولؐ کی آنکھوں کو ٹھنک بخشتا ہے اور جن کا وجود اور جن کی محبت پیغمبرؐ کے لیے شریعتی حیات کا واحد سرچشمہ ہے آپؐ کی تمام زندگی میں رنج و مصیبت کی تلی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، مگر قدرت نے اولادِ فاطمہؑ کے ذریعے آپؐ کی زندگی کی تلخ کامی کو شہِ بدوشت کر کی شیرینی سے بدل دیا ہے اب حضورؐ کا سن ساٹھ سال سے تجاوز کر گیا ہے اور اس سن و سال میں آپؐ کو ہمیشہ سے زیادہ ان بچوں کی ضرورت ہے۔

زندگی بہت مہربان نظر آتی ہے۔ فاطمہؑ کے چہرے پر خوشی کے آثار ہو رہا ہیں فاطمہؑ کے گھر کے چاروں طرف خوشحالی، انقار اور کرامت کا ایک نورانی ہال ہے۔ فاطمہؑ اپنے پدر بزرگوار کی ناقابلِ بیان محبت، اپنے شوہر کی بے مثال عظمت اور اپنے بچوں کی زندگی بخش محبت کی نعمتوں اور راحتوں سے سرشارِ مطمئن آسودہ پر مسرت اور پر انقار زندگی گزار رہی ہیں ایک ایسی زندگی جو ہر طرح کے اضطراب و انتشار سے بے نیاز ہے جہاں ہر رخ سے چین ہے آرام ہے، راحت ہے مسرت ہے، جہاں قلب بھی مطمئن ہے اور روح بھی سحرور ہے۔

مگر یہ ساری مسرت اور شاد کامی، اطمینان و سکون کا یہ دور ایک طوفان سے پہلے کا مختصر وقفہ ہے۔ بہت جلد ان کی زندگی، طوفان کی لپیٹ میں آگئی۔ سیاہ و ہولناک طوفانِ جوان کے آشیاں کو برباد اور ان کے گھر کو ویران کرنے والا تھا۔



## رہلت پیغمبر

پیغمبرؐ پر مرنے کا حکم کر دیا۔ وہ صاحبِ فراش ہو گئے!

پھر ان میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ وہ اٹھ سکیں!

فاطمہؓ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ لوگوں کے رخ بدل گئے ہیں انہوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ مدینہ کی فضا، پاکستان کی اور نہ کی کے بدلے کینہ و ہراس سے لبریز ہو رہی ہے شہرِ مہم میں جہاں ایمان اور اخلاص کے پھول کھلتے تھے اب سیاست کی بادِ سموم چل رہی ہے بیانِ اخوتِ اسلامی ٹوٹے ہوئے ہیں اور ان کی جگہ پرانی قبائلی عصبیتیں پھر سے سراٹھار رہی ہیں۔ اب پیغمبرؐ کا حکم نہیں مانا جاتا حضورؐ نے علی کو طلب فرمایا۔ مگر عائشہؓ اور حفصہؓ نے ابو بکرؓ اور عمرؓ کو بلالیا۔

فاطمہؓ نے کل مسجدِ بنوی میں حضرت عمرؓ کے نماز پڑھنے کی آواز سنی تھی آج حضرت ابو بکرؓ کی آواز سن رہی ہیں

فاطمہؓ دیکھ رہی ہیں کہ لشکرِ اسامہؓ ٹھہرا ہوا ہے اور ان کے پدرِ بزرگوار کے اصرار حتیٰ کہ نفرین کے باوجود لوگ حرکت نہیں کر رہے چاروں طرف سے اسامہؓ کے بحیثیت سالارِ لشکر انتخاب پر اعتراض کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں درِ آغا بیکہ یہ انتخاب خودِ پیغمبرؐ نے فرمایا تھا۔

اور آج پنجشنبہ ہے مگر ہائے کون سا پنجشنبہ ان کے پدرِ بزرگوار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی ہے۔ پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ کاغذ اور قلم لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک ایسا نوشتہ لکھ دوں کہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو سکو! لوگ اس حکم کو نہیں مانتے شور و غل برپا کرتے ہیں کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ!) گفتارِ پیغمبرؐ ہدیان ہے ہمارے پاس کتابِ خدا ہے پھر ہمیں کسی نوشتہ کی کیا ضرورت ہے۔

اب پیغمبرؐ میں گفتگو کرنے کی طاقت بھی نہیں رہی عائشہؓ اور حفصہؓ خاموش ہے۔ پیغمبرؐ کا سرِ عالیؓ کی آغوش میں ہے ان کے لبِ خاموش ہیں مگر ان کی آنکھیں اپنی بیٹی

سے گفتگو کر رہی ہیں۔

فاطمہؑ اپنے پدر بزرگوار کی اس بے چارگی کی تاب نہیں لاسکتیں۔ وہ خود سے کہتی ہیں یہ میرے ”پدر بزرگوار ہیں اور میں ”ام ایہا“ ہوں کیا یہ مجھے اس شہر کی اس ناسازگار فضا میں تنہا چھوڑ دیں گے۔ وہ مجھ سے اپنی نگاہیں نہیں ہٹاتے۔ ہمیشہ سے زیادہ اس وقت میری طرف متوجہ ہیں۔ شاید انہوں نے میرے چہرہ پر میری دلی کیفیت کو پڑھ لیا ہے۔ یقیناً ان کا دل میرے غم کی آگ میں جل رہا ہے میں فاطمہؑ، جوان کی سب سے چھوٹی مگر سب سے پیاری بیٹی ہوں۔

وہ آنکھ سے اتارہ کرتے ہیں۔ میں اپنے کان ان کے لبوں کے نزدیک لے جاتی ہوں وہ سرگوشی کرتے ہیں۔ یہ بیماری، بیماری مرگ ہے میں دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں میں نے اپنا سر ہٹا لیا۔ بدبختی اور مصیبت کے پہاڑ میرے سر پر ٹوٹ پڑے میری طاقت جواب دینے لگی مجھے اپنے والد کی جدائی کا داغ سہنا ہو گا۔ یہ مصیبت مجھ سے کیسے برداشت ہوگی نزدیک تھاکہ میرا دل غم سے پارہ پارہ ہو جائے مگر یہ خبر صرف مجھی کو کیوں دی گئی ہے حالانکہ میں اس خبر غم کو برداشت کرنے کی سب سے کم تاب رکھتی ہوں۔

لیکن میرے باپ کی نگاہیں صرف مجھ پر جمی ہوئی ہیں وہ صرف میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہ نگاہیں کہہ رہی ہیں کہ ان کا دل اپنی بیٹی کے غم میں جل رہا ہے یہ بیٹی وہ ہے جو اپنے باپ کو بہت محبوب رہی ہے جو بچپن سے اپنے باپ کی شفقت اور محبت کا مرکز رہی ہے۔ پیغمبر پھر اشارہ کرتے ہیں کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں پھر ان کے لبوں سے نزدیک ہو جاتی ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”تو لے میری بیٹی، وہ پہلا فرد ہوگی جو میرے خاندان میں سے میرے پیچھے آکر مجھ سے مل جائے گی“

آپؐ نے مزید فرمایا ”فاطمہؑ کیا اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تم اس امت کی عورتوں کی سردار ہو“

اللہ اکبر! کیسی عظیم تسلی ہے کیا عجیب مژدہ ہے۔ اے پدر بزرگوار آپؐ پر آفرین

ہو۔ آپ خوب سمجھ سکتے تھے کہ فاطمہ کے لیے اس وقت کیسی تسلی کی ضرورت ہے وہ کون سا مژدہ ہے جو اس کے غم کی آگ کو سرد کر سکتا ہے یہ حرف تسلی، یہ مژدہ خود میری خبر مرگ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ کیا خرب میری موت مجھے اپنے باپ سے بہت جلد ملائے گی۔ اب مجھ پر یہ راز کھلی گیا کہ کیوں آپ نے اس طالع کے لیے اپنی خبر مرگ کے لیے تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف میرا انتخاب کیا

اب میری طاقت بحال ہونے لگی ہے کہ میں اس غم کو برداشت کر سکوں آہ وزاری کر سکوں میں ابو طالب کے کہے ہوئے ایک شعر کی تکرار کرتی ہوں۔

وایضیٰ یستقی الغمام بوجہ شمال الیت امی عصیۃ اللائل

اچانک میرے پدر بزرگوار اپنی آنکھیں کھولتے ہیں۔ فاطمہ یہ شعر میری مدح میں ابو طالب نے کہا تھا مگر یہ وقت شعر پڑھنے کا نہیں ہے۔ قرآن پڑھو بیٹی قرآن! ”محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول بھی گذر چکے ہیں پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے“

پھر آپؐ نے فرمایا۔۔۔۔۔

خدا لعنت کرے اس قوم پر جو اپنے پیغمبر کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتی ہے

اس کے بعد آپؐ نے خود کلامی کے انداز میں فرمایا۔

کیا ظالموں اور جاہل حکمرانوں کا ٹھکانہ جہنم نہیں ہے۔

آپؐ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

آخرت میں اچھا گھر ان لوگوں کے لیے ہے جو زمین پر ظلم و فساد برپا نہیں کرتے

جو کوئی عذاب جہنم سے بچنا چاہتا ہو وہ ظلم و فساد سے گریز کرے

ان کا چہرہ اس قدر روشن اور سفید ہے کہ اس سے یادل پانی طلب کرتے

ہیں۔ یہ یتیموں کا سہارا اور یتیموں کی پناہ گاہ ہیں۔

سورۃ آل عمران (آیت ۱۴۴)

وہ لوگ جنہوں نے انہیں لکھنے کا سامان فراہم نہیں کیا تھا۔ چاہتے ہیں کہ پیغمبرؐ دہائی فرمادیں کہ وہ کیا لکھنا چاہتے تھے۔

پیغمبرؐ ان لوگوں کی طرف رجحیدہ ہو کر دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ میں جو بات کرنے والا تھا وہ اس سے کہیں بہتر ہے جس کا تم مجھ سے مطالبہ کر رہے ہو۔  
لوگ آپؐ سے سوال کر رہے ہیں کہ آپؐ آخر کیا لکھنا چاہتے ہیں اس کی وضاحت فرمادیں آپؐ ارشاد فرماتے ہیں:-

میں تمہیں تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں

❖ اول یہ کہ مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دیا جائے  
❖ دوم یہ کہ قبائلی و فود کی پذیرائی اسی طرح کی جائے جس طرح میں ان کی پذیرائی کرتا رہا ہوں۔

❖ اور سوم۔ اس مرحلہ پر آپؐ نے سکوت فرمایا  
ناگہاں سب کی آنکھیں علیؑ کی طرف اٹھ گئیں۔ علیؑ اپنی سوچ میں غلطیاں اور دفور غم کے سبب خاموش تھے۔ پیغمبرؐ کا سکوت طولانی ہوتا جا رہا ہے ان کی آنکھیں ایک کونے کی طرف تھیں اور ان سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے وہ اپنی فکر میں غرق تھے کہ تمام لوگ وہاں سے چلے گئے۔

اپنے باپ کے غم نے مجھے بے چین کر دیا اور میں حالت غم میں فریاد کرتی ہوں  
اے بابا جان آپ کے غم نے مجھ پر غم و اندوہ کے پہاڑ توڑ دیئے ہیں۔

انہوں نے میری اس بات کے جواب میں ایک ایسے لہجہ میں جس سے اطمینان اور آسودگی جھلک رہی تھی۔ فرمایا آج کے بعد تمہارے باپ کے لیے کوئی غم و اندوہ نہیں  
اس کے بعد میرے پدر بزرگوار کے لب بند ہو گئے۔

وہ لہجائے مبارک کہ جو پیغام وحی کی ترجمانی کرتے رہے وہ لب ہائے مبارک  
جو اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کو اظہار شفقت کے طور پر چومتے رہے وہ اب ساکت  
ہو گئے تھے، بند ہو گئے تھے انہوں نے بہت دیر تک میری طرف دیکھا اور وہ ،

لگا ہیں بند ہو گئیں حلق سے خون بہنے لگا۔

ان کا مبارک علیؑ کے سینہ پر تھا علیؑ پر ایک اندوہناک خموشی طاری تھی ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مردہ ساکت و صامت بیٹھا ہو۔

ہر طرف سکوت مرگ طاری تھا تمام فضا بوجھل تھی یہ وحشتناک لمحے رفتہ رفتہ گزر رہے تھے اچانک پیغمبرؐ کے دونوں ہاتھ جو اسامہ کے سر پر دعا کے لیے بلند تھے ان کے پہلوؤں میں گر گئے لب ہاتے مبارک کو حرکت ہوئی آواز آئی۔

الی الرقیق الاعلیٰ اور اس کے بعد سب کچھ تمام ہو گیا

اجاہ یا اجاہ (ہا ہا جان ! اے بابا جان)

احباب رب و دعاؑ (آپؐ نے اپنے رب کی دعوت کو قبول کر لیا ہے)

الی جبریل بیغاہ (آپؐ جبریل کے مسکن کی طرف چلے گئے)

ناگہان باہر شہر داخل کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ شہر تردد اور ہراس کی لپیٹ میں آ گیا میں نے حضرت عمرؓ کی آواز سنی وہ کہہ رہے تھے کہ ”ہمیں پیغمبرؐ کی موت نہیں آئی وہ جناب علیؑ کی طرح آسمان پر چلے گئے ہیں اور پھر لوٹ کر آئیں گے جو کوئی یہ کہے گا کہ پیغمبرؐ مر گئے وہ منافق ہے۔ میں اس کی گردن اڑا دوں گا؟“

کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ میں نے دیکھا کہ دونوں، حضرت ابو بکر و عمرؓ آئے حضرت ابو بکرؓ میرے بابا کے چہرے سے چادر ہٹا کر دیکھا کریا کیا اور چلے گئے۔ حضرت عمرؓ بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔

علیؑ پیغمبرؐ کے غسل و کفن کے انتظامات میں مصروف تھے

میرے شوہر ابوالحسن میرے بابا کے پاک بدن کو غسل دیتے جلتے تھے وہ پیغمبرؐ کے تن اطر پر پانی ڈال رہے تھے مگر خود ان کے وجود میں آتش بزم بھڑک رہی تھی لوگوں نے اپنے پیغمبرؐ کو کھدوایا۔ بے پناہ ہوں سے ان کی پناہ چھین گئی اصحاب اپنے شفقت رہبر سے محروم ہو گئے۔ مگر میرا اور علیؑ کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ہم سے ہمارا سب کچھ چھین گیا ناگہان مجھے احساس ہوا کہ ہم دونوں اس شہر میں اس

دنیا میں بالکل تنہا رہ گئے ہیں نہ ہمارا کوئی مونس ہے اور نہ ہمدرد و غم خوار یوں لگتا تھا جیسے یککھٹ ہر شے بدل گئی ہے ہر چہرہ تبدیل ہو گیا ہے درود یوازہ تک سے وحشت برس رہی ہو اب صداقت کی جگہ سیاست نے قدم جما لیے تھے۔ عہدِ شرافت کے دور لیے جو برادری کے رشتے قائم ہوئے تھے وہ ٹوٹ گئے تھے اور ان کی جگہ عہدِ جاہلیت کے خاندانی قبائلی اور قبائلی رشتے پھر سے دستوار ہونے لگے بھائی ایک دوسرے سے دور ہو گئے اور ہم قبیلہ باہم نزدیک آ گئے ادھر میرے پیر بزرگوار رسول خدا موت سے ہم کنار ہو چکے تھے اور ادھر شیوہ خیت اور اشرافیت کے تن مزد میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔

میرے اور علیؑ کے لیے یہ حادثہ اس قدر سنگین، وحشتناک اور اندوہناک تھا کہ ہم مرکبِ پیغمبر کے علاوہ کوئی اور بات سوچ ہی نہیں سکتے تھے ایک طرف مدینہ کی فضا سیاسیات کی مضبوط سازئی اور آویزش و کشمکش سے پر تھی اور دوسری طرف ہمارے لیے زندگی ایک مکمل خلا بن گئی تھی۔

ایسے میں ہمارے سب سے بڑے چچا عباس آئے ان کے چہرے پر خوف کے بادل سایا کئے ہوئے تھے انہوں نے نامعنی مگر پر تشویش لہجہ میں علیؑ سے خطاب کیا۔  
اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں تاکہ لوگ یہ کہہ سکیں کہ پیغمبر کے چچا نے پیغمبر کے عم زاد کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ خاندان کے دیگر لوگ بھی تمہارے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے اور جب یہ کام انجام پا جائے گا تو پھر دوسروں کے لیے.....“

اچھا! کیا دوسرے اس بات کی طے کر رہے ہیں؟

”تمہیں کل سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

علیؑ نے خطرے کا احساس کیا لیکن جس طرح بجلی کا کوندا ایک لمحہ کے لیے کوندتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے اسی طرح یہ احساس علیؑ کے دل میں ایک لمحہ کے لیے ابھرا اور پھر غائب ہو گیا ان کا باطنی وجود تو غمِ پیغمبر سے لبریز تھا محمدؐ، قربتِ دار

پدر، سرپرست، آموزگار، برادر، دوست، رہبر، پیغمبر غرض علیؑ کے لیے کیا کچھ نہیں تھے۔ وہ علیؑ کی ہستی کا تمام سرمایہ تھے وہ ان کے تمام ایمان و احساس کا مرکز تھے۔ علیؑ کی تمام دنیا پیغمبرؐ کی ذات تھی ان کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ رحلت پیغمبرؐ کے علاوہ کسی بات کے متعلق کچھ سوچ سکیں۔ گویا ان کے لیے خانہ پیغمبرؐ سے باہر کی دنیا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی ان کا تمام وجود احساسِ غم کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا وہ پیغمبرؐ کو غسل دے رہے تھے۔ وہ کار پیغمبرؐ نہیں منہمک تھے اور میں۔ دھڑلے سے رسولؐ علیؑ کے بچوں یعنی خود اپنے بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

یہ حسنؑ ہے جو سات سال کا ہے حنینؑ کی عمر ابھی صرف چھ سال ہے زینبؑ پانچ سال کی ہے اور ام کلثومؑ تو ابھی صرف تیرے سال میں ہے یہ بچے، میرے پارہ ہائے دل ابھی بہت کم سن ہیں اور پیغمبرؐ کے بعد ان کی تقدیر لوگوں کے لطف و عنادت کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتی۔

میر وند شہر سقیفہ کے مقام پر پیغمبرؐ کے مدفن دوست، انصار، جمع ہیں تاکہ وہ انصار میں سے کسی کو پیغمبرؐ کا جانشین منتخب کر لیں انہیں احساس ہے کہ مہاجرین مکہ اس سلسلہ میں کچھ اور منصوبہ بنائے ہیں حضرت ابو بکر و عمر و عبیدہ سقیفہ پہنچتے ہیں وہ انصار کے سامنے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ فرمایا ”آئمہ قریش میں سے ہوں گے“ اس لیے اہل مال سے وہ انصار کو اس بات پر آمادہ کر لیتے ہیں کہ پیغمبرؐ کا جانشین ان کے فرائد داروں میں سے ہونا چاہیے مگر اس دلیل کا نتیجہ کیا برآمد ہوا حضرت ابو بکر کو سقیفہ میں خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔

یہ اندازہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے کہ اس فیصلہ سے فاطمہؑ کے حساس اور آگاہ دل پر کیا گدردی ہوگی۔ دنیا میں کوئی بیٹی اپنے باپ سے حقد و محبت کر سکتی ہے فاطمہؑ کی اپنے باپ سے محبت اس سے کہیں زیادہ پر جوش اور گہری تھی انہیں اپنے باپ سے والہانہ محبت تھی یہ وہ بیٹی تھی جسے ”ام ایہا“ (اپنے باپ کی ماں) کا لقب دیا گیا تھا یہ پیغمبرؐ کی محبت اور نہائی کی ہمد، ان کے رنج و غم میں ان کے لیے باعث تسکین و تسلی تھی یہ

ان کے جہاد کی ساتھی بھی تھی اور ان کے حصار غم میں بھی ان کی رفیق و دمساز تھی۔ پیغمبر کی سب سے آخری اولاد تھی جو اپنے باپ کی کبرستی کے دور میں پیدا ہوئی یہ سب سے چھوٹی، سب سے جہتی بیٹی جو پیغمبر کے آخری ایام میں ان کی واحد اولاد تھی اور جو ان کی رحلت کے بعد ان کی شہادوارث، ان کی عزت کا واحد چراغ ان کے خاندان کا واحد سہارا۔ ان کی نسل کی بقا کی واحد ضمانت ہے۔ صرف یہی وہ بیٹی ہے جس سے رسول کی نسل چلی۔ یہ تنہا معدن رسالت اور سرچشمہ ذریت و عزت ہے یہ زویہ علی ہے ہاں یہ فاطمہ ہے۔

اور فاطمہ کو آخر غرض مادر ہی میں ایک آزمائشی زندگی سے سابقہ بڑا۔ اپنی ماں اور باپ کے سائے میں ان کی زندگی ابتدا ہی سے آلام و مصائب کا شکار رہی اس لیے کہ وہ ایک ایسے وقت میں پیدا ہوئیں جب ان کی ماں کی دولت اور ان کی زندگی کا پر سکون دور ختم ہو چکا تھا ان کی والدہ ضعیف اور کمزور ہو چکی تھیں ان کا سن ۵ برس کا ہو چکا تھا۔ خوش نصیبی فارغ الیابی اور کامیابی کی جگہ اب فقر و فاقہ سختی اور مصیبت کا دور دورہ تھا اپنے اور بیگنے سب ہی مخالف تھے۔

خدیجہ وہ عظیم ہستی جو رسول کی اہر فشریک حیات ہی نہیں تھیں بلکہ شریک کار بھی تھیں پیغمبر کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ با اعتماد ساتھی تھیں ایک ایسے عظیم انسان کے دکھ درد کی شریک تھیں جو اپنے شالوں پر دنیا کی عظیم ترین رسالت کا بار اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ وہ رسالت ہے جو جاہلیت کی تاریکیوں میں روشنی کی علامت ہے جو سردیوں میں ٹھٹھرنے والے انسانوں کو حرارت ایمان بخشنے والی ہے یہ اقتصادی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے، انسانوں کے لیے آزادی کا خروہ ہے یہ ہر طرح کے ظلم و جہالت اور ہر بت پرستی کے خلاف اعلان جہاد ہے۔ یہ سب سے بڑی رسالت اور سب سے آخری نبوت کی منزل ہے اور خدیجہ مادر فاطمہ اس عظیم ذمہ داری میں پوری طرح شریک ہیں۔ ہمہ تن خدمت پیغمبر میں مصروف ہیں۔



ادھر پیغمبرؐ کے باطن میں ایک روحانی انقلاب برپا ہو چکا ہے ان کی فکر و احساس مادی سطح سے بلند اور زندگی حقیقی اور دائمی فوز و فلاح کی طرف منحطف ہو چکی ہے مادہ پرستوں کی دشمنی، ان کے بغض و عناد اور ان کی کینہ پروری کی آگ نے تمام ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے مادر فاطمہؑ محمدؐ کے مسائل اور ان کا انقلابی تحریک میں مہمک ہیں اور محمدؐ خود اپنے انقلابی مشن کی طرف پوری طرح متوجہ ہیں۔ ان کا تمام وقت اور تمام توانائیاں، پیغام الہی کی تبلیغ اور لوگوں کی بھلائی کی جدوجہد کے لیے وقف ہیں اور ایسے میں فاطمہؑ جو اپنی عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں انہیں ماں کی محبت اور باپ کی شفقت کی شدید ضرورت ہے یہ محسوس کرتی ہیں ان کے ماں باپ تو خود ان کی توجہ اور خدمت کے محتاج ہیں خود ان کی طفلانہ اور معصوم محبت کے طلبگار ہیں انہوں نے دیکھا کہ ان کے والدین کی زندگی کا بیشتر حصہ رنج و مصیبت اور استقامت و آزمائش کا شکار رہا ہے ان کے والدین کی باہمی محبت و رنج و مصیبت کے سلسلے میں پروان چڑھ کر رفاقت اور قلوب کی انتہائی بلندی اور ناقابل شکست حدوں تک پہنچ چکی ہے ان کی ماں فدیہ جو ان کے باپ محمدؐ کی وہ رفیق حیات تھیں جس نے ہر امتحان اور آزمائش میں ان کا ساتھ دیا یہاں تک کہ اپنے شوہر کے ساتھ ان کی زندگی گویا ”مرگ مشترک“ کا نمونہ تھی ان دونوں کا مشترک گھر ان کے باپ کی بے گبری کا واحد تدارک تھا۔ ان کی ماں نے ان کے باپ کا اس وقت ساتھ دیا جب اپنے امدیہ بچنے سب ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے انہوں نے پیہر سے اس وقت محبت اور غلوں پر تاجیب وہ ہر شخص کی دشمنی اور نفرت کا نشانہ تھے۔ جب وہ تنہا تھے تو یہ ان کی رفیق تھیں یہ ان کی مونس و غم خوار تھیں۔ ان کی ہمت بڑھانے والی اور ان کے دکھ درد بانٹنے والی تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ محبت جو رنج اور مصیبت کے سلسلے میں پروان چڑھتی ہے اس محبت سے جو خوشحالی اور مسرت کے ماحول میں پروان چڑھے کہیں زیادہ گہری اور سچی ہوتی ہے اس محبت میں روح لطافت کے اس نکتہ کمال تک پہنچ جاتی

ہے۔ جہاں دوست کی دوستی، دوست پر ایمان بن جاتی ہے جہاں اگر دوست کے لیے جان قربان کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو انسان اس قربانی کو بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ جہاں انسان اپنے وجود کی گہرائیوں میں دوست کے ساتھ یکسانیت محسوس کرتا ہے اور اسی احساس کے سہارے زندہ رہتا ہے دوست بھی اپنے دوست کی محبت کا جواب دیتا ہے۔ محبت اور عشق دوستی کی لطافت اور پاکیزگی کی بلند ترین سطح ہے دونوں ایک ہی جذبہ نہیں ہیں۔ بظاہر دوستی اور محبت ایک ہی بات نظر آتے ہیں لیکن ان کی جڑیں مختلف ہیں دوستی دوطرفہ عمل ہے دوطرفہ ایثار اور اشتراک کی جہت ہے جبکہ عشق تسلیم و ایثار کی منزل ہے۔ محبوب کی رضا اور خوشنوی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی منزل ہے عشق خود اپنا اجر ہے عاشق محبوب سے کوئی اجر کوئی معاوضہ کوئی قیمت طلب نہیں کرتا۔ عشق اور دوستی دو مختلف بلکہ ایک حد تک متضاد جہت رکھنے والے جذبہ ہیں۔

فاطمہ کو اپنے باپ سے والہانہ محبت تھی اور یہ محبت اس حد پر تھی کہ جس حد تک دنیا میں کوئی اور بیٹی اپنے باپ سے محبت نہیں کر سکتی اپنے باپ سے ان کی محبت اور ان کا تعلق ناقابل شکست اور ان کا خلوص ناقابل بیان حد تک گہرا تھا اور اسی تعلق اور احساس یکسانیت نے انہیں وہ ہمت اور توانائی عطا کی جس کی بدولت انہوں نے اپنی زندگی کے تمام آلام و مصائب کا مقابلہ کیا وہ ان حالات سے دوچار تھیں جن کی توضیح و تشریح ممکن نہیں ہے۔ ان کے عظیم اور بلند ہمت پدر بزرگوار چاروں طرف سے عداوت اور دشمنی کا نشانہ تھے وہ اپنے وطن میں اجنبی اور اپنے شہر میں بیگانہ تھے وہ اپنے لوگوں کے، جموں میں تنہا تھے اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم تھے وہ اپنے ہم زبانوں سے درمیان تھے مگر کوئی بھی ان کا ہم آواز نہیں تھا وہ جہل و بہت پرستی کے چوطرفہ حملوں کی زد پر تھے۔ وحشی شیوخ، پست اشرف، دولت کے مجادیوں اور غلامی کا کاروبار کرنے والے کینہ فطرت لوگوں سے ان کی زبردست کشمکش اور تصادم تھا اپنے شانوں پر رسالت کا عظیم بار لیے

وہ یکہ و تنہا تھے۔ کوئی ان کا مولس و بہم نہیں تھا اس طویل راہ میں جو غلامی سے  
 آزاد کی تک راہ ہے۔ ان کا کوئی ہمسفر نہیں تھا۔ مکہ کی تاریک وادیوں سے حرا کی پرندوں  
 جو شبنم تک وہ اکیلے تھے ان کی روح عوام کی بے حسی، فکری جمود، جہالت اور کینہ  
 پروری کے سبب رنجیدہ اور ان کا جسم دشمنوں کی سنگ بادی اور ایذا رسانی کے نتیجے میں  
 زخمی تھا وہ قوم جس پر انہیں مبعوث کیا گیا تھا اور جس کی ترقی، خوشحال اور نجات کے  
 وہ سب سے زیادہ خواہش مند تھے وہی قوم سب سے زیادہ ان کے درپے آزار اور  
 انہیں نقصان پہنچانے پر کمر بستہ تھی اور ان کے اپنے رشتہ دار جو اوروں کے مقابلہ میں  
 ان سے نزدیک تھے وہی انہیں سب سے زیادہ تکلیف پہنچانے والے اور سب  
 سے زیادہ بیگانگی اور دوری کا اظہار کرنے والے تھے ان حالات میں پیغمبر ایک ایسی  
 تنہا اور درد مند شخصیت تھے جس کا ایک رخ وحی کا التهاب ہے تو دوسرا رخ عشق  
 و ایمان کی حرارت جو ایک طرف اپنی قوم کی دشمنی اور مخلوق کی ایذا رسانی کا شکار ہے  
 تو دوسری طرف تنہائی اور یکسوی سے دوچار ہے جس کے کاندھوں پر اس عظیم امانت  
 کا بوجھ ہے جس امانت کے بار کو اٹھانے سے آسمان، زمین، اور پہاڑوں نے  
 انکار کر دیا تھا جس کے قلب پر سلسل وہ آیات الہی نازل ہو رہی ہیں مگر جنہیں اگر  
 پہاڑوں پر نازل کیا جاتا تو وہ ان کی بیعت سے ریزہ ریزہ ہو جاتے اور وہ ان تمام  
 مسائل اور مصائب میں محصور، ہر روز، اس آتش شوق سے مجبور ہو کر جس نے ان  
 کے وجود کو مشغل اور متحرک کر رکھا تھا لوگوں کی ہدایت کے شوق میں صبح سے شام تک  
 ہنر کے گلی کوچوں میں تنہا کار تبلیغ میں مصروف نظر آتے ہیں کبھی کوہ صفا پر  
 چڑھ کر خواب غفلت کا شکار لوگوں کو مستقبل کے خطرہ کا احساس دلا کر بیدار کرنے  
 کی کوشش کرتے ہیں کبھی اشراف قریش کے دارلندہ کے نزدیک مسجد الحرام کے صحن  
 میں تین سو پینچ گنگ، بے شعور، اور بے جان بتوں کے روبرو جنہیں  
 لوگوں نے اپنا معبود بنا رکھا تھا اٹھائے بیداری اور ندائے آزادی بلند کرتے ہیں  
 لوگوں کو دعوتِ توحید دیتے ہیں انہیں باطل کی غلامی سے آزاد ہونے کا پیغام سناتے

ہیں مگر کوئی ان کی آواز کو نہیں سنتا۔ تمام دن اسی طرح کی مصروفیت اور مشقت میں گذرتا ہے یہاں تک کہ دن ڈھلنے لگتا ہے تو پیغمبر خستہ و در ماندہ ایسی حالت میں کہ ان کا جسم زخموں سے نڈھال اور ان کا دل اس غم سے لبریں بجے نیل و سرمہ اپنے گھر کی طرف لوٹتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف شور و غوغا و دشنام اور اتہزار کی آوازیں ان کا تعاقب کرتی ہیں۔ مگر گھر میں ہر طرف خاموشی اور ویرانی کا راج ہے ہاں دور آنکھیں جن میں ایمان اور محبت کی شمعیں فروزاں ہیں ان کے انتظار میں ہمدن مشتاق ہیں۔

اور فاطمہؑ جو اس وقت بہت کم سن تھیں جو ایک کمزور و ناتواں لڑکی تھیں۔ ان تمام حالات میں اپنے والد کے ساتھ ہوتیں۔ شہر کے ان گلی کوچوں میں جو دشمنی سے پرتھے مسیروں میں جہاں پیغمبر کو دشنام اور طنز و اتہزار کا نشانہ بنایا جاتا ہے ہر جگہ وہ اپنے باپ کے قدم بہ قدم نظر آتیں کسی ایسے پرندہ کی طرح جس کا بچہ آشیانہ سے جدا ہو کر خو غمخوار اور وحشی حالوروں کے پنجہ میں پھنس گیا ہو وہ اپنے باپ کے لیے مضطر اور بے تاب نظر آتیں وہ تنہا اپنے باپ کی محافظ تھیں وہ اپنے کمزور وجود کی تمام توانائیوں کے ساتھ اپنے باپ کو اپنے حصارِ عافیت میں لینے کی کوشش کرتیں وہ اپنے کمزور بازوؤں کو اپنے عظیم مگر تنہا باپ کے گرد حاصل کر دیتیں اپنی نازک انگلیوں سے جو لطف و محبت کا مجسمہ تھیں اپنے پدر بزرگوار کے سر اور ہاتھوں کو خون سے پاک کرتیں ان کے زخموں کو دھو تیں اپنے معصوم کلمات سے اس مرد بزرگ کو جو کلماتِ خدا کا حامل تھا تسلی دیتیں اور پھر اس تنہا اور غم زدہ عظیم شخصیت کو واپس گھر لے آتیں اور اپنے غم زدہ باپ اور ماں دونوں کے لیے تسکین اور راحت کا سامان فراہم کرتیں۔

جب پیغمبر سفر طائف سے اس حالت میں واپس لوٹے کہ ان کا تمام جسم لہو لہان تھا تو اس وقت فاطمہؑ ہی تھیں جنہوں نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور اپنی طفلانہ باتوں اور معصومانہ تسلیوں کے ذریعے ان کی دلبری کی ان سے اس قدر

بہدردی اور محبت کا اظہار کیا کہ پیغمبر اپنے زخموں کی تکلیف بھول کر بیٹی کی باتوں اور اس کی محبت سے لطف اندوز ہونے لگے۔ پھر شعب ابی طالب کے تین سالہ دور قید و تنہائی میں یہ بیٹی اپنی غم زدہ اور غنیف ماں اور اپنے رنجیدہ اور محصور باپ کی ہر طرح خدمت اور دلجوئی کرتی رہی اور اس آزمائشی دور میں آپؐ نے بھوک پریشانی، سختی اور تنہائی کی بے شمار مصیبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں پھر جب آپؐ کی مادر گرامی، خدیجہؓ اور رسولؐ کے عم بزرگوار، ابوطالبؓ اس دنیا سے الگ ہو گئے اور دونوں کی وفات نے رسولؐ کی زندگی میں ایک وحشت ناک خلا پیدا کر دیا تو یہ فاطمہؓ بھی تھیں۔ جنہوں نے اپنی بے مثال محبت سے اس خلا کو پر کیا یہ وہ دور تھا جب پیغمبرؐ ہر طرف سے بے یار و مددگار ہو گئے تھے نہ شہر میں ان کا کوئی محافظ و رفیق تھا اور نہ گھر میں کوئی مولس و غم خوار، اس تنہائی اور بے کسی کے احساس کا مداوا فاطمہؓ نے اپنی محبت اپنے خلوص اور اپنے جذبہٴ ایثار سے کیا

فاطمہؓ نے اپنے پدر بزرگوار سے اس طرح محبت کی جیسے ایک ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے انہوں نے اپنی تمام زندگی اپنا تمام وجود اپنی تمام محبت اور اپنا جوش ایمان غرض اپنی زندگی کا ایک لمحہ اپنے پدر بزرگوار کے لیے وقف کر دیا انہوں نے اپنی محبت سے اپنے باپ کے عاطفہٴ پدری کی تسکین کی اور ان کی رسالت پر ایمان کے ذریعے انہیں قوت و اختیار کا تحفہ دیا۔ پھر جب پیغمبرؐ نے علیؓ کے فقر و شرف کی وجہ سے انہیں آپؐ کا شریک حیات منتخب کیا تو فاطمہؓ نے اس انتخاب کو پوری خوش دلی سے قبول کر کے اپنے باپ کو تحفہٴ امید و مسرت پیش کیا۔ پھر حسنؓ، حسینؓ اور زینبؓ کی شکل میں آپؐ نے اپنے والد بزرگوار کو جن کا دل اولاد کے غم سے داغ داغ تھا، جن کے تین بیٹے کم سنی میں اور تین بیٹیاں جوانی میں داغ مفارقت دے چکی تھیں ان کی زندگی کا شیریں ترین اور عزیز ترین ہدیہ پیش کیا حقیقت یہ ہے کہ فاطمہؓ کی تمام زندگی ان کی ۱۸ یا ۲۸ سالہ مدت حیات کا ایک ایک لمحہ اپنے باپ کی محبت، ان کی خدمت اور خوشنودی کے لیے وقف تھا یہ محبت ایک

بیٹی کی محبت سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ تعلق رسمی ایمان و عقیدت سے زیادہ گہرا اور خالص تھا یہ محبت، محبت کی عام سطح سے بہت بلند تھی۔ ان ذریعے اور پاکیزہ جذبات کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ فاطمہؑ نے اپنے وجود کا تار و پود اپنی بہن سے بنا یا تھا اور انہوں نے اپنی احساسات کے ذریعہ خود کو اپنے پیہر بزرگوار کے جسم و جان کے ساتھ مربوط اور پیوستہ کر لیا تھا ان کا وجود ان کی زندگی اور اس کی تمام معنویت یہی تعلق تھا جو انہیں اپنے والد سے تھا اور یہ تعلق اتنا ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھا جس کی تشریح ممکن نہیں ہے۔

اور اب موت کی تلوار نے ناگہاں ان تمام رشتوں کو قطع کر دیا ہے۔ فاطمہؑ اب اپنے باپ سے بچھڑ گئیں اب انہیں اسی خلا میں زندگی گزارنی ہے۔

فاطمہؑ کے دل نازک اور تن ضعیف پر یہ ضرب غم کس قدر ہلکا نہ تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ بیٹی ہے جس کی زندگی اپنے باپ کی محبت اور ان کی رسالت پر ایمان تھا۔ فاطمہؑ اپنے باپ کے لیے اور ان کے حوالے سے زندہ تھیں اور اب موت نے ان کے باپ کو ان سے چھین لیا تھا۔ کون بنا سکتا ہے کہ ان کے لیے ان کے باپ کی رحلت کس قدر ہولناک اور سنگین سانحہ تھی۔

یہ محض امر اتفاقی نہیں تھا کہ پیغمبرؐ نے بستر مرگ پر صرف ان کو تسلی دینا ضروری سمجھا تا کہ وہ فرقت پدر کے درد سے کو برداشت کر سکیں اور یہ تسلی بھی کیسی عجیب تھی یہ خود فاطمہؑ کی موت کا مژدہ تھا۔ پیغمبرؐ نے انہیں یہ خوشخبری دی تھی کہ وہ دوسری دنیا میں سب سے پہلے اپنے باپ سے جا کر ملیں گی یہی وہ تسلی تھی جس نے بیٹی کو اپنے باپ سے جہادی کا مدد برداشت کرنے کی ہمت عطا۔

فاطمہؑ کے لیے یہ وہ شدید ترین ضرب غم تھی جو کسی انسان کے دل پر لگ سکتی ہے قدرت نے انہیں اس عظیم غم سے دوچار کیا تھا جس سے زیادہ اور کوئی مدد ممکن نہیں ہو سکتا۔ ان کے لیے ان کے باپ کی موت کا غم بہت بڑا غم تھا۔ مگر ابھی وہ اس غم کو پوری طرح سہارا بھی نہ پائی تھیں کہ حالات نے ایک دوسرے درد سے دوچار

کر دیا یہ دوسری ضرب بھم پہلے بھم کی طرح شدید نہ پہنچی مگر یہ زخم شاید پہلے زخم سے زیادہ گہرا تھا۔ فاطمہؓ پر نہایت کم وقت میں پے درپے بھم کے دو پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ابھی وہ فرقت پدر کے صدمے سے بے حال تھیں کہ انہوں نے سنا کہ کسی اور کو جانشین پیغمبرؐ منتخب کر لیا گیا ہے اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس منصب پر کس شخص کو منتخب کیا گیا بہر حال جو کوئی بھی ہو علیؑ نہیں ہیں۔

اب ہر بات واضح ہو گئی تھی کیوں پیغمبرؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر مسلمانوں کے تمام قافلہوں کو قبل اس کے کہ وہ اپنی اپنی جگہوں کی طرف لوٹیں غدیر خم میں مجتمع کر کے ولایت علیؑ کا اعلان فرمایا اور ان سب سے یہ اقرار لیا کہ جیسے نبیؐ مولا ہیں۔ ویسے ہی علیؑ بھی مولا ہیں۔

کیوں اسی سفر میں پیغمبرؐ قبل اس کے کہ مدینہ میں وارد ہو سکیں ایک پہاڑی گھاٹی میں جہاں بارہ افراد چھپے ہوئے تھے قاتلانہ حملہ کا شکار ہوتے ہوئے پہنچے کیوں ان لوگوں نے جو گین گاہوں میں چھپے ہوئے تھے یہ کوشش کی کہ وہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھ علیؑ کو بھی قتل کر دیں۔ یہ سازش واقعہ غدیر کے بعد سامنے آئی اس لیے اس کا اعلان غدیر سے لے لیتے تعلق تھا۔ اس لیے کہ غدیر کے اہم اعلان کے بعد قتل پیغمبرؐ کی سازش کو اتفاقی حادثہ قرار دیکر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان دونوں باتوں میں بڑا قرینہ اور گہرا ربط ہے۔

اور پھر کیوں پیغمبرؐ نے ان لوگوں کے نام پر وہ راز ہی میں بنے دیئے حالانکہ انہیں قدرت نے اس سازش سے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا اور انہوں نے ان لوگوں کو کمین گاہوں سے ہٹانے کا حکم دیا تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے ان لوگوں کے نام افشاء نہیں کئے حالانکہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بالخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ نے پیغمبرؐ کی زندگی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو تفصیل سے محفوظ کر لیا ہے اور اہم باب پیغمبرؐ نے ہر واقعہ کی جزئیات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے تو پھر اس بات پر مزید حیرت ہوتی ہے کہ آخر اس واقعہ کی تفصیلات کیوں بیان نہیں کی گئیں۔

پھر ایسا ہوا کہ پیغمبرؐ اپنی زندگی کی آخری جنگ، جنگ تبوک میں باوجود اپنی پیراۓ سال کے خود بھی تشریف لے گئے اور اپنے ان تمام اصحاب کو بھی جو سن رسیدہ بھی تھے ارجن کا فوجی ہمراہوں سے زیادہ سیاسی امور سے تعلق تھا اپنے ہمراہ اس عہد جنگ پر لے گئے جہاں روم کی طاقتور سپاہ سے مقابلہ میں موت کا شدید خطرہ تھا۔ لیکن اس موقع پر علیؑ کے ساتھ استغاثی سلوک کیا گیا، پیغمبرؐ، علیؑ کو ان کی خواہش کے خلاف مدینہ میں ہی چھوڑ گئے۔ حالانکہ منافق اور یہودی علیؑ پر طعنہ زن تھے اور حالانکہ علیؑ مرد میدان اور صاحبِ سیف تھے انہوں نے تمام غزوات میں بے مثال بہادری کے کارنامے انجام دیئے تھے مگر پیغمبرؐ نے علیؑ کو مدینہ میں مقیم رکھنے کا فیصلہ کیا اور فرمایا۔ میں تمہیں مدینہ میں اپنے ترکہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ رہا ہوں کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔ پھر کیوں پیغمبرؐ نے اپنے مرض الموت کی حالت میں بھی روم کی طرف لشکر بھیجنے کا اہتمام فرمایا۔ اور وہ بھی محض ایک جنگ انتقامی کے لیے نہ کہ کسی دفاعی جنگ کے لیے جس کی ضرورت فوری ہوتی ہے۔

پھر کیوں پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور دوسرے بزرگ اصحاب اور سیاست داں اس لشکر کے ہمراہ جائیں اور کیوں آپؐ نے ایک ایسے لشکر کی امارت اور سالاری جس میں تمام بزرگ صحابی شریک تھے ایک اٹھارہ سالہ نوجوان اسامہ کے سپرد کی اور جب لوگوں نے آپؐ کے اس انتخاب پر اسامہ کی کم سنی کے سبب اعتراض کیا تو آپؐ نے سخت ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار فرمایا اور شدت سے اس بات کی تاکید کی کہ مسلمانوں کی امارت اور سالاری کے لیے سن و سال کو ہمیں اہلیت و لیاقت کو دیکھا جاتا ہے۔

اور کیوں پیغمبرؐ اپنے مرض کی شدت کے باوجود لشکر اسامہ کی روانگی کے بارے میں اس قدر زیادہ فکرمند تھے کہ آپؐ نے اس کا بار بار حکم دیا اور لشکر کی جلد روانگی



پراصر اڑکیا۔ یہاں تک کہ جب آپؐ کے حکم کے باوجود لشکر روانہ نہ ہوا تو آپؐ نے حکم عدولیٰ کرنے والوں پر نفرین کی آخر پیغمبرؐ کیوں اس قدر شدت سے یہ چاہتے تھے کہ لشکر اسامہ روم کی طرف روانہ ہو جائے اور تمام بزرگ صحابی اور شیوخ اس لشکر کے ساتھ روانہ ہو جائیں مگر علیؓ رسولؐ کے ساتھ مدینہ ہی میں مقیم رہیں کیوں پیغمبرؐ نے اپنے آخری لمحات میں کاغذ اور قلم طلب کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے لیے ایسا نوشتہ لکھ دوں کہ تم ہرگز گمراہ نہ ہو سکو اور کیوں لوگوں نے یہ چاہا کہ پیغمبرؐ کوئی نوشتہ نہ لکھ سکیں۔ یہاں تک کہ وہ پیغمبرؐ کے سامنے بحث و تکرار اور شور و غل کرنے لگے جس سے پیغمبرؐ آزرہ ہو گئے اور انہیں اپنے حکم نہ مانے جانے پر توہین محسوس ہوئی۔ پیغمبرؐ کی ازواج پس پردہ آہ و زاری کر رہی تھیں کہ آخر پیغمبرؐ جب کاغذ اور قلم طلب کر رہے ہیں تاکہ وصیت تحریر کر سکیں تو یہ کیسی آفت ہے کہ انہیں وصیت لکھنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ وہ لوگ جو پیغمبرؐ کے حضور شور و غل کر رہے تھے انہیں ازواج رسولؐ کا یہ گریہ اور مشورہ پسند نہ آسکا اور انہوں نے ازواج کے رونے پر اعتراض کیا، مگر پیغمبرؐ ان صحابہ سے سخت کبیدہ ہوئے۔ آپؐ نے انہیں یارانِ یوسفؑ سے تعبیر کیا اور ان سے کہا کہ یہ خواتین تم سے بہت بہتر ہیں اور اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ وہ لوگ آپؐ کے سامنے سے چلے جائیں

پیغمبرؐ نے اپنے آخری وقت میں فرمایا: میں تم سے تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں مگر حضورؐ نے ان میں سے صرف دو باتوں کا ذکر کیا اور تیسری بات کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی۔ کیوں؟

جس وقت بلالؓ نے اذان دی اور پیغمبرؐ میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ لیٹر سے اٹھ کر نماز کی امامت کے لیے جاسکتے اس وقت آپؐ نے فرمایا علیؓ کو بلاؤ۔ مگر اچانک اپنی بیٹیوں کی اطلاع پر دونوں بزرگ اصحاب آگئے۔ پیغمبرؐ نے انہیں دیکھا اور بغیر کوئی لفظ کہے رخصت کر دیا۔

کیوں.....؟ کیوں.....؟ کیوں.....؟

اور کیوں پیغمبر جو مشکل ترین حالات اور سخت ترین جنگی مہمات کے مواقع پر  
بھی ہمیشہ مطمئن اور پر امید نظر آتے تھے۔ دشمن کی طاقت اور قوت آپ کو کبھی بھی  
ہراساں نہیں کر سکتی تھی مگر اپنی عمر کے آخری ایام میں جو آپ کے اقتدار اور طاقت  
کے عروج کا دور تھا۔ آپ پریشان اور متفکر نظر آتے تھے

کیوں؟ جس رات آپ پر مرض الموت کے حملہ کی ابتدا ہوئی آپ نصف  
شب کو رات کی تہائی میں اپنے خدمت نگار ابو موہبہ کے ہمراہ قبرستان تشریف  
لے گئے دیر تک قبروں سے سرگوشی کرتی رہے اور حسرت ناک لہجہ میں مردوں سے یوں  
مخاطب ہوئے۔

”خدا تمہیں خوش رکھے تمہارا حال اس قوم سے بہتر ہے“

پھر کیوں جیسے جیسے آپ کا وقتِ آخر نزدیک آ رہا تھا آپ بار بار فرماتے  
تھے کہ فتنے تاریک رات کے لشکر کی طرح امدے چلے آ رہے ہیں۔

ہاں! اب تمام سوالوں کے جواب واضح ہو گئے ہیں شب تاریک کی فتنہ ساز قوتوں  
کا آغاز ہو چکا تھا۔ علیؑ پیغمبر کے دفن کے کام میں مہمک رہے اور اصحاب پیغمبرؐ نے علیؑ  
کے حق کو دفن کر دیا۔

گروہ اصحاب اب سقیفہ سے مسجد کی طرف لوٹ آیا ہے تاکہ نو منتخب خلیفہ لوگوں  
کو اپنے انتخاب سے مطلع کریں۔ ادھر علیؑ پیغمبر کے اداس اور فانی گھر سے بیتِ فاطمہؑ  
کی طرف خالی ہاتھ لوٹ آئے ہیں یہ ان کے سکوت اور گوشہ نشینی کے تاریک اور درد  
ناک ۲۵ سالہ دور کا آغاز ہے۔

اور فاطمہؑ اپنی جانِ ناتواں پر درد و غم کی ان بے رحم اور پے پے ضربات کو  
برداشت کر رہی ہیں۔

ان کے پدر بزرگوار، جوان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا تھے جو ان کے محبوب  
ترین عزیز تھے اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اور علیؑ جو ان کے متربک حیات ہونے  
کے ساتھ ساتھ ان کے علم زادان کے دوست ان کے عزیز اور ان کے درد کے محرم

ہیں خانہ نشیں ہو چکے ہیں، وہ خود غلگین اور شکستہ نظر آتے ہیں وہ بالکل تنہا رہ گئے ہیں بہت جلد ہر شخص نے ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ یوں بے جیسے مدینہ انہیں پہچانتا ہی نہ ہو۔

## اسلام — بعدِ صلتِ پیغمبر

اور اسلام، وہ دین جس کے لیے فاطمہؑ اپنے بچپن ہی سے مصروفِ جہاد ہیں اپنی خرد سالی اور ضعف کے باوجود اپنے پدر بزرگوار کے قدم بہ قدم اس راہِ دشوار میں سرگرم سفر ہیں اس راہ میں جہاد کرنے والے اولین مجاہدوں کی صف میں شامل ہو کر سختیاں اور مصیبتیں برداشت کرتی رہیں، فقر و فاقہ، قید و حصار، بھوک، اور ہر طرح کی پریشانی کا مقابلہ کرتی رہیں یہاں تک کہ ان کا تمام بچپن اور جوانی اسی کشمکش اور آزمائش کی نذر ہو گئی۔ ان کی تمام زندگی اسی جدوجہد میں گزری کہ نخلِ اسلام بار آور ہو سکے انہوں نے اپنے قدموں سے اس راہ کو ہموار کیا جس پر اسلام کے اولین مجاہد اور مہاجر سرگرم سفر ہوئے انہوں نے اپنے تمام ایمان احساس اور توانائی کو اس مقصد کے لیے وقف کیا کہ ان کے والد کا پیغام رسالت اپنے قدم چما سکے اور۔۔۔

لاستی، حتی پرستی، آزادی، عدل، تقویٰ، مساوات اور اخوت کی قدوسی جڑیں پکڑیں تاکہ وہ لوگ جو جہالت اور غفلت کا شکار تھے جن کے دلوں میں جہل اور ظلم کی بیماری کی جڑیں بہت گہری تھیں وہ دانش و آگاہی، علم و عدالت اور پاکیزگی کی راہ پر چل سکیں وہ اس راستہ پر چل سکیں جس راستہ کی تعلیم رسولِ امی دے رہے تھے وہ راستہ جو سنت نبویؐ کہلاتا ہے یعنی علم آگاہی، انصاف، اخوت اور مساوات کا راستہ۔

مگر آج فاطمہؑ کے لیے ہر چیز ٹوٹ پھوٹ گئی تھی ان کی تمام کوششیں، قربانی اور جدوجہد بے نتیجہ نظر آنے لگی تھی۔ ہر دیوار، ہر مورچہ، ہر منارہ جیسے انہوں نے بڑی

محنت اور مصیبت سے بنایا تھا لوٹ کر زمین بوس ہو رہا تھا۔

اسلام کی تقدیر کا سقیفہ میں فیصلہ کر لیا گیا تھا حالانکہ اس وقت وہاں علیؑ، سلمان ابوذر، عمار، مقداد اور ان کے گئے چنے ساتھی موجود نہ تھے۔ اب یہ سب بیتِ فاطمہؑ کے گرد جمع ہو گئے تھے یہ سب عزم و غصہ ہیں گرفتار تھے۔ آخر یہ لوگ علیؑ سے وفادار کیوں ہیں؟ نہ ان کا تعلق قبیلہ اوس و خزرج کے اشراف سے ہے جنہیں مدینہ میں وقار و اعتبار حاصل ہو۔ نہ ان کا تعلق اشراف قریش سے ہے جو اپنے خاندانی تفوق نسلی برتری اور تباہی امتیاز کی وجہ سے خلافتِ رسولؐ کے منصب کے امیدوار ہو سکیں اور عوام و خواص ان کی مخالفت پر اجماع کر سکیں۔ نہ یہ وہ لوگ ہیں جو خاندانی اور طبقاتی بنیاد پر لوگوں کے درمیان کوئی اعتبار حاصل کر سکیں خونی رشتہ یا سرمایہ یا اور کوئی سیاسی مصلحت یا اگر وہی مفادِ عرفی کسی لحاظ سے ان کو کوئی طاقت یا اعتبار حاصل نہیں ہے پھر یہ کون لوگ ہیں یہ سلمان کی طرح غریب بھی ہیں اور غریب الوطن بھی سلمان ایران سے آئے ہوئے تھے اور ابوذر صحرا نشین تھے اور عمار تھے جن کی ماں اترقی کنیز تھیں اور باپ یمنی بدو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو میثمؓ تمہارے طرح معاشرہ کے پس ماندہ اور غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سادہ اور بے سہارا لوگ ہیں اور یہی لوگ علیؑ سے وفادار ہیں اور ان کی وفاداری کا محرک کوئی ذاتی منفعت یا سیاسی مصلحت نہیں ہے یہ وہ لوگ ہیں جو چشمِ پیغمبرؐ میں جو عزیز اور محبوب تھے مگر اب جبکہ پیغمبرؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو دور جاہلیت کی قدریں دوبارہ لوٹ آئیں۔ اب پھر یہ لوگ بے وقار و بے اعتبار ہو گئے۔

### علیؑ۔ واحد سہارا۔

اب ان کے لیے جبر علیؑ اور کوئی سہارا اور پناہ نہیں ہے اور خود علیؑ اب مدینہ میں بے سہارا ہو گئے ہیں۔ پھر رسالتؐ سے قبل کی کہنہ اقدار اب پھر زندہ ہو گئی ہیں ان اقدار کے پیمانہ میں اب علیؑ کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جوان ہیں ان کی عمر

۳۰ سال سے کچھ زیادہ ہے (اور دوسرے شیوخ سن رسیدہ ہیں) اس کے علاوہ علیؑ تہذیب ہیں۔ ان کا کوئی گروہ نہیں ہے وہ سب اسی اور قبائلی گروہ بندی سے بے نیاز ہیں ان کی خوبیاں اور قدریں یہ ہیں۔ تقویٰ، علم و دانش، شجاعت، استقامت، عزمیت، بلند فکری اور شمشیر و سخن کی بے نظیر قدرت، ان کا تمام سرمایہ وہ، منافقین اور دشمنیاں ہیں جو انہیں ان کی پیہر سے دوستی اور فاداری کے سبب ملی ہیں ان کی شمشیر نے میدان جہاد میں ان بہت سارے لوگوں کا خون بہایا ہے۔ جن کے دربار پیغمبرؐ کی طاقت کے آگے سرنگوں ہو کر اب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں مگر ان کے دلوں سے پانے کیلئے دور نہیں ہوئے۔

علیؑ کے شخصی فضائل و کمالات اس حد پر تھے جہاں انسان دوستوں کا محسوس ہوتا تھا کہ لوگ دانستہ یا غیر دانستہ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور علیؑ کی شجاعت اور قہار کاری نے انہوں دشمنوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی دشمنی کا نشاء بنا دیا تھا اور یہ دونوں عوامل یعنی دوستوں کا حسد اور دشمنوں کی عداوت ان کے خلاف بیک وقت کام کر رہے تھے یہ دونوں عوامل علیؑ کی حیثیت کو گھٹانے ان کی تحقیر کرنے اور ان پر لازم تراشیاں کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علیؑ اپنی حیثیت سے محروم ہو کر مدینہ میں تنہا رہ گئے۔

جب کوئی انسان اپنے وقت کی سطح سے اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ دوسرے اس کی عظمت اور انفرادیت کی تاب نہیں لاسکتے۔ تو پھر وہ انسان تنہا ہو جاتا ہے اس کے ٹھوس سرمایہ دنیا اور غنی وجود کے سامنے دوسرے جن کا وجود خام نا پختہ زشت اور تہی ہوتا ہے خود بخود حقیر نظر آنے لگتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ عظیم انسان تو واضح و اکمل سے کام لیتا ہے مگر اس کی عظمت اور انفرادیت دوسروں کے لیے باعث حسد و عداوت بن جاتی ہے دشمن اور دوست دانستہ یا نادانستہ اس کی شخصیت کی نفی کرتے، اس کی عظمت کو پامال کرنے یا اسے اس کے جائز حق سے محروم کرنے کی سازش میں باہم مل جاتے ہیں۔ ان کا مقاد ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتا ہے۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ

دوست جو ہم فکر اور ہمراہ بھی ہوں اس کی عظمت و جود کے سامنے خود کو حقیر اور  
 سچ محسوس کرتے ہیں۔ اپنی تحقیر کا یہ احساس انہیں حسد اور رنج میں مبتلا کر دیتا ہے  
 پھر وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کے فضائل کا انکار کریں یا ان فضیلتوں کو مسخ کر دیں  
 اس کی تحقیر و تحقیف کریں تاکہ اسے خود سے نزدیک لے آئیں ان کے حقیر اور بے ملیہ  
 وجود اور اس کے عظیم اور پر مایہ وجود کے درمیان جو فرق اور فاصلہ ہے اور  
 جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری اور غم بے مائیگی کا شکار رہتے ہیں اس فاصلہ کو  
 کسی طرح کم دیں۔ انہیں اتنی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ خود کو اس کی سطح تک بلند  
 کر سکیں اس لیے وہ اسے اس قدر نیچے اتارنا چاہتے ہیں کہ وہ خود ان کی پست سطح  
 تک گرجائے دوستوں کی یہی تحقیر ہی ہم دشمنوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے اور دوست  
 اور دشمن کا مفاد مشترک ہو جاتا ہے۔ (یعنی اس شخصیت کی تحقیر و تسفیر رفتہ رفتہ  
 دوست، دشمنوں کا آلہ کار بن جاتے ہیں اور اس ظلم میں دشمن کے ساتھ شریک  
 ہو جاتے ہیں۔

یہی وہ حالات تھے جو علیؑ کی حیثیت کو گھٹانے کا سبب بنے  
 یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنی امیہ جو مہاجر اور انصار دونوں کے دشمن  
 تھے اور جو علیؑ اور عمر دونوں سے حضومت رکھتے تھے بالآخر انہوں نے حضرت علیؑ کو  
 تحقیر و ملامت کا ہدف بنالیا وہ ہر طرف یہ چرچا کرنے لگے کہ علیؑ ”ابو تراب“ ہیں وہ  
 نماز نہیں پڑھتے۔ کاتب وحی، جامع قرآن، پیغمبر کے عزیز اور عم زاد بنی امیہ ہیں۔  
 دختر ابوسفیان ام المومنین ہیں۔ چشم پیغمبر میں خانہ ابوسفیان کی حرمت خانہ کعبہ  
 کی طرح ہے فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے اس گھر کو جائے امن اور محل پناہ قرار دیا  
 یہ کیسی جبر ہے کہ علیؑ کو خراب مسجد میں شہید کر دیا گیا، علیؑ مسجد میں کیا کر رہے  
 تھے ان کا محراب سے کیا تعلق تھا، کیا علیؑ نماز پڑھتے تھے؟

ہر شخص جانتا ہے کہ علیؑ کو بدنام کرنے کی اس ہمہ کار محرم وہ کینہ اور  
 عداوت تھی جو جنگ بدر و خندق میں علیؑ کی تلوار کے کاری زخموں کے رد عمل کی

حیثیت رکھتی ہے

مگر وہ لوگ جو بدر و خندق میں علی کے ساتھ بنی امیہ کے خلاف برسرِ پیکار تھے اب بنی امیہ کے ہم آواز ہو گئے۔ آخر کیوں؟ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ سن رسیدہ اصحابِ پیغمبرؐ جو آج تحقیرِ علیؑ کی مہم میں بنی امیہ کے ہم آواز ہو گئے ہیں یہ جنگِ خندق میں دشمن کی مبارز طلبی کے جواب میں سر کو جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ جبکہ علیؑ جو اس وقت صرف ۲۷ سالہ جوان تھے انہوں نے دشمن پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ دشمن وحشت زدہ ہو گیا اور لشکرِ اسلام سے تکبیر کی صدا یں بلند ہوئیں۔ خندق میں علیؑ کی ضرب کی تعریف کرتے ہوئے پیغمبرؐ نے فرمایا ”یومِ خندق علیؑ کی ایک ضربت تمام جن و انس کی عبادت سے افضل ہے“ وہ لوگ جو اس وقت اس ضرب کو دیکھ کر دھند میں آ گئے تھے جن کے دلوں سے تکبیر کی صدا نکلی تھی جنہیں اس ضرب نے ذلت و خوار سے بچا کر عزت و افتخار عطا کیا تھا۔ خوف کے بدلے فتح کا شہرہ سنایا تھا۔ وہی لوگ آج علیؑ کی تحقیر کر رہے ہیں کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں حسد کا ایک بیج خفیہ طور پر جڑ پکڑتا رہا رفتہ رفتہ یہ بیج ایک ایسے تناور درخت میں تبدیل ہو گیا جسکے برگ و بار نے ان کے تمام شعور و احساس کو اپنے سایہ میں لے لیا اور اس کی جڑیں ان کے گوشت و پوست سے گزر کر ان کے استخوانوں میں پیوست ہو گئیں۔

خبر میں ابو بکر علم نے کر گئے اور ناکام و نامراد لوٹے اسی طرح عمر بھی قلعہ کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور شکست کھا کر پلٹ آئے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا اگلی بنی علم ایسے شخص کو دوں گا جو خدا اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور خدا اور اس کا رسولؐ بھی اسے دوست رکھتے ہیں

اور دوسرے دن پیغمبرؐ نے علم علیؑ کو عطا فرمایا اور انہوں نے اپنی حیرت انگیز شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ ایک کے بعد دوسرے قلعہ فتح ہوتا گیا وہ ایک قلعہ کو فتح کرتے تھے لوگ وہاں کا مال و اسباب جمع کرنے میں لگ جاتے تھے اور علیؑ آگے بڑھ کر دوسرے قلعہ پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔

بدر اور احد کے معرکوں میں وہ اصحاب بزرگ جو سن و سال اور اجتماعی حیثیت کے اعتبار سے خود کو برتر خیال کرتے تھے یا تو میدان سے فرار ہو گئے یا خوف اور مایوسی کی حالت میں گوشہ گیر رہے مگر علیؑ میدان کا نزار میں برق و باد کی طرح سرگرم جہاد رہے اور پریشانی اور شکست کے عالم میں بھی انہوں نے اپنی جرأت اور استقامت سے فتح کی راہ ہموار کی۔ جنگ حنین میں کہ جیب بزرگ، معتبر اور مقتدر صحابی حنین کے تنگ درہ سے اس طرح سراپیمہ ہو کر بھاگ رہے تھے کہ ابوسفیان خوشی کے عالم میں طنز کر رہا تھا کہ یہ اس طرح بھاگ رہے ہیں کہ دریائے احمر سے پہلے نہیں رکیں گے۔ اس پریشانی، اذیت و نفرت اور انتشار کے عالم میں علیؑ ایک کوہ ثبات کے مانند اس گھاٹی کے دبانے پر جھکے۔

علیؑ کی شمشیر شربار نے دشمنوں کو تہ تیغ کر کے ان کے ورثاء کی عداوت مول لی مگر اس کے ساتھ ہی ان کی شجاعت کا کارنامے ان کے ہم صف اور ہم رزم دوستوں کے حسد اور حقارت کا نشانہ ٹھہرے۔

اور یہی وہ صورت حال ہے جہاں دشمن اور دوست ہم محاذ نظر آتے ہیں لیکن علیؑ کی شخصیت، فضیلت اور قدرت و کمالات کو گھٹانے کی سازش میں دوست اور دشمن دونوں شریک ہیں دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے دونوں مل کر علیؑ کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں علیؑ کی غیر معمولی عظمت ان کے دلوں میں جو احساس کمتری پیدا کرتی ہے اس احساس کا مداوا یہ تحقیر علیؑ سے کرنا چاہتے ہیں۔ مگر کس طرح؟ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ علیؑ کی فضیلتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ان فضائل کو بیان نہیں کرتے اگر ان کی مجرمانہ، فطرت بہت زیادہ پست ہوتی ہے تو یہ ان فضائل کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے ہیں انہیں تحریف کرتے ہیں ان کے معنی بدل دیتے ہیں وہ علیؑ پر تہمت طرازی کرتے ہیں اور اگر طبیعت کی پستی اس قدر زیادہ سنگین نہیں ہوتی تو وہ علیؑ کی خوبیوں اور ان کی فضیلتوں کے بارے میں سکوت اختیار کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت میں کبھی سے



کوئی کزور نہ کہتے نکال سکیں اور پھر اپنا پورا زور بیان صرف کر کے اس نکتہ کو اس قدر بڑھائیں کہ سرائی کا پہاڑ نظر آنے لگے۔ یا اگر طبیعت میں انصاف حضرت ابوبکر یا حضرت عمر کی حد تک ہو تو پھر علی کے حق کا اعتراف تو کر لیتے ہیں مگر انہیں ان کے حق سے محروم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور اس حق تلفی کا جواز مصلحت کو قرار دیتے ہیں

علیؑ؟ ہاں! مگر ابھی وہ جوان ہیں ابھی انہیں کچھ عرصہ انتظار کرنے دو  
 علیؑ؟ ہاں! مگر وہ مرد شمشیر ہیں، متقی ہیں، عالم ہیں انہیں بھلا سیاست سے کیا واسطہ، وہ بے شک شجاع ہیں مگر جنگی حکمت علیؑ سے واقف نہیں ہیں  
 علیؑ؟ ہاں! مگر ان کے مزاج میں ظرافت زیادہ ہے

علیؑ؟ ہاں! مگر اسلام کا فوری مفاد ان کے حاکم ہونے کے خلاف ہے ان کے دشمن بہت زیادہ ہیں انہوں نے پیغمبرؐ کے ساتھ جنگوں میں بڑے قبیلوں اور بڑے بڑے خاندانوں کے سربراہ اور وہ لوگوں کو قتل کیلئے لوگوں کے دلوں میں یہ کینہ ابھی تازہ ہیں اس لیے ان کا خلیفہ بنایا جانا، مصلحت اسلام کے خلاف ہے  
 علیؑ؟ ہاں! مگر وہ خود ستانی بہت کرتے ہیں (یہاں احساس کمتری کھل کر بول رہا ہے)

علیؑ؟ ہاں! اگر انہیں زمام خلافت سونپ دی جائے تو وہ اس شہر اقتدار کو راہ استوار پر چلا جائیں گے۔ مگر کیا کیا جائے وہ ام خلافت کے حریف ہیں  
 نتیجہ یہ ہوا کہ علیؑ کو ان کے حق سے محروم کرنے میں بنو امیہ کا بھی ہاتھ تھا اور حضرت عمر کا بھی ہاتھ تھا باوجودیکہ عہد پیغمبرؐ کی جنگوں میں حضرت عمر بنی امیہ کے دشمن اور حضرت علیؑ کے ساتھی تھے۔ اور حضرت عثمان کی کامیابی کے لیے حضرت عمر اور بنی امیہ دونوں نے مل کر راہ ہموار کی۔

فاطمہؑ ان سب معاملات کو خوب سمجھتی ہیں ان کی نگاہ سے یہ باتیں پوشیدہ نہیں

ہیں وہ ایک ایسی خانہ نشیں خاتون نہیں ہیں جیسے کسی بات کی کوئی جہز نہ ہو۔ وہ خاتون نا آگاہ نہیں ہیں۔ وہ مبارزہ آرائی کی راہ پر چلنے کا سلیقہ بن جاتی ہیں ان میں حق کے ابلاغ و اظہار کا حوصلہ ہے ان کا بچپن اسلام کی انقلابی تحریک کی آغوش میں گزرا اور ان کی جراتی اسلامی سیاست کے معاملات کے درمیان بسر ہوئی وہ ایک مثالی مسلم خاتون ہیں وہ ایک ایسی خاتون ہیں جن کے نزدیک عفت اخلاقی کا مطلب اجتماعی مسئولیت سے بری الذمہ ہونا نہیں ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ ابھی پیغمبر کو دفن کئے زیادہ وقت نہیں گزرا، خانہ فاطمہؑ میں علیؑ ہیں اور ان کے گرد بنی ہاشم کے چند لوگ ہیں اور چند وہ اصحاب ہیں جو علیؑ سے وفادار ہیں ان لوگوں نے سقیفہ کی کارروائی کو ماننے سے انکار کر دیا ہے یہ نو منتخب خلیفہ کی بیعت کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مسجد نبویؐ میں تھے خلیفہ نے اپنے انتخاب کا اعلان کر کے لوگوں سے بیعت کا مطالبہ کیا لوگوں کی اکثریت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی باقی ماندہ لوگوں کو بھی بیعت کے لیے بلایا جا رہا ہے اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ بہت زیادہ سرگرم نظر آتے ہیں اس سیاسی ہم کے سربراہ وہی ہیں اور وہ سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ لوگوں سے بیعت حاصل کر لی جائے۔ تاکہ نئے خلیفہ کے لیے راہ استوار ہو جائے۔

قبیلہ خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ جو با اثر شخصیت ہیں اور جو سقیفہ میں انصار کی طرف سے خلافت کے امیدوار تھے حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کو قبول نہیں کرتے اور بطور احتجاج مدینہ سے نقل مکانی کر کے شام کی طرف جانے کا قصد کرتے ہیں اچانک خبر آتی ہے کہ انہیں اثنائے راہ میں ایک نادیدہ تیر نے ہلاک کر دیا لوگ کہتے ہیں کہ سعد کو جنوں نے ہلاک کیا۔ یہ بات اس قدر یقین سے کہی جاتی ہے کہ لوگ اس جن کا نام تک دریافت کر لیتے ہیں اور اس کی شان میں نصیح و بلیغ قصیدے کہے جاتے ہیں۔

دیگر قبائل کا کیا رد عمل ہو گا یہ ابھی واضح نہیں ہے اگرچہ اس بات کا امکان

ہے کہ وہ خلافت ابوبکر کو قبول نہ کریں۔ لیکن خطرے کا اصل مرکز اور منبع بیت فاطمہ ہے ہاں اس دن سے آج تک تاریخ کے ہر دور میں بیت فاطمہ ہر حکومت کے لیے خطرے کی علامت رہا ہے۔

اب مدینہ میں تاریخ تین اہم نقطوں کے گرد گردش کر رہی ہے۔ مسجد، خانہ فاطمہ اور خانہ پیغمبر جہاں اب موت کا سکرت طاری ہے۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ تینوں نکتہ یکجا ہیں۔ ان کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے۔ ہاں ان تینوں کے درمیان ایک دیوار سے زیادہ کا فاصلہ نہیں ہے۔

عمر بنی حکومت کے خلاف اس تنہا نقطہ مقاومت سے بہت ناراض ہیں انہوں نے ابوبکر کی خلافت کے استقرار میں بڑی جدوجہد کی ہے راستے میں سیکڑوں رکاوٹوں کو ہٹایا ہے اب یہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہے کہ وہ لوگ جو خلیفہ کی بیعت کرنے سے انکار کر رہے ہیں وہ اس گھر میں جمع ہو کر حکومت کے خلاف ایک حاذق قائم کر لیں اور یہ گھر مسجد سے جو حکومت کا مرکز اور پارلیمنٹ ہے بالکل متصل ہے اور اس گھر میں وہ لوگ ہیں جو پیغمبر کے عزیز ترین اور فخری ترین صحابی ہیں۔

اور اس وقت فاطمہ کی کیفیت ایک ایسے زخمی پرندے کی سی ہے جس کی روح دو سنگین حادثوں سے زخم خوردہ ہے یعنی مرگ پیغمبر اور شکست علی تاریک عموں کے بوجھ سے نڈھال اپنے سر کو جھکائے وہ ماضی کے تصور میں گم نہیں انہیں بار بار یہی خیال آ رہا ہے کہ ان کے پدر بزرگوار کو فکر فردائے پریشان کر رکھا تھا وہ اس بلے میں بہت فکر مند تھے کہ ان کے بعد ”مذہب عدالت و بربری“ کی تاریخ کیا رخ اختیار کرے گا ماضی کی تلخ اور شیریں یادیں ان کے دل پر ہجوم کر رہی ہیں اور ان کی روح ایک ایسے پرندہ کی طرح جو قفس سے آزادی کے لیے بیتاب ہو اپنے والد کی یادوں کے ساتھ ساتھ افق ہائے گذشتہ میں پرواز کر رہی ہے وہ اپنی اس سنگین مصیبت کا ماضی کی خوش گوار یادوں کے ذریعے وقتی اور جزوی مداوا تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ناگہاں ان کے گھر کے باہر زبردست شور و غل اور

ہنگامہ برپا ہوتا ہے اور اس شور و غوغا میں انہیں عمر بن خطاب کی ہولناک آواز سنائی دیتی ہے یہ آواز دمیدم ان کے دروازے سے نزدیک تر ہوتی جا رہی ہے یہی اس گھر کو مع اس کے مکینوں کو نذر آتش کر دوں گا۔

فاطمہؓ نے یہ جملہ مہاف طور پر سنا اب یہ آواز بہت نزدیک سے آرہی تھی خانہ فاطمہؓ کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہے وہاں لوگ حیرت سے کہہ رہے ہیں۔

کیا اس کے باوجود کہ فاطمہؓ بھی اس گھر میں ہیں۔ (تم اسے نذر آتش کر دو گے) اور عرت قطعی اور دونوں کہہ رہے ہیں کہ۔ ہاں۔

اسی اشار میں عمرؓ کا غلام آگ لے آتا ہے اب آگ بیت فاطمہؓ کے دروازے پر ہے لوگ شور و غل کر رہے ہیں اس شور میں حضرت عمرؓ کی گرجدار آواز سنائی دیتی ہے۔

علی - باہر آؤ۔

آگ کی حدت سے گھر کا دروازہ جھلسا جا رہا ہے دونوں سے شعلوں کی سرخ زبانیں گھر کے اندر داخل ہو رہی ہیں اور حضرت عمرؓ کی آواز لحظہ بہ لحظہ زیادہ گرجدار اور خوفناک ہوتی جا رہی ہے۔

فاطمہؓ جو درخانہ کے متصل ہیں اس صورت حال کو دیکھ رہی ہیں ناگہاں ان کی صدا

فریاد بلند ہوتی ہے اس صدا نے پردہ میں تمام دنیا کے دروغ سمٹے ہوئے ہیں

نے پدربزرگوار، اے اللہ کے رسولؐ آپ کے بعد پسر خطاب اور پسر ابی تمادہ

نے ہم پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے حضرت عمرؓ کے ساتھی اس صدا کو سن کر چند کام بیچھے

لوٹ جاتے ہیں یہ صدا نے پردہ، یہ فریاد و احتجاج کی آواز دفر محبوب خدا کی آواز ہے

کچھ لوگ اس نالہ و فریاد کو سن کر اپنا گریہ ضبط نہیں کر سکے ان کے رونے کی آوازیں

بلند ہونے لگیں کچھ لوگ سراسیمگی کے عالم میں خانہ فاطمہؓ اور خانہ رسولؐ پر نظر میں جملائے

ہوئے ہیں۔

اب یہ عالم ہے کہ جیسے لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں شل ہو گئے ہوں لوگ شرم

سے ہر جھکائے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئے حضرت عمر اب تنہا رہ گئے وہ چند لمحہ دروازے کے قریب کھڑے رہے اس وقت ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں اس طرح کچھ دیر تنہا کھڑے رہنے کے بعد وہ حضرت ابوبکر کی طرف لوٹ گئے۔ اب تمام لوگ حضرت ابوبکر کے گرد انجمتے ہیں لوگ ان سے نہایت افسردہ اور غمناک لہجہ میں اس واقعہ کی روداد بیان کر رہے ہیں۔

پسرانی قحاذ اور پسر خطاب دوبارہ خانہ فاطمہ کی طرف آتے ہیں مگر اس بار ان کے تیور مختلف ہیں۔ وہ خاموش اور سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں حضرت عمر کی درشتی کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر نرمی سے کام لینے کے عادی ہیں۔

فاطمہؓ جنہیں رنج و مصیبت سہنے کی عادت ہے جو کشمکش اور جدوجہد کے ماحول میں پروان چڑھتی ہیں۔ ان کے لیے اگرچہ یہ سانحہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ سنگین سانحہ ہے اور اس وقت وہ اپنے آپ کو ہمیشہ سے زیادہ کمزور اور ناتواں محسوس کر رہی ہیں مگر ان کی یہی کوشش ہے کہ ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے اور اس حادثہ سنگین کے بلے میں وہ سرنگوں نہ ہو جائیں وہ تنہا اپنے گھر کے دروازے کے پاس کھڑی ہوئی ہیں گویا اس گھر کی نگہبانی اور دفاع کر رہی ہیں گویا وہ چاہتی ہیں کہ علی کو جو اس وقت سخت تنہا اور درماندہ ہیں اپنی حمایت اور اور حفاظت سے سہارا دیں۔

دونوں بزرگ گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔ فاطمہؓ اجازت نہیں دیتیں علیؓ کہ جن کے صبر کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے فاطمہؓ سے درخواست کرتے ہیں کہ دونوں کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے، فاطمہؓ علیؓ کی رائے کی مخالفت نہیں کرتیں وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی ان کا سکوت ان کے غم و غصہ کا آئینہ دار ہے علیؓ ان دونوں کو گھر کے اندر بلا لیتے ہیں دونوں داخل ہوتے ہیں۔ فاطمہؓ کو سلام کرتے ہیں، فاطمہؓ غصہ سے اپنا رخ دوسری طرف کر لیتی ہیں اور ان کے سلام کا جواب نہیں دیتیں وہ دروازے سے ہٹ کر گھر کے اندر دینی حصہ میں چلی جاتی ہیں اب

ان کے اور دونوں اصحاب کے درمیان دیوار حائل ہے حضرت ابو بکر کو احساس ہوتا ہے کہ فاطمہ کا غصہ اور ان کی ناراضگی حد سے گذر چکی ہے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہیں گفتگو کس طرح شروع کریں۔

دونوں بزرگوں پر شرم و سکوت کا عالم طاری ہے اس مرحلہ پر ان کے لیے فاطمہ اور علیؑ سے گفتگو کرنا بڑا کٹھن ہے۔

ان دونوں کے پاس صرف علیؑ بیٹھے ہیں گویا وہی ان کے تنہا میزبان ہیں۔

مگر وہ بھی خاموش ہیں اور فاطمہؑ قہر و غضب کے عالم میں پس دیوارِ استادہ ہیں انہوں نے اپنے اور ان دونوں بزرگوں کے درمیان دیوار کو حجاب بنایا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں یہ دیوار ایک ایسی فصیل ہے جسے نہ اس وقت توڑا جا سکتا ہے اور نہ اس کے بعد آج تک توڑا جا سکا۔

ابو بکرؓ نے کوشش کی کہ وہ خود کو سنبھالیں اور اپنی توانائیوں کو مجتمع کر کے گفتگو کا آغاز کریں وقت لحظہ لحظہ کر کے گذرتا جا رہا ہے فاطمہؑ میں مکمل سکوت طاری تھا ایک ایسا سکوت جو سختی ہائے بے شمار سے عبارت تھا ابو بکرؓ کے چہرے پر گہرے غم کے آثار اور ان کے لہجہ میں جذبات کی لرزش تھی انہوں نے نہایت نرمی اور ملائمت سے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا۔

اے رسولِ خداؐ کی محبوبہ دخترِ خداؐ کی قسم مجھے پیغمبرؐ کے قرابت دار اپنے قرابت داروں سے عزیز تر ہیں اور میں تمہیں اپنی بیٹی عاتکہؓ سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں جس دن تمہارے والد کا انتقال ہوا میری دلی تمنائی تھی کہ ان کے بدلے مجھے موت آجاتی تاکہ میں ان کے بعد اس دنیا میں نہ رہتا تمہیں اندازہ ہے کہ میں تمہاری حیثیت کو پہچانتا ہوں تمہارے عز و شرف کا اعتراف کرتا ہوں اور اگر میں نے تمہیں پیغمبرؐ کی میراث سے محروم کیا ہے تو وہ اس وجہ سے کہ میں نے پیغمبرؐ (ان پر درود و سلام ہو) سے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم گروہِ انبیاء میراث نہیں چھوڑتے جو کچھ ہمارا ترک ہے وہ ہمدرد ہے۔“

ابوبکر یہ کہہ کر خاموش ہو گئے، غم بھی ساکت تھے دونوں منتظر تھے کہ دیکھیں اس نرم اور ستائش آمیز گفتگو نے فاطمہؓ کے غم زدہ دل پر کیا اثر کیا ہے۔ فاطمہؓ اس گفتگو کو سن کر ایک لحظہ کے لیے بھی متردد نہیں ہوئیں۔ انہوں نے صاف اور واضح لہجہ میں اپنی گفتگو کا آغاز کیا گویا اب وہ غم و غصہ کا اظہار نہیں کر رہی تھیں بلکہ استدلال کر رہی تھیں۔

اگر میں تم دونوں سے رسول خدا کا قول نقل کروں تو کیا تم اسے قبول کرو گے اور اس پر عمل کرو گے۔

دونوں نے بیک زبان کہا۔ ہاں کیوں نہیں،

فرمایا۔ میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتی ہوں کیا تم دونوں نے رسول خدا کی یہ حدیث نہیں سنی جس میں آپؐ نے فرمایا۔

”فاطمہؓ کی خوشنودی میری خوشنودی ہے اور فاطمہؓ کی ناراضگی میری ناراضگی ہے، جو میری بیٹی فاطمہؓ کو دوست رکھتا ہے وہ مجھے دوست رکھتا ہے جو فاطمہؓ کو خوشنود کرتا ہے وہ مجھے خوشنود کرتا ہے اور جو فاطمہؓ کو ناراض کرتا ہے وہ مجھے ناراض کرتا ہے۔“

دونوں نے جواب دیا کہ بے شک ہم نے رسول خدا سے یہ قول سنا ہے۔

اس پر آپؐ نے بے دریغ فرمایا :

میں خدا اور اس کے فرشتوں کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ہرگز خوش نہیں کیا بلکہ تم نے مجھے ناراض اور ناخوش کیا ہے اور جب میں رسول خدا سے ملاقات کروں گی تو ان سے تم دونوں کی شکایت کروں گی۔

ابوبکر یہ سن کر رونے لگے انہوں نے محسوس کیا کہ اب نہ ان میں کچھ کہنے کی تاب ہے اور نہ فاطمہؓ مزید کچھ سننے کے لیے آمادہ ہیں چنانچہ وہ وہاں سے اٹھ گئے، مگر ان کے پیچھے ہو لیے وہاں سے مسجد میں آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ آشفۃ اور گریان ہیں۔ متفکر اور متردد ہیں۔

مگر حکومت کے کارندوں نے انہیں سمجھایا کہ اس وقت ان کا خلافت سے کنارہ کش ہونا مصلحت اسلام کے خلاف ہے اور وہ بھی لوگوں کی اس دلیل سے قائل ہو گئے ان کے خیال میں ان کا حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا نصرت اسلام اور اجرائے سنت کے لیے ضروری تھا اور اس کے بعد انہوں نے جو سب سے پہلا حکم صادر کیا وہ یہ تھا کہ فدک کو بحق سرکار ضبط کر لیا جائے۔

اس طرح علیؑ مالی اور ذاتی حیثیت سے مفلوج کر دیے گئے اب ان کا انحصار اس آذوقہ پر تھا جو انہیں بیت المال کے سرکاری اداے سے مل سکتا تھا

اس تہیدستی اور تنہائی کے عالم میں علیؑ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ چند لوگ جو ان کی وفاداری کا دم بھرتے تھے کسی دباؤ کے تحت یا اپنی مرضی سے منتشر ہو گئے۔ اب تنہا علیؑ کا بیعت نہ کرنا حکومت کی نظر میں کسی خطرہ کا موجب نہیں تھا پھر یہ بھی کہ صاحبان اقتدار کو اس بات کا یقین تھا کہ جب تک فاطمہؑ زندہ ہیں علیؑ کو بیعت پر مجبور کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ فاطمہؑ کے دل میں ایک ایسی حکومت کے لیے جس کی بنیاد حق پر نہیں تھی کسی طرح کا کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ وہ جب تک زندہ رہیں اس حکومت کی مخالف رہیں اور اس سے شدید ناراضگی اور برہمی کا اظہار کرتی رہیں ان کی اس برہمی اور ناپسندیدگی میں تا دم مرگ کسی ایک لحظہ کے لیے بھی کوئی کمی واقع نہ ہو سکی۔

پیغمبر رحلت فرما چکے، علیؑ خانہ نشین ہو گئے۔ میراث فاطمہؑ (فدک) جو ان کا ان کے شوہر اور بچوں کا وادہ سہارا تھی چھین لی گئی حکومت ابوبکر اور عمر کے ہاتھ میں چلی گئی اور اسلام اور عوام کی تقدیر سیاست کو سونپ دی گئی۔ عبدالرحمن بن عوف عثمان، خالد بن ولید اور سعد بن وقاص جیسے لوگ خلافت کے اصلی کار گذار تھے اور علیؑ خانہ نشین ہو کر قرآن کی جمع اور تدوین میں مصروف ہو گئے وہ مستقبل اسلام کے متعلق فکر مند تھے، بلالؓ مدینہ چھوڑ کر شام میں گوشہ گیر ہو کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے اور سلمان فارسیؓ اپنے پر معنی اور افسردہ لہجہ میں اپنے دنی حذبات کا اظہار



کر کے خاموش ہو گئے انہوں نے ان لوگوں سے جو سقیفہ کی کارروائی میں شریک تھے کہا کہ تم نے وہ کیا جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے تھا تھا اور تم نے وہ نہیں کیا جو تمہیں کرنا چاہیے تھا اس کے بعد وہ عم زدہ اور مایوس ایران کی طرف لوٹ گئے اور مدائن میں اشتغال کر گئے ابوذرؓ جو پیغمبرؐ کے انیس و غم گسار تھے اور عمارؓ جو پیغمبرؐ کو عزیز تھے خدشہ اور بے عمل ہو گئے۔

## مگر فاطمہؓ

مگر فاطمہؓ نے ہمت نہیں ہاری ہر چند کہ ان پر عم و اندوہ کے پہاڑ ٹوٹے مگر ان کے پائے استقامت میں لرزش نہیں ہوئی انہوں نے خلافت اور خلیفہ کے خلاف اپنی جد و جہد جاری رکھی فدک کو واپس لینے کے لیے بھرپور کوشش کی اور اس کوشش میں حکومت پر سخت تنقیدی حملے کئے انہوں نے کوشش کی کہ سب لوگوں پر یہ بات کھل جائے کہ حکومت نے فدک کو چھین کر ان سے سیاسی مخالفت کا انتقام لیا ہے اور اس طرح علیؓ کو اقتصادی طور پر رک پہنچانے کی کوشش کی ہے

فدک ایک چھوٹا سا زرخیز قطعہ تھا اور اگر یہ بہت بڑا قطعہ اراضی بھی ہوتا تو بھی فاطمہؓ کے لیے کسی قطعہ زمین کی یہ اہمیت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے لیے مبارزہ کریں جد و جہد اور کشمکش کی راہ اختیار کریں لیکن فدک کا عصب کیا جانا حکومت کے ظلم و جور کی علامت تھا وہ مسئلہ فدک کے حوالے سے حکومت کی پالیسیوں کو بے نقاد کرنا چاہتی تھیں وہ یہ واضح کرنا چاہتی تھیں کہ حکومت اپنی مصلحت کی قربان گاہ پر حق کو کس طرح قربان کر رہی ہے کس طرح لوگ اس بات سے بھی دریغ نہیں کرتے کہ وہ پیغمبرؐ سے کوئی جھوٹی حدیث منسوب کریں یا ان کے قول کو لفظی اور معنوی طور پر مسخ کر دیں ان کی خواہش تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ وہ حکومت جو ”سنت رسولؐ“ کو اپنا شعار بتاتی ہے خاندان رسولؐ کو کس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہی ہے اسلام

کے قوانین میں ہر باپ کا ورثہ اس کی اولاد کو ملتا ہے یہ لوگ پیغمبرؐ اور ان کی اولاد کو اس عام حق سے بھی محروم کرنا چاہتے ہیں گویا ان کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ اولاد تو چھوڑ سکتا ہے مگر اولاد کے لیے ورثہ نہیں چھوڑ سکتا۔

فدک، فاطمہؑ کی نگاہ میں اقتصادی مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ سیاسی مسئلہ تھا۔ جس کے وسیلہ سے وہ حکومت کے عصبِ حق کے رویہ کو بے نقاب کرنا چاہتی تھیں۔ فاطمہؑ نے اس مسئلہ میں جس قدر جدوجہد کی۔ اس کا مقصد محض مالی فائدہ نہیں تھا جیسا کہ ان کے دشمن اور نادان دوستوں کا خیال ہے

فاطمہؑ نے حالات کے آگے سر نہیں جھکا یا ہر چند کہ مرگ پیغمبرؐ کے صدمہ جانگاہ نے ان کے وجود کو غم کی آگ سے بھر دیا تھا اور اس کے بعد پے درپے واقعات کی سنگین ضربات نے ان کو مجروح اور شکستہ کر دیا تھا۔ ہر چند کہ تمام مہاجر اور انصار سوائے ان چند لوگوں کے جن کو انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا تھا نئی حکومت کو قبول کر چکے تھے اور نئے خلیفہ کی بیعت کر کے سقیفہ کی کارروائی کی تائید کر چکے تھے مگر فاطمہؑ نے ہمت نہیں ہاری فاطمہؑ کو اس بات کی بہت کم امید تھی کہ حالات کے رخ کو بدلا جاسکتا ہے وہ جانتی تھیں کہ علیؑ اپنے حق سے محروم کر دیئے گئے ہیں بازی گران سیاست بہت دنوں سے اپنے لیے زمین ہموار کر رہے تھے اور انہوں نے سقیفہ میں انتخابِ خلیفہ کر کے بازی جیت لی تھی نئی حکومت اور اس کے کارندے ماحول پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے لوگوں نے نئی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا فاطمہؑ ان سب باتوں کو سمجھتی تھیں لیکن لوگوں کی خاموشی اور بے تعلقی کے باوجود حالات کی تمام تر سنگینی اور ناسازگاری کے باوجود وہ یہ سمجھتی تھیں کہ ان پر حق کی راہ میں جدوجہد اور مبارزہ کی جو ذمہ داری ہے وہ اس سے ہری الذمہ نہیں ہو سکتیں وہ اپنی مسؤلیت کو نظر انداز نہیں کر سکتیں اس لیے کہ وہ فاطمہؑ تھیں ان پر باطل کے خلاف جدوجہد کی ذمہ داری تھی اگرچہ انہیں اس جدوجہد میں کامیابی کی توقع بہت کم تھی مگر باطل کے خلاف جہاد ان کا فریضہ تھا ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ نظامِ باطل کے خلاف جہاد کریں اس لیے کہ اگر وہ اس نظام کو شکست نہیں

دے سکتی تھیں تو کم از کم اس کی اصلیت کو بے نقاب تو کر سکتی تھیں وہ اگر باطل کو  
مٹا نہیں سکتی تھیں تو اسے رسوا تو کر سکتی تھیں اگر ان کے لیے حق حاصل کرنا ممکن  
نہیں تھا تو حق کا اثبات کرنا تو ممکن تھا انہوں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا باطل  
کے خلاف حق کا اثبات کیا تاکہ دعویٰ حق زندہ رہے تاکہ آنے والے زمانوں میں  
لوگ سمجھ سکیں کہ جو کچھ ہوا وہ ناحق اور ظلم تھا اور حالات نے باطل کو کامیاب  
اور کامران بنا دیا جبکہ شکست اور محرومی، حق، عدل اور آزادی کے حق میں آئی  
بھی وجہ ہے کہ مدینہ کی فضا تاریخ کے اس عجیب منظر کو دیکھ رہی ہے کہ مسجد  
پیغمبر کے کنارے رات کی تاریک فضاؤں میں ایک مرد اپنی شریک حیات کو جو مرتاپا  
سیاہ لباس عزا میں ملبوس ہے مرکب پر سوار کرتا ہے اور پھر دونوں مدینہ کی پیچ  
در پیچ گلیوں میں گشت کرتے ہیں۔

ان میں جو شخص پیادہ ہے وہ علیؑ ہے اور جو خاتون مرکب پر سوار ہے وہ  
پیغمبرؐ کی محبوب اور مجاہد بیٹی فاطمہؓ ہے دونوں ہر رات اسی طرح اپنے گھر سے برآمد  
ہو کر انصار کے محلوں میں جلتے ہیں۔ انصار نسبتاً مخلص اور بخیر جاندار ہیں جبکہ  
مہاجرین جن کی اکثریت قریش سے تعلق رکھتی ہے ایک دوسرے کے حلیف ہیں ان کا  
ایک دیرینہ سیاسی نظام ہے جو ان کی اجتماعی شیرازہ بندی کا منہاں ہے، اب کہ خلیفہ  
ان میں سے منتخب ہو گیا ہے اور اس انتخاب میں قبائلی اثر و نفوذ کا بڑا اگر داخل  
تھا اس لیے تمام قبیلہ حکومت میں خود کو سہیم اور شریک سمجھتا ہے انصار کی صورت  
اس سے مختلف ہے، انہیں نئی حکومت میں کوئی حصہ نہیں مل سکا ہے سعد بن  
عبادہ انصار کی طرف سے خلافت کے امیدوار تھے مگر انہیں مدینہ چھوڑنے پر مجبور  
ہونا پڑا اور جب وہ شام کی طرف جا رہے تھے تو اثنائے راہ میں انہیں ہلاک کر دیا گیا  
اور ان کے قتل کو جنوں کی کارروائی سے تعبیر کیا گیا۔ انصار نے ابو بکر کے اس استدلال کو  
تسلیم کر لیا کہ پیغمبرؐ کی یہ خواہش تھی کہ خلیفہ قریش میں سے ہو ان کے خاندان میں سے  
ہو اور ان کے قرابت داروں میں سے ہو انہوں نے قول پیغمبرؐ کے احترام اور خاندان

رسالت کی حرمت کے پیش نظر امر خلافت سے دست کشی اختیار کر لی اور حکومت ابوبکر کے سپرد کر دی اس لیے کہ ابوبکر کا تعلق پیغمبر کے قبیلہ سے تھا اور وہ زویر رسول کے باپ تھے اور یہ اس حقیقت کے باوجود کہ انصار کی اکثریت تھی اور وہ مدینہ کے اصل باشندے تھے۔

اور اب فاطمہ ذاتی طور پر ان کے پاس جاتی ہیں وہ ہر شب علی کے ہمراہ ان کے اجتماعات سے خطاب کرتی ہیں، انہیں علی کی ایک ایک فضیلت یاد دلاتی ہیں ان سے پیغمبر کی ایک ایک خواہش بیان کرتی ہیں وہ اپنی عظیم انسانی شخصیت اپنی روحانی معنویت، سیاسی آگاہی اسلام اور اس کے تقاضوں سے اپنی گہری واقفیت اور اپنی قوت منطق و استدلال کو بروئے کار لا کر ان پر علی کے حق کو ثابت کرتی ہیں، علی کو چھوڑ کر جو انتخاب کیا گیا ہے اس کے ناحق ہونے کا اثبات کرتی ہیں لوگوں کو جو غریب دیا گیا ہے اسے آشکار کرتی ہیں اور جلد بازی میں کی گئی سیاسی کارروائی اور اس کی طرف سے غفلت کے نتیجہ میں آئندہ اسلام اور امت مسلمہ کو جو خطرات پیش آنے والے ہیں ان سے متنبہ کرتی ہیں۔

جتنے راویان تاریخ نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے ان میں سے کسی نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ کسی شخص نے کسی موقع پر فاطمہ کی بات سے ذرا سا بھی اختلاف کیا ہو سب لوگ ان کی دلیلوں کو من و عن تسلیم کرتے تھے انتخاب خلیفہ کے باب میں اپنی زبردست غلطی کا اعتراف کرتے تھے علی کے حق ان کی نفیست اور شرف کا اقرار کرتے تھے لیکن جب فاطمہ ان سے یہ مطالبہ کرتی تھیں کہ علی کے حق کو واپس دلوانے کے لیے مدد کریں تو یہ سب معذرت کرتے تھے کہ

اے رسول خدا کی بیٹی، ہم نے ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اگر آپ کے شوہر اور ابن عم، علی ہم سے پہلے رابطہ کر کے اپنے حق خلافت کا مطالبہ کرتے تو ہم ان کے مقابلے میں کسی اور کو ہرگز ترجیح نہ دیتے۔  
انصار کی یہ گفتگو سن کر علی متعجب ہوتے اور حجاج امیر ہجر میں کہتے،

میں رسول خدا کو ان کے گھر میں چھوڑ کر ان کے غسل و کفن سے دست کش ہو کر باہر آجاتا اور حکومت کے جھگڑوں میں پھنس جاتا؟

فاطمہ محسوس کرتی کہ اس موقع پر بھی ہمیشہ کی طرح علی پیغمبر سے عشق و وفاداری کے سبب اپنے حق سے محروم ہو گئے۔ وہ کہتی ہیں

ابوالحسن نے وہی کیا جو انہیں کرنا چاہیے تھا اور کوئی ایسا کام ہمیں کیا جو ان کے شایانِ شان نہیں تھا دوسروں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اس کا حساب لینے والا خدا ہے۔ وہی ان کا محاسبہ کرے گا۔

## فاطمہ کا احساس محرومی

اب ہر بات گویا ختم ہو گئی ہر چیز اپنے انجام کو پہنچ گئی

فاطمہ کو اب صرف موت کا انتظار ہے وہ اپنے آپ کو اس قدر تنہا محسوس کر رہی ہیں جس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے وہ چہرے جو سالہا سال تک ان کے والد کے درگاہِ وہاں نشاۃ تھے وہ لوگ جو ہر جگہ اور ہر موقع پر ان کے ساتھ نظر آتے تھے اب بالکل بدل گئے ہیں وہ تمام چہرے سخت بیگانہ نظر آتے ہیں اب اصحابِ پیغمبر بالکل بدلے ہوئے ہیں مدینہ اب "شہرِ پیغمبر" نہیں رہا اس "شہرِ ایمان" کی فضا کو حکومت و سیاست نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اسلام نے جو انقلاب برپا کیا تھا عرب بدویت کے قالب میں احساں و ایثار و حق پرستی اور خضوع و تشوع کی ہر روح پھونکی تھی انسانی عزت اور شرافت کے جو معیار قائم کئے تھے۔ جہاد و ایمان و تقویٰ کا جو فلسفہ حیات تعلیم کیا تھا اس کی جگہ پرانا نظام پھر عود کر رہا ہے کہنہ روایات، قبائلی نسلی، اور خونی تعصبات سر اٹھا رہے ہیں، قبائلی برتری شخصی خود پسندی، سیاسی گروہ بندی اور مصلحت شناسی کا دور دورہ ہے لوگ گھٹیا مصلحتوں اور حقیقت مفادات کے دام میں پھر سے پھنس گئے ہیں مسلسل ایسی باتیں کی جا رہی ہیں جن سے اسلام کی آتش انقلاب سرد ہو جائے لوگوں میں مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس ختم ہو جائے حید و جہاد اور ترقی کا جذبہ ناپائید

پڑ جائے گویا اسلام کا وہ نور جو روح کو روشن کرتا ہے بجھ جائے اس کے پیغام کی، معزیت مسخ ہو جائے اور اسلام جو فکر و عمل کے لیے ایک مسلسل انقلابی تحریک ہے حکومت کے جامد نظام کے مترادف سمجھا جانے لگا۔

## علیؑ کی گوشہ گیری

علیؑ خانہٴ فاطمہؑ میں گوشہ گیر ہو گئے ہیں ان کے وفادار دوست جو خاندانی اور طبقاتی اعتبار سے بے حیثیت تھے مگر جن کی حیثیت و دل پیغمبرؐ میں بڑی حیثیت تھی جنہوں نے اپنی شخصیت اور حیثیت اپنے ایمان، اخلاص آگاہی اور راہِ حق میں جدوجہد کے حوالے سے بنائی تھی اب سیاست کاروں کی نگاہوں میں بے وقعت قرار پائے ہیں اس کے برعکس موقع شناس اور مصلحت پسند لوگوں کو اپنی حیثیت اور اہمیت بنانے کا ہر موقعہ حاصل ہے

اب فضا خورائے حکومت و سیاست سے اس قدر مایوس ہے کہ اس شور و طغیانی میں لوگوں کے لیے محبت اور اخلاص کی نرم و لطیف آواز کا سننا ممکن نہیں ہے ابوبکرؓ کی شخصیت، عمرؓ کی ہیبت، خالدؓ کی تلوار اور عمرو عاصؓ کی چالاکائی نے مدینہ کی فضاؤں میں ایسی دیواریں بلند کر دی ہیں کہ عوام و خواص اس حصار میں محصور ہو گئے ہیں خانہٴ فاطمہؑ اس حصار سے باہر ہے اور فاطمہؑ کی آواز ان دیواروں کو توڑ کر حصار کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔

## سنگین صورتِ حال

مدینہ میں دشمنانِ فاطمہؑ، ان دشمنوں کے مقابلے میں جن سے مکہ میں سابقہ تھا کہیں زیادہ طاقتور نظر آتے ہیں ان کے والد نے مکہ میں تنہما پورے شہر کی مخالفت کا مقابلہ کیا اس وقت رسولؐ کا حامی اور محافظ اگر کوئی تھا تو وہ ان کی کم سن اور کمزور بیٹی فاطمہؑ تھیں لیکن پیغمبرؐ مسیور الحرام میں جہاں ۳۶۶ بے جان بن رکھے تھے، وہ

پتھر کے بت جنہیں عرب اپنا شیعی اور معبود سمجھتے تھے قریش کے مرکز طاقت دار المذوہ کے سامنے غرض ہر موقع پر بغیر کسی تردد کے بیاں گ دہل اعلان کرتے تھے کہ میں اللہ کی نصرت سے ان سب بتوں کو شکست دوں گا وہ گمراہ عربیوں کو بے زبان اور بے شعور پتھروں سے تشبیہ دیتے تھے وہ ان کے آباء اجداد کی روایت کو جہالت اور غفلت سے تعبیر کرتے تھے اور ان کے تمام بتوں کو خرافات اور بے مایہ قرار دیتے تھے مگر یہ ان کے جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ ان کے اہجہ میں کسی قسم کا ضعف یا افسردگی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ قطعی اور واضح اور دو ٹوک لہجہ میں قوم سے مبارزہ فرماتے تھے اس کے برعکس مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو ان کے اوج و قدرت و طاقت کے عروج کا زمانہ تھا ان کی بات نہیں مانی گئی سپاہ اسامہ کے بارے میں ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی گئی درآغایک اس بارے میں انہوں نے صریحی احکامات صادر فرمائے تھے لیکن پیغمبر کی تاکید و تکرار کے باوجود دعا و نفرین کے باوجود بیماری کے عالم میں ان کی تمام کوششوں اور خواہشوں کے باوجود سپاہ اسامہ نے حرکت نہ کی انہوں نے جس لشکر کو پیش قدمی کا حکم دیا تھا وہ مدینہ کے مضافات میں جو ف کے مقام پر پڑاؤ ڈالے رہا اور لوگ ایک قدم آگے بڑھنے پر تیار نہیں ہوئے۔

اب کیا کہا جائے حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر خود اپنے گھر میں اپنے نزدیک ترین اہل بیت کو ایک تجویز لکھ کر دینا چاہتے تھے مگر وہ تحریر نہ لکھ سکے۔ کچھ وصیت کرنا چاہتے تھے مگر وہ وصیت نہ کر سکے اور جو کچھ کہا وہ تحریف و توجیہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔

فاطمہ کے شوہر علیؑ جو مرد شہیر و جرات تھے جو دور پیغمبر کی تمام جنگی مہموں کے ہیرو تھے علی جنہوں نے شجاعت اور جرات کے وہ کارنامے انجام دیئے کہ تاریخ انگشت بدندان ہے۔ جنگ خندق میں تمام دشمن قبائل نے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اس موقع پر تمام مخالف قوتیں امشرک اور یہودی، اہل کتاب اور کافر ایک خدا کو ماننے والے اور بت پرست اسلام کی مخالفت میں ایک ہو گئی تھیں عربوں اور یہودیوں نے اپنی تمام توانائیوں کو یکجا کر لیا تھا تاکہ اسلام کی فوج انقلابی

تحریک کو کچل دیں اور انقلاب رسالت کے مرکز یعنی مدینہ کو تاخت و تاراج کر دیں  
ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مدینہ کی مٹی تک کھود کے لے جائیں گے ایسے موقع پر علی نے  
جو اس وقت صرف ۲۷ سالہ جوان تھے اپنی ایک کاری ضرب سے جنگ کا نقشہ بدل  
کر رکھ دیا۔ جنگ احد میں جب کفار قریش نے درہ کے ٹکبانوں کو ہلاک کر کے مسلمانوں  
پر یلغار کر دی جب مسلمان لشکر منتشر اور پراگندہ ہو چکا تھا جب لوگ میدان جنگ  
سے فرار کر رہے تھے جب بڑے بڑے صحابی میدان چھوڑ گئے جب پیغمبر تنہا اور تنہا  
رہ گئے تھے اور دشمن نے ان کو زخمی کر دیا تھا جب دشمن ہر طرف سے پیغمبر پر یلغار  
کر رہے تھے اور کوئی ان کی حفاظت کرنے والا نہ تھا ایسے عالم میں صرف علی ہی تھے  
جو اپنی جان پر کھیل کر پیغمبر کے گود ان کی حفاظت کر رہے تھے وہ ایک طوفان کی طرح  
کبھی پیغمبر کے گرد نظر آتے اور کبھی میدان جنگ میں سرفروشی کے جوہر دکھاتے اور  
دشمن کے ان دستوں کو جو شہداء کی لاشوں کو روندتے ہوئے پیغمبر کی طرف یلغار  
کر رہے تھے پیچھے دھکیلتے۔ پھر وہ پیغمبر کی طرف واپس لوٹتے ان کی حفاظت کرتے اور  
پھر کسی آندھی کی طرح میدان جنگ کی طرف سبقت کرتے فرار کرنے والوں کو روکتے ،  
میدان چھوڑنے والوں کو آوازیں دیتے دل شکستہ مجاہدوں کی ہمت بڑھاتے اس کے  
ساتھ ہی وہ حفاظت پیغمبر کے فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پیغمبر کی طرف رجوع  
کرتے اور انہیں دشمنوں کے حملے سے بچاتے یہ علی ہی تھے کہ جن کی فداکاری نے پیغمبر  
کو محفوظ رکھا اور جن کی شجاعت اور سرفروشی کے نتیجہ میں مسلمانوں کا لشکر جو منتشر  
پراگندہ اور دل شکستہ ہو چکا تھا پھر سے مرتب ہوا۔ اور قریش جو پیغمبر سے  
خوش اور شاد کام لاشہبائے شہداء کے نطاکے سے دلشاد اور خون حمزہ سے بدست  
اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے بالآخر میدان چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور یہ علی ہی تھے جنہوں  
نے حنین میں شکست کو فتح سے بدلا اور یہ علی ہی تھے کہ جن کے ہاتھوں پر خیر فتح ہوا۔  
علی وہ مرد شجاع کہ جن کی تلوار میدان جنگ میں دشمنوں کے سروں کو اس طرح  
کاٹتی ہے جیسے کوئی درانتی گندم کی پکی ہوئی فصل کو کاٹتی جائے جن کی شمشیر خون



آشام سے میدان جنگ موت اور خون کا کشتہ زار بن جاتا ہے جن کے گھوڑے کے آگے دشمنوں کے لاشوں کے ڈھیر جمع ہو جاتے ہیں اب خاموش اور غمگین ہیں یہ کیا بات ہے کہ انہوں نے خاموشی اور گوشہ گیری اختیار کر لی علیؑ جن کے چہرے پر کسی نے کبھی خوف کی کوئی ہلکی سی دھج بھی نہیں دیکھی اب ہر اسان نظر آتے ہیں جیسے ان کی فکر افق ہائے تاریک کا مشاہدہ کر رہی ہو۔ جیسے وہ خوفناک اور مایوس کن مستقبل کی فکر میں غلطیاں ہوں۔

فاطمہؑ سوچتی ہیں کہ ان کے شوہر کی شمشیر جوہر دار اب کیوں خاموش ہے یہ وہی شمشیر ہے کہ علیؑ جب بھی جہاد سے لوٹتے تھے یہ تلوار دشمنوں کے خون سے رنگین ہوتی تھی اور جب علیؑ گھر میں داخل ہوتے تھے تو رسول خدا کی شمشیر آبدار کے ساتھ ساتھ اپنی خون آلود تلوار کو ان کے حوالے کر کے نہایت فخر و مباہات کے لہجہ میں ان سے فرمائش کرتے تھے کہ اس تلوار کو دھو کر صاف کر دو۔ مگر عہد پیغمبر کے دس سال مجاہدانہ کارناموں کے باوجود اب آخر کیا ہو گیا ہے کہ علیؑ اس طرح خاموش اور غمگین ہیں اس طرح گوشہ گیر ہو گئے ہیں حتیٰ کہ جب لوگوں نے ان کے گھر پر بیلیفاد کی تو بھی وہ اپنی خاموشی کے حصار سے باہر نہیں نکلے۔ فاطمہؑ دیکھ رہی ہیں کہ اب ایک ایسی کشمکش اور مبارزت کا آغاز ہو چکا ہے جس میں خود پیغمبرؐ عاجز و ناتواں تھے اور جس میں علیؑ جو صاحبِ سیف و علم ہیں اور جن کی ہریت سے میدان جنگ لرزتا تھا مجبوراً ورثہ کست خوردہ نظر آتے تھے اس مہورت حال میں تنہا فاطمہؑ کیا کریں۔

ہیشہ داخلی محاذ پر کشمکش، خارجی دشمن سے جنگ کے مقابلہ میں زیادہ دشوار اور کٹھن ہے اب جس جنگ کا آغاز ہوا ہے اس میں مد مقابل ابولہب، ابو جہل، ابوسفیان، ہند، عقبہ، امیہ بن خلف، اور عکرمہ نہیں ہیں ان پلید چہروں کو سب پہچانتے تھے ان کا ایمان، اسلام، اور انسانی اقدار سے کوئی تعلق نہیں تھا یہ محض اپنی دولت اور طاقت کے لیے جنگ کر رہے تھے ان کی محاذ آرائی کا مقصد اپنے معاشی اور سماجی مفادات کا تحفظ تھا، یہ اپنی معیشت، تجارت، اور طبقائی نظام

کی حفاظت کے لیے اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھے ان سے جنگ رجعت پسندی اور انقلاب غلامی اور آزادی، ذلت اور عزت اور برائی اور اچھائی کی جنگ تھی۔  
 یالیوں کہہ سکتے ہیں کہ اس جنگ میں ایک طرف دشمنانِ انسانیت تھے جو جہل اور تاریکی کے پاسبان تھے اور دوسری طرف انسانیت نواز اور پرچمِ علم و آگہی کے علمبردار تھے۔

مگر اب صورتحال مختلف ہے ایک طرف علی اور فاطمہ ہیں جنہوں نے پیغمبر کی زندگی میں ان کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ جنہوں نے بدرِ واحد و خیبر و حنین کے معرکوں میں شرکت کی مگر اب دوسری طرف کون ہے؟ ابو بکر کہ خاندانِ پیغمبر کو چھوڑ کر پیغمبر پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں جو ان کے بارِ غار ہیں جو ہجرت کے موقع پر ان کے شریکِ سفر ہیں جو زوجہٴ پیغمبر ام المومنین عائشہ کے والد ہیں یہ وہ ہیں کہ جنہوں نے پیغمبر کی بے کسی اور غربت کے دور میں ان کا ساتھ دیا اپنا تمام مال و دولت راہِ اسلام میں خرچ کر دی یہاں تک کہ انہیں مدینہ میں غربت کے ہاتھوں یہودیوں کے یہاں کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا یہ وہ ہستی ہے جسے لوگ پورے بیسی سال یعنی آغازِ بعثت سے، رہلتِ پیغمبر کے تمام سرحہ میں ہر موقع پر اور ہر جگہ پیغمبر کے ساتھ ساتھ دیکھتے رہے ہیں۔

اور عمر ہیں جو وہ چالیسویں فرد ہیں جنہوں نے خانہٴ ارقم بن ابی ارقم پر حاضری ہو کر اسلام قبول کیا، اور ان کے اور حمزہ کے مشرف یہ اسلام ہونے سے پیغمبر کے وہ اولین ساتھی جو خود کو ضعیف اور کمزور محسوس کر رہے تھے تو ان اور طاقتور محسوس کرنے لگے اور اس دن سے انہوں نے اپنی تمام توانائیوں کو نہضتِ اسلامی کے لیے وقف کر دیا۔  
 یہاں تک کہ ان کا شمار پیغمبر کے نزدیک ترین اصحاب اور معزز ترین مہاجرین میں ہو گیا وہ ام المومنین حفصہ کے والد تھے اور لوگوں کی نگاہوں میں ان کی حیثیت یہ تھی کہ ان کا شمار اصحابِ کبار اور رہبرانِ بزرگ میں کیا جاتا تھا اور ان دونوں کے ساتھ کون لوگ تھے؟ ابو عبیدہ جو مہاجرین اور سالقین میں تھے اور عثمان جنہیں

مہاجر ذوالہجرتین اور ”ذوالنورین“ کہا جاتا تھا۔ یہ صاحب حیثیت و دولت شخص تھے جن کا تعلق قریش کے دو معزز خاندانوں سے تھا۔ باپ کی طرف سے خاندان امیہ اور ماں کی طرف سے خاندان ہاشم انہوں نے اپنی کثیر دولت سے پیغمبر کے عزیز و نادار ساتھیوں کی بہت مدد کی اور اپنی دولت کو امور خیر میں خرچ کرتے رہے۔ لوگ انہیں پیغمبر کے قدیم اصحاب میں شمار کرتے تھے ان کو اولین مہاجرین میں گنتے تھے اور انہیں پیغمبر کا قریبی دوست اور ان کا قرابتدار سمجھتے تھے۔

اور خالد بن ولید ہیں جنہوں نے دشمنان اسلام سے جہاد میں بڑے زبردست کارنامے انجام دیتے ہیں جنگ موتہ میں جہاں کشت و خون کا بازار بہت شدت سے گرم تھا انہوں نے رومیوں کے خلاف اس شدت سے جنگ کی کہ ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں اور ان کا لقب سیف اللہ پڑ گیا۔ اور عمر عاص ہیں جن کا شمار عرب کے چار عقل مند ترین افراد میں ہوتا تھا۔ وہ بہت دنوں سے دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور شمالی علاقوں میں رومی حکومت کے خلاف طاقت اسلام کا مظاہرہ کرتے رہے تھے اور بعد ازاں ان واقعات میں جو مسلمانوں میں پہلے تیر انداز تھے۔ جنہوں نے دشمنوں پر تبر چلا کر مسلمانوں کو مدد فوجانہ جنگ کے ساتھ ساتھ دشمنوں پر حملہ کرنے کی تدبیر سکھائی جنہوں نے جنگ امد میں اپنی ناوک اندازی کے جوہر دکھاتے ہوئے پیغمبر کی اس مرحلہ پر حفاظت کی جب وہ سخت خطرے میں گھر گئے تھے اور ان کی ان کو دشمنوں کی پیغمبر نے بالخصوص متانت فرمائی اور اسی طرح کے دوسرے لوگ ہیں اور ان لوگوں کو تمام مقتدر مہاجرین و انصار تمام سربراہان و مسلمانوں اور پیغمبر کے قریب ترین دوستوں اور ساتھیوں کی تائید اور حمایت حاصل ہے۔

اور ان کا شعار کیا ہے؟ بت پرستی و شرک نہیں ہے یہ قبائلی اور معاشی مفاد کا علم بلند نہیں کر رہے بلکہ ان کے ہاتھوں میں توحید کا علم ہے ان کا نعرہ اسلام کی برتری ہے یہ جمع و ترویج قرآن کے دعویدار ہیں یہ دولت کے مقابلہ میں تقویٰ کو فضیلت دیتے ہیں ان کا نعرہ قدم تعلق، رہنائے الہی کا حصول، حدود و احکام

شرع کی حفاظت اور اجراء رہے بالفاظ دیگر یہ لوگ سنت رسول خدا کے احیاء کے  
دعویدار ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کا لغو وحدت واتحاد مسلمین ہے۔

اور اس تمام حکمت عملی میں حق کو پا نماں کرنا بہت سہل اور آسان ہے حق  
علیٰ کس طرح پا نماں کیا گیا۔ نہایت آسانی سے، بڑی ہوشیاری سے، مفاد اسلام  
اور مفاد امت کے نام پر اس حق کو قربان کر دیا گیا دلیل یہ دی گئی کہ داخلی طور پر  
علیٰ کے بہت دشمن ہیں ان کو حاکم بنانے سے یہ مخالفین سر اٹھائیں گی تو ملت میں  
انتشار پیدا ہوگا۔ جب ملت داخلی طور پر منتشر ہوگی تو خارجی خطرہ بھی شدید ہو جائے  
گا۔ خلاصہ یہ کہ یہ بات علیٰ مصلحت کے خلاف ہے۔ علیٰ جوان ہیں ابھی صرف تیس سال  
سے کچھ زیادہ ہیں ان کے مزاج میں ایک ایسی سختی ہے جو لوگوں کی اکثریت کو پسند  
نہیں اور لوگ ان سے کینہ رکھتے ہیں اکثر معزز قبیلوں کے سربراہ اور وہ لوگ ان  
سے خوش نہیں ہیں بہت سی بااثر شخصیتیں اور طاقتور گروہ ان کے مخالف ہیں ان  
کا حاکم ہونا اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں

علیٰ کے لیے ابھی خلافت قبل از وقت ہے ان کا حاکم ہونا ”مصلحت“ کے  
خلاف ہے۔ ہاں ”مصلحت“ ہی تلوار ہے جس سے ہمیشہ ”حقیقت“ کے جسم  
کو لہو لہان کیا گیا ہے۔

مصلحت وہ تلوار ہے جس سے ہمیشہ حقیقت کو ذبح کیا گیا اور اس قربانی کو  
شرع کے نام پر انجام دیا گیا ہے یہ ذبح، ذبح شرعی، رو بہ قبلہ، بنام خدا ہے۔ اس کا  
گوشت حلال ہے اس لیے کہ یہ قربانی طیب و طاهر ہے۔

اور یہ کام کس قدر آسانی سے انجام پاتا ہے اس میں کوئی آواز نہیں ابھرتی  
کوئی اس راز کو سمجھ ہی نہیں سکتا جو سوتے ہوئے ہیں وہ بیدار نہیں ہوتے لوگ  
کوئی ہمدانے احتجاج بلند نہیں کر سکتے کسی کے لیے یہ موقع نہیں ہوتا کہ وہ عوام الناس  
کو حقیقت سے آگاہ کر سکے ان حقائق کو بے نقاب کر سکے جنہیں مصلحت کی تیغ کی  
پیچم مریض اس طرح خاموشی سے قربان کر دیتی ہیں کہ لوگ ان حقائق کو فراموش کر دیتے

ہیں یہاں تک کہ مصلحت پرستی کے اسلحے سے مسلح لوگ کسی طرح کسی کو اس بات کا موقع نہیں دیتے کہ وہ کوئی اعتراض یا احتجاج بھی کر سکے کسی طرح مصلحت کے مقابلے میں حقیقت کا دفاع کر سکے یا کم از کم حقیقت کی نشاندہی کی جاسکے۔

ہر چند کہ فاطمہؓ نے ہر عنوان سے حتی المقدور کوشش کی، نالہ و فریاد کے ذریعہ، احتجاج و استدلال کے ذریعہ مگر ان کی ہر صدا، صدا بصورت ثابت ہوئی اس لیے کہ جس وقت حکمران تقویٰ کا لباس پہن لیتا ہے تو تاریخ اپنے ہولناک ترین حادثہ سے دوچار ہوتی ہے۔

اور یہی وہ ہولناک حادثہ ہے جو علیؓ اور فاطمہؓ اور ان کے تمام فرزندوں اور ان کی نسل کی قربانیوں سے عبارت ہے ان تمام لوگوں کی قربانیوں کی خاموش اور ننگین داستان ہے یہ تاریخ کا سب سے سنگین المیہ ہے فاطمہؓ نے محسوس کر لیا کہ اس المناک حادثہ کا آغاز ہو چکا ہے اور اب قربانی کے علاوہ اور کوئی بات ممکن نہیں ہے۔

ناگہاں تمام عمر کی جدوجہد کی خشکی نے فاطمہؓ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ تمام تکالیف، مصائب، وہ تمام سختیاں جو وہ تمام عمر برداشت کرتی رہی تھیں اب پوری شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگیں۔

خشکی اور تکلیف کے اس احساس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی یقین ہو گیا کہ اب ہر چیز ہاتھ سے نکل چکی ہے وہ سمجھ گئی کہ جس سنگین اور المناک حادثہ کو روکنے سے پیغمبرؐ معذور رہے اور جس کے آگے علیؓ بے بس نظر آ رہے ہیں اس حادثہ کو روکنا ان کی استطاعت سے باہر ہے۔

ان کی نگاہوں کے سامنے افق تاریکی چھائی ہوئی تھی ہر طرف وہ شب سیاہ چھائی ہوئی تھی جس کی خبر ان کے پدر بزرگوار نے اپنے آخری ایام میں دی تھی اور اس شب سیاہ میں فتنوں کی پلے پلے یلغار برپا تھی (مستقبل کی تاریکی اختیار کرے گا؟ ان کے پدر بزرگوار کی محنت شاقہ کے ثمرات کا سیاست اور مصلحت

کی اس بادمخالف میں کیا حال ہوگا؟ اس امتِ نوخیز کا مستقبل کیا ہوگا۔ عوام ان سے جن کی تقدیر ہمیشہ سیاست، خاندانی اور طبقاتی مفادات اور تضادات کا شکار رہی آئندہ ان کی قسمت کن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی؟ انشرفیت اور قومیت کا تصور پھر سے سراٹھانے لگا ہے۔ ”زمیت“ کی جگہ ”بیعت“ کا اصول اپنا لیا گیا ہے آخر یہ کیوں کر ہوا کہ اس و خنزرج کے قبیلوں کی لئے جو انہوں نے اپنے سرداروں کے حق میں دی اور قریش کی لئے جو ان کے شیوخ کے حق میں تھی۔ پیغمبر کی لئے اور ان کی وصیت پر فائق قرار دی گئی کس طرح ان لوگوں نے جو سقیفہ میں جمع ہوئے تھے پہلے سعد کا انتخاب کیا اور پھر حباب ابو بکر نے اپنے حق میں دلائل دیئے تو سب نے ان پر اجماع کر لیا کیا یہ علم اور آگہی ہیں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہیں ملت کے سیاسی مستقبل کے لیے پیغمبر کی کسی ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے اور یہ سب لوگ مدینہ رسول کے باشندے ہیں یہ ان کے ساتھی ہیں انہوں نے پیغمبر کے ساتھ اپنی زندگیاں گزاری ہیں۔ عزرات میں حصہ لیا ہے انہوں نے اسلام کی تعلیم خود پیغمبر سے حاصل کی ہے یہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں یہ ابو بکر و عمر ہیں مستقبل میں جب اسلام مدینہ سے باہر پھیل جائے گا جب یہ موجودہ نسل گزر جائے گی تو اس وقت ”بیعت“ کا یہ مسئلہ کیا گل کھلائے گا کون منتخب کرے گا کس کو منتخب کرے گا۔

جب ابھی یہ حال ہے کہ ان ہما جرین اور انصار نے جو پیغمبر کے غلطی فدائی اور جان نثار تھے ان لوگوں نے جن کا تعلق اسلام کی اولین نسل سے ہے اور جو سابق لایمان ہیں۔ علی کو اپنی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا اور انہیں خانہ نشینی اور تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تو پھر وہ نسل فردا جو ایمان و تقویٰ اور جہاں دے کے ماحول کی پروردہ نہ ہوگی ان کی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ فاطمہؑ اندازہ کر سکتی تھیں کہ مستقبل کی سیاست حسنؑ، حسینؑ، اور زینبؑ کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرے گی انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے بچوں کا مستقبل کشمکش، جدوجہد اور قربانی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔



موت کے جان کا ہمدے سے دوچار نہیں وہ اس باپ کی عزادار ہیں جس کی زندگی کے ساتھ ان کی زندگی وابستہ تھی۔ وہ علیؑ کی اس ناقابل برداشت مصیبت کو دیکھ رہی ہیں کہ علیؑ ایک مدت تک دشمن سے مصروف جہاد رہتے کے بعد اب گوشہ نشینی پر مجبور ہو گئے ہیں انہیں دشمن نے نہیں دوست نے گوشہ نشینی پر مجبور کیا ہے وہ اس حکومت کی قربان گاہ پر قربان کر دیئے گئے جو حکومت خود ان کی قوتِ ایمان، جذبہ جہاد و اخلاص اور ان کی طاقتِ شمشیر کا ثمر تھی، فاطمہؑ حسد و عنکبوت و مضرّات ان تمام حوادث میں گھری ہوئی ہیں۔ انہوں نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ علیؑ کو ان کا حق واپس مل سکے۔ مگر ان کی یہ کوشش بھی بار آور نہ ہو سکی۔ اس ناکامی نے ان کو بالکل شکستہ اور نا امید کر دیا۔ ان کی ہمت جواب دے گئی۔ اب نہ صرف یہ کہ مزید جدوجہد کی تاب نہیں ہے بلکہ جن حالات سے دوچار ہیں ان کے غم و اندوہ کو سہارا نہ مل سکتا محسوس ہو رہا ہے نہ صرف گھر کے باہر کی فضا، ناقابل برداشت ہے بلکہ خود گھر کے اندر کی خاموشی اور اس سے بھی دل خون ہوا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے گھر سے متصل گھر یعنی خانہ پیغمبرؐ کے ہولناک سکوت کی دلدور صدا ان کی روح کو گھاتل کئے دے رہی ہے۔

اب وہ درپچہ بھی بند ہو چکا ہے جو ان کے گھر کے درپچہ کے مقابل کھلتا تھا اور جس درپچہ سے ہر روز پیغمبرؐ کا روشن اور مسکراتا چہرہ طلوع ہوتا تھا اور اس مسکراہٹ سے فاطمہؑ کے مٹی کے گھر میں ہر طرف و امید کی زندگی بخش لہر دوڑ جاتی تھی اب وہ درپچہ خاموش اور ادا ہے۔ موت نے اس مطلعِ امید و مسرت کو فاطمہؑ پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے سیاست کے تقاضوں کے تحت فاطمہؑ کے گھر کا درپچہ بھی بند کر دیا گیا اب فاطمہؑ اپنے گھر کی تنہائی میں قید ہیں۔ ان کے ساتھ علیؑ ہیں جو ایک کوہِ ثبات کی مانند افسردہ اور خاموش بیٹھے ہیں یہ ایسا سکوت ہے جس نے اپنے حصار میں جوش مارتے ہوئے آتشِ نشان کو قید کر رکھا ہے اور ان دونوں کے علاوہ اس گھر میں فرزندِ رسولؐ ہیں جس کے معصوم اور غمزہ



چہروں پر ان کے مستقبل کی ہولناک داستان صاف پڑھی جاسکتی ہے۔

اب فاطمہؑ کے لیے زندہ رہنا ایک ایسی مصیبت ہے جس کو برداشت کرنے کی طاقت وہ خود میں نہیں پاتیں زندگی ایک ایسا سنگین بوجھ بن گئی ہے کہ جس بار کو اٹھانے سے فاطمہؑ کے خستہ و ناتواں شانے معذور نظر آتے ہیں۔ وقت بوجھل اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا گزر رہا ہے۔ وہ وقت کے قدموں کا بار اپنے مجروح دل پر محسوس کر رہی ہیں۔ ہر لحظہ ہر دقیقہ ان کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ اب اس دنیا میں ان کی تسلی کا سنوان ایک توان کے پدر بزرگوار کی تربت مہربان ہے اور دوسرے وہ مژدہ جاں بخش جو بغیر میرے ان الفاظ میں سنایا تھا کہ ”فاطمہؑ میرے خاندان میں تم وہ پہلی ہستی ہو جو مجھ سے ۲۰ کروڑ سال پہلے کیسے کب؟ وہ ساعت جس کے انتظار نے بے تاب کر رکھا ہے آخر کب آئے گی۔

فاطمہؑ کی روح آزرده کسی ایسے زخمی پرندے کی طرح جس کے پر شکستہ ہو گئے ہوں درد و غم کے تین زاویوں کے درمیان بے تاب اور مقید ہے یعنی ان کے شوہر کا خاموش اور غمگین چہرہ ان کے بچوں کی مغز وہ صورتیں اور ان کے باپ کی سرد و ساکت قبر۔

جب کبھی ان کے دل پر غم کا فشار بڑھتا ہے جب وہ فوراً گریہ سے ان کا دم رکھنے لگتا ہے تو انہیں اپنے باپ کی محبت اور ان کی تسلیوں کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے چنانچہ اپنی بے تابی کا مداوا کرنے کے لیے وہ تربت پدر کا رخ کرتی ہیں اپنی وہ آنکھیں جو مسلسل روتے روتے زخمی ہو چکی ہیں تربت پدر پر جمادیتی ہیں یہاں تک کہ ان پر ایسی کیفیت غم طاری ہو جاتی ہے جیسے انہیں ابھی اپنے باپ کی موت کی خبر ملی ہو شدت گریہ انہیں بے حال کر دیتا ہے پھر وہ اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ اپنے باپ کی تربت پر رکھ دیتی ہیں ان خالی اور بے سہارا ہاتھوں کو تربت پدر کی خاک سے پر کر کے کوشش کرتی ہیں کہ پردہ اشک کو چیر کر ان کی نگاہیں

اس خاک کو دیکھ سکیں پھر وہ اپنے ہاتھوں کو اپنے چہرے کے نزدیک لے جاتی ہیں  
محبت کے اس شدید احساس کے ساتھ جو انہیں اپنے باپ سے بھی خاک تربت پدر کو سونگھتی  
ہیں اس مٹی کی خوشبو سے ان کی بے کلی کو عارضی طور پر قرار مل جاتا ہے پھر وہ ایسی  
آوازیں جو شدتِ گریہ کا تاثر لیے ہوئے ہے آہستہ آہستہ کہتی ہیں۔

”جس نے تربتِ احمدؑ کی مٹی سونگھ لی اسے اب قیامت تک کسی اور خوشبو  
کو سونگھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“

”آپ کے بعد مجھ پر ایسی مصیبتیں پڑیں کہ اگر وہ روز روشن پر پڑتیں تو وہ سب اہم  
میں تبدیل ہو جاتا۔“

رفتہ رفتہ ان پر سکوت طاری ہو جاتا ہے تربتِ احمدؑ کی خاک ان کی انگلیوں کے  
کھارے سے آہستہ آہستہ گرتی جاتی ہے مگر انہیں احساسِ غم نے اس قدر نڈھال کر  
رکھا ہے کہ وہ اس مٹی کو اپنے ہاتھوں سے پھسلنے سے نہیں روک سکتیں وہ ایک ایسے  
انسان کی طرح جو درد سے مغلوب ہو گیا ہو اس مٹی کو دیکھتی رہتی ہیں خاموش اور  
ساکت ”بے خندہ و بے گریہ“ جیسے ان کی روح جب دھنصری سے پرواز کر گئی ہو  
جیسے وہ کسی دوسرے عالم میں پہنچ گئی ہوں۔

انہوں نے اپنے تمام دکھ درد اپنے باپ کی فرقت کے غم میں ضم کر دیے تھے  
ان کے لیے ہر دن مرگ پدر کا گویا پہلا دن تھا۔ ان کی بے تابی میں ہر روز اہتافِ ہوربا  
تھا ان کے نالے ہر دن کچھ اور دردناک ہو جاتے۔ انصار کی عورتیں ان کے پاس آتیں  
اور ان کے ساتھ مل کر پیغمبرِ برگزیدہ کی تین ایسے عالم میں جب شدتِ نالہ و فریاد سے ان کا  
دل بے حال اور ان کی آنکھیں غورِ نچکاں ہوتیں وہ ان سے اس سہم کا شکوہ کرتی ہیں  
کہ انعامِ خداوندہ رسولؐ بنا تھا اور اس حق کو یاد دلائی جسے انہوں نے پامال کر  
دیا تھا۔

ان کا غم اب ان منزلوں سے گذر چکا تھا جہاں کسی کی تسلی ان کے کام آ سکتی  
یا کوئی ان کا غم بٹا سکتا۔

روز و شب اسی طرح گزرتے رہے، اصحاب رسولؐ کا رویہ حکومت، فتوحات اور مالی غنیمت کے بکھیروں میں پھنس گئے، علیؑ گوشہ تنہائی میں خاموش اور ساکت ہو گئے اور فاطمہؑ موت کے خیال میں غلطاں اس ساعتِ نجات کا بے چینی سے اشتغال کرتی رہیں جس کا مشورہ انہیں پیغمبرؐ نے دیا تھا۔



## رحلتِ فاطمہ

ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ موت کے لیے فاطمہ کی  
 بے قراری بڑھتی جا رہی ہے ہر دن اسی امید میں کٹتا ہے کہ شاید موت رشتہ حیات  
 کو منقطع کرے اور بیٹی جس کی روح درد اور شکایت سے برباد ہے اپنے باپ  
 کے سایہ عاطفت میں پہنچ کر آرام اور سکون حاصل کر سکے۔  
 مگر وقت بہت آہستہ آہستہ گزر رہا ہے پیغمبرؐ نے جو مزدہ مرگ سنایا تھا اسے  
 آج ۹۵ دن ہو گئے۔ مگر ابھی تک موت کا پیغام نہیں آیا۔  
 کیوں؟

آج دوشنبہ ہے جمادی الثانی کی تیسری تاریخ، ہجرت کا گیارہواں سال آکی  
 سال پیغمبرؐ نے رحلت فرمائی  
 یہ کایک انہوں نے اپنے بچوں کو پیار کیا، سات سالہ حسنؑ، چھ سالہ حسینؑ  
 پانچ سالہ زینبؑ اور ام کلثومؑ ابھی صرف تین سال کی ہیں یہ گویا بچوں کو ماں کا آخری  
 اور الوداعی بوسہ تھا۔

اور یہ علیؑ سے رخصت کا لمحہ ہے۔

کس قدر مشکل اور سنگین لمحہ!

ابھی علیؑ کو اس دنیا میں ہی رہنا ہے۔ مزید تیس سال

ام رافع کو طلب فرمایا۔ یہ پیغمبرؐ کی آخری رسوم میں خدمت گار کے فرائض انجام  
 دے چکی ہیں ان سے فرمایا۔

اے کینز خدا تم مجھ پر پانی ڈالو تاکہ میں غسل کر سکوں بڑی دقت اور بڑی احتیاط

کے ساتھ غسل کیا اور پھر نیا لباس زیب تن فرمایا حالانکہ رحلت پیغمبر کے بعد آپ علامتِ عزما کے طور پر ہمیشہ سیاہ لباس میں ملبوس رہیں لیکن آج سیاہ لباس کو بڑھا کر آپ نے نیا لباس پہنا ہے یہ تبدیلی لباس گویا اس بات کی نشانی ہے کہ اب دورِ عزما و اداریٰ رسول ختم ہو رہا ہے اور آج بیٹی اپنے باپ سے ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں جا رہی ہے۔

پھر ام رافع سے کہا۔

میرا بستر کمرے کے درمیان میں کر دو

آرام و سکون سے آپ بستر پر لیٹ گئیں، رخِ قبلہ کی طرف کر لیا اب صرف موت کا انتظار ہے

وقتِ لحظہ لحظہ کر کے گزر رہا ہے۔۔۔

ناگہاں گھر سے نالہ و شہون کی صدا بلند ہوتی ہے۔

موت کے سر دیا تھا نے ان کی پلکوں کو بند کر دیا ہے لیکن بند پلکوں کے پیچھے ان کی روشن آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ اپنے محبوب باپ کے چہرے کا دیدار کر رہی ہیں وہ چہرہ جو اپنی بیٹی کا انتظار کر رہا تھا۔

شمعِ آتش در بج جو خانہ علی میں روشن تھی اب خاموش ہو گئی۔

افسوس کہ علی اب تنہا رہ گئے

اپنے کسں بچوں کے ساتھ

علی سے وصیت کی تھی کہ دفنِ رات کے وقت کیا جائے۔ نشانِ قبر کسی کو نہ بتایا

جائے اور ان دونوں شیوخ کو جنازہ میں شریک نہ کیا جائے

اور علی نے ایسا ہی کیا۔۔۔

مگر کسی کو نہیں معلوم کہ کس طرح؟

یہ اب تک کوئی نہیں جانتا کہ انہیں کہاں دفن کیا گیا

ان کے اپنے گھر میں، یا بقیع میں؟

اور اگر یقین میں تو کس طرف؟ ۔۔۔۔۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں۔  
 ہاں ہمیں جو کچھ معلوم ہے وہ علیؑ کا رنج و غم ہے اس رات، قبرِ فاطمہؑ پر  
 مدینہ کورات نے اپنی سیاہ آغوش میں لے لیا ہے سب مسلمان غفلت کی  
 نیند سو رہے ہیں رات کا پراسرار سناٹا علیؑ کی سرگوشیوں کی طرف گوش برآواز ہے  
 اور علیؑ اب باسکل اکیلے ہیں۔ ہر طرح تنہا ہیں مدینہ پیغمبرؐ سے خالی تھا اور  
 اب گھرِ فاطمہؑ سے خالی ہو گیا علیؑ شہر میں تو تنہا تھے ہی اب گھر میں بھی اکیلے رہ گئے  
 وہ ایک کوہِ غم کی طرح فاطمہؑ کی قبر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تنہا خاموش اور سوگوار  
 کتنی ساعتیں بیت گئیں۔

رات، خاموش اور تنگین رات علیؑ کی سرگوشیوں کی طرف کان لگائے ہوئے  
 ہے پتھر کا خوش نصیب ماحول اور مدینہ کی بے وفا اور بد بخت فضا مکمل طور پر خاموش  
 ہے۔ بیدار قبر میں اور خوابیدہ گھر علیؑ کی آواز سن رہے ہیں۔  
 تسکیم نیمہ شب، علیؑ کی صدائے جاں سوز، قبرِ فاطمہؑ سے خانہٴ پیغمبرؐ کی طرف لے  
 جا رہی ہے۔ وہ بدقت یہ کلمات فرما رہے ہیں:

لے اللہ کے رسولؐ آپ پر میری جانب سے اور آپ کے ہمسایہ میں پہنچنے والی  
 اور آپ سے بہت جلد ملتی ہونے آپ کی دختر کی طرف سے سلام ہو۔

یادِ رسولؐ اللہؐ آپ کی دخترِ عزیز کی رحلت کے باعث میری شکیبائی جواب دے  
 رہی ہے اور میری طاقتِ ضعیف سے بدلہ لے رہی ہے لیکن جس طرح میں نے آپ کی فرقت  
 کے عظیم صدمہ اور آپ کی رحلت کی جانِ کاہِ مصیبت پر صبر کیا اسی طرح مجھے اس موقع پر

علیؑ یہ کام مقبوض کا ہے کہ وہ اس باب میں تحقیق کریں لیکن میں کہہ سکتا ہوں مجھے یہ پتہ نہیں  
 ہے کہ اس باب میں تحقیق کروں میں نہیں چاہتا کہ ان کی قبر کی صحیح جگہ دریافت کروں۔ ان کا مدفن  
 ہمیشہ سے نامعلوم رہا ہے اس لیے کہ انہوں نے ایسا ہی چاہا تھا ان کی یہی خواہش تھی کہ ان کا مدفن  
 نامعلوم رہے۔ ان کی قبر کا نشان پوشیدہ رہے۔ ہر دور میں ہر شخص کے لیے، تاکہ ہر دور میں ہر  
 شخص خود سے یہ سوال کرے کہ آخر نشانِ قبر کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟  
 آخر ایسا کیوں ہوا۔

بھی صبر سے کام لینا ہوگا۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے آپ کو لحد میں اتارا اور آپ کی پاک روح نے ایسی حالت میں پرواز کی کہ آپ کا سرا قدس میرے حلقوم اور سینہ کے درمیان تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

فاطمہؑ ایک ودیعت تھی جو پلٹا دی گئی ہے اور رہن چھڑا لیا گیا ہے لیکن اب میرا حزن و ملال دائمی ہے۔ اب میری راتیں جاگتے گزریں گی یہاں تک کہ خداوند عالم میرے لیے بھی وہی گھر منتخب فرمادے جس میں آپ مقیم ہیں۔

اب آپ کی دختر آپ کو مطلع کریں گی کہ کس طرح آپ کی امت نے ایکاکر کے ان پر مصیبت کے پہاڑ توڑے آپ ان سے تمام حالات پوچھ لیں ایک ایک بات دریافت کر لیں وہ آپ کو اپنے تمام مصائب سے باخبر کر دیں گی۔ یہ تمام مصیبتیں ان پر گزر گئیں حالانکہ ابھی آپ کی رحلت کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے اور نہ زمانہ آپ کی یاد سے خالی ہوا ہے۔

آپ پر اور آپ کی دختر عزیز پر میرا سلام ہو ایسے وداع کنندہ کا سلام جو خشمگین ہے اور نہ ملول۔

علیؑ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں یوں ہے جیسے کہ تمام عمر کے دکھ درد نے ان کے دل پر ایک ساتھ یلغار کر دی ہو جیسے ہر اس لفظ کے ساتھ جو ان کی روح کی گہرائیوں سے نکل رہا تھا ان کے وجود کا ایک حصہ تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔

حیران و پریشان وہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ یہیں ٹھہریں! چلیے جائیں؟ بھلا فاطمہؑ کو یہاں تنہا کیوں کر چھوڑیں؟ کس دل سے گھر کی طرف اکیلے لوٹ جائیں؟ شہر کسی ایسے عفریت کی مانند جو رات کی تاریکی میں گھٹا لگائے ہوئے ہو ان کے انتظار میں ہے ہر طرف سازشوں، فتنوں، خیانت کاریوں، اور بے شرمی کے سائے دینگ رہے ہیں۔

لیکن علیؑ کے لیے یہاں ٹھہرے رہنا بھی ممکن نہیں ہے ان کے بچے، مسلم عوام

حقیقت اور مسئولیت کی عظیم ذمہ داری ان کے لیے جہنم براہ ہے۔ ان کے علاوہ یہ عظیم ذمہ داریاں اب اور کون اٹھا سکتا ہے؟

درد و غم کی شدت نے ان کی توانا روح کو کمزور کر دیا ہے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ عجیب کشمکش کا عالم ہے، چلے جائیں۔۔۔؟ ٹھہرے ہیں۔۔۔؟

علی محسوس کر رہے ہیں کہ جیسے وہ دونوں باتوں سے معذور ہوں جیسے ان کی تاب و توانا رخصت ہو گئی ہو۔ قوت فیصلہ جواب دے گئی ہو پھر گویا فاطمہ سے اپنی کیفیت کی توضیح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

”پس اگر میں یہاں سے چلا جاؤں تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ میں اس قرب سے دل گرفتہ ہوں اور اگر یہاں ٹھہرا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس وعدہ سے بدظن ہوں جو خدا نے مہر کرنے والوں سے کیا ہے“

پھر آپ بدقت اٹھ کھڑے ہوئے خانہ پیغمبر کی طرف رخ کئے تنہا اور ملول کھڑے رہے یہ درد اور تنہائی کی وہ کیفیت ہے جس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے گویا علیؑ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ اے اللہ کے رسول آپ نے جو ودیعت گرا نمایا میرے سپرد کی تھی آج میں نے اسے آپ کو واپس کر دیا ہے اب آپ ان کا احوال خود انہی سے سن لیجئے ان سے پوچھیے، بہر اصرار پوچھئے تاکہ وہ آپ کو ایک ایک بات بتا دیں آپ کے بعد جو کچھ ان پر گزرا ہے ان تمام باتوں سے آپ کو مطلع کر دیں۔

فاطمہؑ اس شان سے زندہ رہیں اور اس عنوان سے ان کی زندگی اختتام کو پہنچی اپنی رحلت کے بعد انہوں نے تاریخ میں ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ان تمام لوگوں کے چہروں پر جو تاریخ میں آپ کے بعد ظلم و ستم کا نشانہ بنائے جاتے رہے آپ کی مظلومیت کا عکس جھلکتا ہے وہ تمام لوگ جو مظلوم و محروم ہیں جن کے حقوق غصب کئے گئے ہیں جنہیں مکہ و مدینہ نے اپنے مفاد کی خاطر قربان کیا ہے آپ کے نام کو اپنی نجات اور بقا کی علامت سمجھتے ہیں۔

فاطمہؑ کی یاد ان تمام انسانوں کے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت جذبہ عشق و



ایمان اور حیرت انگیز شوقِ جہاد کی صورت میں پروان چڑھتی رہی جو اسلام کی طویل تاریخ کے ہر دور میں آزادی اور عدالت کی جنگ لڑتے رہے ہیں ظالم اور جاہل حکومتوں کے جو دستور اس یاد کو مٹا نہیں سکے بلکہ جس قدر ظلم نے اس یاد کو مٹانے کی کوشش کی اس کی اثر آفرینی اور بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ یہ نام ہر زحمتی دل کی پکار بن گیا۔ یہی سبب ہے کہ فاطمہ کا نام ملتِ اسلامی کی تاریخ کے ہر موڑ پر محروم اور مظلوم انسانوں کے لیے سرچشمہِ الہام و آزادی حق پسندی و عدالت طلبی بن گیا اور آپؑ کی شخصیت ظلم و ستم، جبر و تشدد اور طبقہ واریت کے خلاف جہاد کی علامت قرار پائی۔

فاطمہؑ کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کرنا انتہائی دشوار ہے وہ ایک "عورت" تھیں اسلام نے مثالی عورت کا جو تصور پیش کیا ہے اس تصویر کی روشن تصویر، یہ پاکیزہ تصویر خود پیغمبرؐ نے اپنے انسانیت طراز ہاتھوں سے بنائی تھی جس طرح سونے سونگ میں تیار کردن بنایا جاتا ہے اسی طرح پیغمبرؐ نے آپؑ کو سختی، فقر اور جدوجہد کی آغ میں تیار کر رکھا۔ آپؑ کی تعلیم و تربیت پر بڑی گہری اور کڑی نگاہ رکھی اور آپؑ کو حیرت انگیز انسانی خوبیوں کا مظہر بنادیا۔

وہ ہر اعتبار سے ایک مثالی عورت تھیں، نسوانیت کی تمام گوناگوں ابعاد کے لیے ایک مثالی نمونہ۔

اپنے باپ کے حوالے سے ————— ایک مثالی بیٹی

اپنے شوہر کے حوالے سے ————— ایک مثالی بیوی

اپنے بچوں کے حوالے سے ————— ایک مثالی ماں

اور وقت اور سماجی ماحول کے تناظر میں وہ ایک زنِ مبارک و مسئول "کا نمونہ تھیں، انہوں نے اپنی سیرت سے معاشرے میں عورت کی ذمہ داریوں اور اس کے دائرہ عمل کی نشاندہی کی۔

وہ بذاتِ خود ایک امام ہیں ایک نمونہ مثالی ہیں ایک آئینہ دل ٹاٹ

(IDEAL TYPE) ہیں ان کا "اسوہ" عورتوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ ہے ہر اس عورت کے لیے جو آزادانہ طور پر اپنی شخصیت کی تعمیر کرنے کی خواہش مند ہو وہ ایک نگران "شاہد" ہیں۔

ان کی حیرت انگیز طفلی، ان کی جدوجہد اور کشمکش سے لبریز زندگی، داخلی، اور خارجی ہر دو محاذ پر ان کا مسلسل جہاد اپنے باپ کے گھر اپنے شوہر کے گھر اور اپنے معاشرہ میں ان کا کردار ان کی فکر، ان کا عمل غرض ان کی جامع اور مثالی شخصیت اس سوال کا مکمل جواب ہے کہ ایک عورت کو کیسا ہونا چاہیے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں، بہت کچھ کہہ چکا مگر ابھی کہنے کے لیے بہت کچھ باقی ہے۔

فاطمہ کی شخصیت کا ہر پہلو روشن ہے ہر جلوہ خیرہ کن ہے لیکن ان کی مقدس شخصیت کے بے شمار خیرہ کن جلووں میں مجھے جو بات سب سے زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ علی جیسی عظیم شخصیت کی ہمسفر، ہم گام اور ہم پرواز ہیں۔ وہ کمال انسانیت کی شاہراہ پر ان کے ساتھ قدم بہ قدم چلتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ ارتقاء انسانیت کے افق ہائے بلند پر علی کی ہم پرواز ہیں۔

علی کے ساتھ ان کا تعلق محض ایک زوجہ کے تعلق سے کہیں زیادہ بامعنی تھا علی نے ان کی رحلت کے بعد دوسری عورتوں سے عقد کیا مگر کوئی عورت ان کے خلاء کو پر نہ کر سکی، علی کی نگاہ میں ان کی حیثیت ایک ایسے دوست، نثار اور محرم کی تھی جو ان کے بلند مقاصد میں ان کے ساتھ برابر کی شریک ہو، وہ ان کے دکھ درد کی ساتھی ان کی بہم و ہمراز، ان کی شریک کار، ان کی بیکراں خلوتوں کی انیس اور ان کی بلندی فکر و نظر میں ان کی بہم و دمساز تھیں۔

اسی سبب سے علی نے ان کو اپنی دوسری بیویوں سے مختلف سطح پر دیکھا اور یہی وجہ ہے ان کی اولاد کے ساتھ بھی رکھا۔

فاطمہ کے بعد علی نے دوسری عورتوں سے عقد کئے اور ان سے اولادیں بھی

ہوئیں مگر علیؑ نے ہمیشہ اپنی اس اولاد کو جن کی ماں فاطمہؑ تھیں اپنی دیگر اولاد سے ممتاز حیثیت دی، یہ ”بنی علیؑ“ کہلائے اور وہ ”بنی فاطمہؑ“ کیا یہ تعجب انگیز بات نہیں کہ علیؑ جیسے عظیم باپ کے مقابلے میں بچوں کو ماں کی نسبت سے پہچانا جائے

اور ہم دیکھتے ہیں کہ خود پیغمبرؐ کی نگاہ میں ان کی حیثیت دوسری بیٹیوں سے بالکل جدا تھی آپ نے اپنی تمام بیٹیوں میں محض فاطمہؑ کی تعلیم و تربیت پر چھوٹی توجہ فرمائی ان پر سخت اور کڑی نگاہ رکھی محض انہی کو اپنی امیدوں کا مرکز بنایا انہیں عالم خود رسالی میں اسلام کے عظیم پیغام سے روشناس کرایا۔

میری عقل حیران ہے کہ ایسی شخصیت کے بارے میں کیا کہوں کس عنوان سے کہوں ؟

میری خواہش تھی کہ میں فرانس کے اس نامور خطیب کی تقلید کروں جس نے ایک موقع پر ”لوئی“ کے حضور میں حضرت مریمؑ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا۔  
سترہ سو برس سے مسلسل دنیا کے تمام سخی و رنجاب مریمؑ کے بارے میں داد سخی دے رہے ہیں۔

سترہ سو برس ہو گئے کہ پیہم شرق و غرب کے تمام فلسفی اور مفکرین جناب مریمؑ کے فضائل بیان کر رہے ہیں۔

سترہ سو برس سے مسلسل تمام دنیا کے شاعر جناب مریمؑ کی تعریف میں اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔

سترہ سو برس سے مسلسل تمام فنکار، مصور، مجسمہ ساز، جناب مریمؑ کی شخصیت و سیرت کی تصویر کشی کے باب میں معجزہ ہائے ہنر تخلیق کرتے رہے ہیں۔

لیکن طویل صدیوں پر محیط فکر و فن کی یہ تمام کوششیں اور یہ تمام معجزہ ہائے ہنر جناب مریمؑ کی تعریف میں کہے گئے اس مختصر سے جملہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے کہ :-

”سریم مادر علیؑ ہیں“

میں نے چاہا تھا کہ میں بھی (اسی عنوان سے جناب فاطمہؑ کی تعریف میں کوئی جملہ کہوں۔ مگر میری تابِ سخن سخت عاجز اور درماندہ ہے۔

میں نے چاہا کہوں : فاطمہؑ دخترِ خدیجہ بزرگ ہیں

میں نے دیکھا کہ یہ فاطمہؑ (کی مکمل تعریف) نہیں ہے

چاہا کہوں : فاطمہؑ دخترِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں

مگر دیکھا کہ یہ فاطمہؑ (کی مکمل تعریف) نہیں ہے۔

سوچا کہوں : فاطمہؑ علیؑ کی ہمسفر و ہم کفو ہیں۔

دیکھا کہ یہ : فاطمہؑ (کی مکمل تصویر) نہیں ہے۔

سوچا کہوں : فاطمہؑ حنینؑ کی ماں ہیں۔

دیکھا کہ یہ : فاطمہؑ (کی مکمل تصویر) نہیں ہے۔

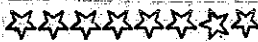
سوچا کہوں : فاطمہؑ مادرِ زینبؑ ہیں۔

مگر دیکھا کہ یہ بھی فاطمہؑ (کی مکمل تصویر) نہیں ہے۔

ہاں — : فاطمہؑ یہ سب کچھ ہے مگر سب کچھ فاطمہؑ نہیں ہے۔

فاطمہؑ ، فاطمہؑ ہے ہاں !

فاطمہؑ ، فاطمہؑ ہے۔



یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں  
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان



۷۸۶  
۹۲۱۱۰  
یا صاحب الزماں اور کئی



# لبیک یا حسینؑ

نذر عباس  
خصوصی تعاون: رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری -

SABEEL-E-SAKINA  
Unit#8,

Latifabad Hyderabad  
Sindh, Pakistan.

www.sabeelesakina.co.cc  
sabeelesakina@gmail.com

www.ziaraat.com

NOT FOR COMMERCIAL USE